# MAUR-119 (N)

# Iqbal (Tafseeli Mutala)

## MAUR-119 (N) اقبال (تفصیلی مطالعہ)

# فہرست

## بلاک1 :علامہ اقبال (تفصیلی مطالعہ)

اکائی1-اقبال کی سوانح،شخصیت اور عہد.....8
اکائی2-علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف ادوار اور ذہنی ارتقا (تاریخی،تہذیبی اور ادبی پس منظر)..21
اکائی3-اقبال کے فکری وتخلیقی سرچشمے (مشرقی اور مغربی).....34

## بلاک2 : اقبال کے افکار وتصورات

اکائی4-قومی ووطنی تصورات (شاعری کے حوالے سے).....49
اکائی5-ملی،اسلامی،سماجی،فنی اور ادبی شعور.....57
اکائی6-مابعدالطبیعاتی تصورات (خودی وبےخودی).....67
اکائی7-تصورات عشق وخرد اور مردمومن.....81

## بلاک3 : اقبال کی شعری خدمات (نظم)

اکائی8-حضور رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خضرِ راہ کا خصوصی مطالعہ (بانگ درا).....106
اکائی9-مسجدِ قرطبہ اور لینن خدا کے حضور میں کا تنقیدی مطالعہ (بالِ جبریل).....125
اکائی10-شعاعِ امید کا تنقیدی تجزیہ (ضربِ کلیم).....143
اکائی11-ابلیس کی مجلس شوریٰ کا تجزیاتی مطالعہ (ارمغانِ حجاز).....156

## بلاک4 : اقبال کی شعری خدمات (غزل)

اکائی12:بانگِ درا (حصہ اول) کی ابتدائی ۵ غزلیں .....184
اکائی13:بالِ جبریل (حصہ اول) کی ابتدائی پانچ غزلیں.....204

## بلاک5 : اقبال کی نثر

اکائی14:اقبال کی نثری خدمات (خطبات وخطوط کے حوالے سے).....226

# کورس کا تعارف

شخصیات ادوار کی پہچان ہوتی ہیں۔ کسی عہد میں بسنے والے لوگ اس دور کا حوالہ بن جاتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کا اسلوبِ فکر اور طرزِ عمل ایسے معاشرے کو تشکیل دیتا ہے جو اس دور کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے اگرچہ عوام وخواص ہر معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں۔ مگر فطرت کا ایک قانون تسلسل سے چلا آ رہا ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسی شخصیات ضرور موجود ہوتی ہیں جو انسانیت کے لئے محترم اور قوموں کا فخر بن کر وقتی پیشانی پر اپنا نام یوں ثبت کر دیتی ہیں کہ تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کر پاتی۔ ایسے لوگ ایک زمانے کے لئے نہیں رہ جاتے بلکہ آنے والا ہر زمانہ انہیں فکر وشعور کے مسند پر بٹھا کر ہمیشہ اپنے اندر زندہ رکھتا ہے۔ اس پیرائے میں علامہ اقبال کی شخصیت کسی گوہرِ نایاب سے کم نہیں۔ ۱۳ویں صدی میں مولائے روم کے بعد علامہ اقبال ہی وہ شخصیت ہیں جن کا سکہ مشرق تا مغرب، بلا امتیاز مذہب وقوم ہر جگہ چلتا دکھائی دیتا ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز اس وقت کیا، جب ہندوستان میں برطانوی غلامی کا دور دورہ تھا۔ ان کا جس عہد سے تعلق ہے اور جس کی عکاسی نمایاں طور پر ان کی شاعری اور نظریات سے ملتی ہے وہ ۱۹۰۰ کے بعد شروع ہوا۔ اور ۱۹۳۸ میں اقبال کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۰۲ میں کر دیا تھا۔ اور ان کی شاعری ونظریات کا ارتقا جنگِ عظیم اول کے بعد اور جنگِ دوم سے پہلے ہوا، یہی وہ دور ہے، جس کی عبوری نوعیت نے اقبال کی شاعری اور افکار کی نمایاں خصوصیات کو نکھارا۔ اقبال نے اپنی نظموں میں جو ۱۹۰۲ تا ۱۹۳۸ اپنی ادبی سرگرمیوں کے دوران تحریر کی گئیں خاص طور پر اس دور کے ہندوستان کی مرقع نگاری کی۔ جب وہ برطانیہ کا غلام تھا۔ جاگیردار، ساہوکار اور کسان کا ہندوستان۔ تاریخِ ہند کے اس عہد کی عکاسی میں اقبال اتنے زیادہ اہم مسایل پیش کرنے میں کامیاب رہے اور انہوں نے اپنی فنی خوبیوں کو اتنی بلندی پر پہنچایا کہ ان کی نظموں کا شمار اردو، فارسی اور عالمی ادب کے بہترین شاہکاروں میں ہونے لگا۔ ایک ایسے ملک میں جو انگریزوں کی غلامی اور طبقاتی تفریق کی ایک زندہ مثال تھا، اقبال جیسے عظیم شاعر کا پیدا ہونا کسی معجزے سے کم نہیں۔

اقبال نے جب ہمالہ اور ترانۂ ہندی جیسی نظمیں لکھیں تو ملک کے ہر فرد نے انہیں ہندوستان کا قومی شاعر تسلیم کیا۔ گو اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانہ میں ہمالہ، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ، اور ہندوستانی بچوں کو گیت کے علاوہ رام، نانک اور سوامی رام تیرتھ پر نظمیں کہی ہیں۔ اس لئے وہ ہندوستان کے قومی شاعر کہلائے۔ لیکن آگے چل کر ان کے نظریہ میں فرق آیا اور اقبال نے ہندوستان کے گیت لکھنے کے بجائے نہ صرف نظریہ پاکستان پیش کیا بلکہ ترانہ ملی لکھ کر ساری دنیا پر مسلمانوں کے حق کو جتلایا ہے۔ اقبال کی قومیت کے بارے میں کہی گئی باتیں

اس وجہ سے غلط ہیں کہ اقبال درحقیقت ہندوستانی ہیں اور نہ پاکستانی ہیں بلکہ وہ آفاقی نقطۂ نظر کے حامل شاعر ہیں، ان کی ایک عالمی حیثیت ومقام ہے۔ایسی صورت میں اقبال کو پاکستانی یا ہندوستانی شاعر قرار دینا، اقبال کی عظمت کو کم کرنا اور خود کلامِ اقبال کی غلط تاویل کے مترادف ہوگا۔

اس کورس میں ہم علامہ اقبال کی سوانح، ان کی شخصیت، ان کے عہد، ان کے فکری ارتقا اور تخلیقی سرچشمے کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ نیز علامہ اقبال کے افکار ونظریات، ملی، سماجی، فنی اور ادبی شعور اور تصورات عشق وخرد اور مردِ مومن کے متعلق جانیں گے۔ اس کورس میں علامہ اقبال کی شاعری کے اوصاف و انفرادیت کا بھی احاطہ کیا جائے گا۔۔

اکائی 1 '' اقبال کی سوانح، شخصیت اور عہد'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں علامہ اقبال کے عہد، ان کے سوانحی کوائف اور ان کی شخصیت کے امتیازات پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔اس میں ہم اقبال کے عہد اور ان کی شخصیت دونوں پہلوؤں سے متعارف ہوں گے۔

اکائی 2 ''علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف ادوار اور ذہنی ارتقا (تاریخی، تہذیبی اور ادبی پس منظر)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف ادوار اور ذہنی ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 3 ''اقبال کے فکری وتخلیقی سرچشمے (مشرقی اور مغربی)'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں اقبال کے فکری وتخلیقی سرچشمے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اکائی 4 ''قومی و وطنی تصورات (شاعری کے حوالے سے)'' پر مبنی ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی شاعری میں قومی و وطنی تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی 5 ''ملی، اسلامی، سماجی، فنی اور ادبی شعور'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں علامہ اقبال کی شاعری میں ملی، اسلامی، سماجی، فنی اور ادبی شعور پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ان کی شاعری سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

اکائی 6 میں ''مابعدالطبیعاتی تصورات (خودی و بے خودی)'' پر گفتگو کی گئی ہے۔اس میں علامہ اقبال کی شاعری میں مابعدالطبیعاتی تصورات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 7 ''تصورات عشق وخرد، عقل اور مردِ مومن'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس اکائی میں اقبال کی شاعری میں موجود تصورات عشق پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز خرد اور مردِ مومن کے تصوارت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

اکائی 8 ''حضور رسالت مآب صلی علیہ وسلم اور خضر راہ کا خصوصی مطالعہ (بانگ درا)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں اقبال کی شاعری میں رسول اللہ محمد صلی علیہ وسلم کا ذکر ان سے عقیدت پر روشنی ڈالی گئی

ہے۔نیز اقبال کی نظم ''خضر راہ'' کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔۔

اکائی 9 ''مسجد قرطبہ اور لینن خدا کے حضور میں کا تنقیدی مطالعہ (بال جبریل)'' پر مبنی ہے۔اس میں اقبال کی نظموں ''مسجد قرطبہ'' اور ''لینن خدا کے حضور میں'' کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 10 ''شعاع امید کا تنقیدی تجزیہ (ضرب کلیم)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں اقبال کی نظم ''شعاعِ امید'' کے فن پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 11 ''ابلیس کی مجلس شوریٰ کا تجزیاتی مطالعہ (ارمغان حجاز)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ اس میں اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے فن پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 12 ''بانگ درا (حصہ اول) کی ابتدائی ۵ غزلیں'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس اکائی میں ''بانگ درا'' کی شامل نصاب غزلوں کی شرح کرتے ہوئے ان کا فنی احاطہ کیا گیا ہے۔جس سے طلبا کو اقبال کی غزلوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اکائی 13: ''بال جبریل (حصہ اول) کی ابتدائی پانچ غزلیں'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس اکائی میں ''بال جبریل'' کی شامل نصاب غزلوں کی شرح کرتے ہوئے ان کا فنی احاطہ کیا گیا ہے۔جس سے طلبا کو اقبال کی غزلوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اکائی 14: ''اقبال کی نثری خدمات (خطبات وخطوط کے حوالے سے)'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں علامہ اقبال کی نثری تخلیقات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

## بلاک 1 :

## علامہ اقبال (تفصیلی مطالعہ)

اکائی 1 – اقبال کی سوانح، شخصیت اور عہد

اکائی 2 – علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف ادوار اور ذہنی ارتقا (تاریخی، تہذیبی اور ادبی پس منظر)

اکائی 3 – اقبال کے فکری و تخلیقی سرچشمے (مشرقی اور مغربی)

# اکائی۔۱ اقبال کی سوانح، شخصیت اور مطالعہ

ساخت

1.1 تمہید
1.2 اغراض ومقاصد
1.3 اقبال کی سوانح، شخصیت اور عہد
1.4 اپنا امتحان خود لیجیے
1.5 سوالات کے جوابات
1.6 فرہنگ
1.7 کتب برائے مطالعہ

## 1.1 تمہید

شخصیات ادوار کی پہچان ہوتی ہیں۔کسی ایک زمانے میں بسنے والے لوگ اس دور کا حوالہ بن جاتے ہیں۔کیونکہ لوگوں کا اسلوبِ فکر اور طرزِ عمل ایسے معاشرے کو تشکیل دیتا ہے جو اس دور کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے اگرچہ عوام وخواص ہر معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں۔مگر فطرت کا ایک قانون تسلسل سے چلا آرہا ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسی شخصیات ضرور موجود ہوتی ہیں جو انسانیت کے لئے محترم اور قوموں کا فخر بن کر وقت کی پیشانی پر اپنا نام یوں ثبت کر دیتی ہیں کہ تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کر پاتی۔ایسے لوگ ایک زمانے کے لیے نہیں رہ جاتے بلکہ آنے والا ہر زمانہ انہیں فکر وشعور کے مسند پر بٹھا کر ہمیشہ اپنے اندر زندہ رکھتا ہے۔اس پیرائے میں علامہ اقبال کی شخصیت کسی گوہرِ نایاب سے کم نہیں۔۱۳ویں صدی میں مولانا روم کے بعد علامہ اقبال ہی وہ شخصیت ہیں جن کا سکہ مشرق تا مغرب، بلا امتیاز مذہب وقوم ہر جگہ چلتا دکھائی دیتا ہے۔

## 1.2 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے ذریعہ آپ۔۔۔

۱۔ اقبال کے ابتدائی حالات سے واقف ہوں گے۔

۲۔علامہ اقبال کے عہد سے تعارف ہوگا۔

۳۔اقبال کی شخصیت سے روشناس ہوں گے۔

## 1.3 اقبال کی سوانح، شخصیت اور عہد

علامہ اقبال کا بچپن پنجاب کے قدیم شہر سیالکوٹ کی خوابیدہ خاموش گلیوں میں گزرا۔ ذہنی نشوونما کا ابتدائی دور سید میر حسن جیسے نابغہ روزگار استاد کی صحبت اور اسکاچ مشن اسکول کے مخصوص تعلیمی ماحول میں بسر ہوا۔ اوائل عمری میں اقبال نے لاہور کی شعری و ادبی محفلوں اور گورنمنٹ کالج کے اساتذہ بالخصوص پروفیسر آرنلڈ سے علمی استفادہ کیا۔ بعد میں انہوں نے کیمبرج (جرمنی) اور ہائڈل برگ کی رومان پرور علمی فضاؤں سے بھی بہت کچھ اخذ کیا لیکن ان کی شخصیت کی مجموعی تشکیل و تعمیر میں ان کے آباواجداد کے گوناگوں اثرات کا بھی دخل رہا ہے۔

سپرو برہمن طبقے کی ایک شاخ ہے، جب کہ برہمن ہندوؤں کی سب سے اونچی اور معزز ذات سمجھی جاتی ہے۔ علامہ اقبال کے آباواجداد سپرو تھے۔ سپروؤں کی اس نسل میں، ایک شخص بابا لول سب سے پہلے اسلام میں داخل ہوئے، انہی کی اولاد میں اقبال کے اسلاف کی چوتھی پشت میں شیخ محمد رفیق کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تھے، وہ درمیانہ قد کے بزرگ تھے اور نہایت وجیہ و خوبصورت تھے۔ قد و خال، لب و لہجے اور ان کے درخشاں چہرے سے ان کی کشمیریت ٹپکی پڑتی تھی۔ یہی شیخ محمد رفیق علامہ اقبال کے دادا تھے۔

شیخ محمد رفیق کے ہاں یکے بعد دیگرے دس بیٹے پیدا ہوئے مگر سوئے اتفاق کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔ 1873ء میں گیارہواں لڑکا تولد ہوا جس کا نام نور محمد رکھا گیا۔ نور محمد تجارت پیشہ گھرانے کے سادہ مزاج، بردبار اور حلیم الطبع شخص تھے۔ شیخ محمد رفیق نے ان کی شادی سمبڑیال، ضلع سیالکوٹ کے کشمیری گھرانے میں کر دی۔ حسنِ اخلاق، اعلیٰ ظرفی، گوناگوں خوبیوں اور صلح کل طبیعت کی وجہ سے شیخ نور محمد کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ نیک سرشت اور سادہ مزاج تھے۔ تلاوتِ کلام پاک، عبادات خصوصی اور تہجد سے شغف رکھتے تھے۔ خدمت خلق کے ساتھ کلامِ اللہ کی تلاوت کو دین و دنیا کی ترقی کا سبب سمجھتے تھے۔ وہ اپنی اولاد کو بھی تلاوت قرآن کی تاکید کیا کرتے تھے۔ اللہ نے انہیں 1859ء میں اولادِ نرینہ عطا کی، نام شیخ عطا محمد رکھا گیا۔ شیخ عطا محمد نے رڑکی انجینئرنگ کالج سے ڈپلوما حاصل کیا۔ بعد میں اقبال کے تعلیمی اخراجات وہی برداشت کرتے رہے۔ لاہور اور یورپ کے قیام اور حصولِ تعلیم میں بھی ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ بڑے لڑکے شیخ عطا محمد کی ولادت کے تقریباً پندرہ برس بعد شیخ نور محمد نے ایک خواب دیکھا کہ ایک وسیع و عریض میدان میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ فضا میں ایک خوب صورت پرندہ یا سفید کبوتر اڑ رہا ہے۔ لوگ اٹھ اٹھ کر دیوانہ وار اسے پکڑنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ پرندہ کبھی نیچے اترتا، کبھی آسمان کی طرف اڑ جاتا۔ آخر وہ پرندہ، فضا سے اترا اور ان کی گود میں آ گرا۔ چند روز بعد 8 نومبر 1877ء کو ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ اس خواب کی تعبیر ثابت ہوئی۔ خواب اقبال مندی کا تھا۔ اس لئے نومولود کا نام بجا طور پر شیخ محمد اقبال رکھا گیا۔

اقبال کی والدہ امام بی کا تعلق سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے سے تھا۔ وہ ایک نیک

دل، سلیقہ شعار اور دین دار خاتون تھیں۔ بالکل ان پڑھ تھیں، مگر ان کی معاملہ فہمی، حسنِ سلوک اور جذبہء خدمتِ خلق کی وجہ سے پورا محلّہ ان کا گرویدہ تھا۔ ایسی والدہ کے گہوارہ تربیت میں پرورش پانے والے بچے کو اقبال مند اور ماہِ انجم کا ہم قسمت ہونا ہی تھا۔

ع تربیت سے تیری میں، انجم کا ہم قسمت ہوا

شیخ نور محمد، امام بی اور میر حسن جیسی نیک طینت ہستیوں کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے شیخ محمد اقبال۔ جن کا راست اثر ان کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی نے بعد کے زمانے میں لکھی ہوئی اقبال کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' ملاحظہ کی' جو دراصل اقبال کی والدہ مرحومہ کا مرثیہ ہے تو نہایت صحیح بات کہی کہ اقبال کی شخصیت میں جو حق شناسی، خوش ذوقی، شوق معرفت، خودداری، تمکنت وغیرہ جیسی خوبیاں تھیں' ان کا بنیادی سبب یہی تھا کہ ان کے والدین ''ابرار'' تھے اور اقبال کی ذات میں انہی کا فیضِ تربیت جلوہ گر تھا۔

**ابتدائی تعلیم:**

علامہ اقبال کی طالبِ علمانہ زندگی پر سید میر حسن کی شخصیت حاوی ہے۔ جو مفکر اسلام اور عالم دین تھے۔ دین و دنیا کی صالح قدروں کو پیشِ نظر رکھ کر شاگردوں کی تربیت کرتے تھے۔ وہ نہ صرف علومِ اسلامی اور عرفان و تصوف سے آگاہ تھے بلکہ علومِ جدیدہ، ادبیات، لسانیات اور ریاضیات کے بھی ماہر تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز بہت خوب تھا۔ وہ اپنے شاگردوں میں اردو، فارسی اور عربی کا فصیح لسانی ذوق پیدا کرتے تھے۔ انہیں اردو، فارسی، عربی اور پنجابی کے ہزاروں اشعار ازبر تھے۔ فارسی کے کسی شعر کی تشریح کرتے وقت وہ اس کے مترادف اردو اور پنجابی کے بیسوں اشعار پڑھ ڈالتے تاکہ اس کا مطلب پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ اور عبادت گزار مسلمان تھے۔ مجسم اخلاق تھے۔ عام طور پر نہایت فصیح اور سلجھی ہوئی اردو میں بات چیت کرتے تھے۔ اقبال کی خوش بختی کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ انہیں والدین ہی کی طرح میر حسن جیسا سرپرست اور باکمال استاد ملا۔ ایسے مثالی استاد کی شاگردی کسی بھی شاگرد کے لئے باعثِ افتخار تھی اقبال تو پھر اقبال تھے۔ میر حسن اپنی فضیلت، وقت کی پابندی، حسنِ کردار کی وجہ سے اساتذہ اور طلبا میں یکساں طور پر مقبول و محترم اور ہر دل عزیز تھے۔ وہ مشن کالج میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے، اسی اثنا میں انہیں گورنمنٹ کالج لاہور بلکہ گورڈن کالج راولپنڈی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بھی پرکشش تنخواہ کی پیش کش ہوئی، مگر وہ مشن کالج کو چھوڑ کر کہیں جانے پر رضامند نہ ہوئے۔ یہ استغنا ان کے مزاج کا خاصہ تھا، جو اقبال کی طبیعت میں منتقل ہوا۔

اقبال ایک طرف تو میر حسن کی تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہوتے رہے، دوسری طرف اسکاچ مشن سکول کے فرض شناس اساتذہ کی شاگردی میں رہے۔ اس طرح ان کی سیرت و شخصیت پر مذکورہ دانش و بینش حضرات کا نقش مرتسم ہوتا گیا۔ بچپن ہی سے اقبال کی طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ وہ موزوں طبع اور خوش

آہنگ بھی تھے۔انہیں قرآنِ مجید بھی خوش الحانی سے پڑھنے کی عادت تھی۔ایک اور چیز جو اقبال کے میلانِ شعر گو ئی میں اضافے کا سبب بنی وہ فارسی زبان ہے۔بقول اقبال:

''فارسی سیکھنے میں، میں نے سخت محنت کی اور متعدد اساتذہ سے استفادہ کیا۔''

اقبال نے فارسی زبان کے ساتھ پنجاب یونیورسیٹی کے عربی امتحانات بھی اول درجے میں پاس کئے۔انہوں نے ایف۔اے تک مشرقی اور مغربی انداز میں مخلوط تعلیم حاصل کی اور بی۔اے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔یہاں اقبال کو متعدد نامور اور قابل اساتذہ سے اکتسابِ علم کا موقع ملا۔تقریباً چار سالہ طالبِ علمانہ زندگی کا یہ زمانہ اقبال کی ذہنی،فکری نشوونما اور شاعرانہ ارتقا کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔لالہ جیارام،مولانا محمد دین فوقی کشمیری،مولانا ابوسعید محمد شعیب،فیض الحسن سہارن پوری وغیرہ سے اقبال کو استفادے کا موقع ملا۔لیکن انہوں نے سب سے زیادہ فیضان علم پروفیسر آرنلڈ سے پایا۔پروفیسر آرنلڈ لاہور کالج سے پہلے علی گڑھ میں تدریسی خدمات انجام دے چکے تھے۔ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں:

'' آرنلڈ میں ایک طرف تو انسانی خوبیاں،دوست داری، محبت و ہمدردی پائی جاتی تھی،دوسری طرف وہ بے مثال علمی لگن رکھتے تھے۔ان کی مشرقیت،سادگی اور انکسار نے علی گڑھ کے تعلیمی اور علمی حلقوں میں انہیں بہت عزت بخشی تھی اور طلبہ واساتذہ میں محترم ومقبول بنادیا تھا''۔(علامہ اقبال:شخصیت اور فن،رفیع الدین ہاشمی)

پروفیسر آرنلڈ سرتاپا علم دوست انسان تھے۔وضع داری اور اپنے کام سے لگن ان کے مزاج کا حصہ تھی۔وہ طلبہ کے اندر قومی وملی احساس اور ایک تعمیری سوچ پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے۔سرسید احمد خان،مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی بھی پروفیسر آرنلڈ سے بہت متاثر تھے۔انہوں نے مولانا شبلی سے عربی اور فارسی زبان وادب کے سلسلے میں اکتساب کیا اور مولانا شبلی نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی۔علی گڑھ کالج میں/25 فروری 1904ء کو منعقدہ ان کی الوداعی تقریب میں مولانا حالی اور مولانا شبلی نے انہیں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔علامہ اقبال سے پروفیسر آرنلڈ کا برتاؤ استاد کے ساتھ ساتھ ایک دوست کی سطح کا بھی تھا۔بقول شیخ عبدالقادر:

''وہ علمی جستجو اور تلاش کے طریقہ جدید سے خوب واقف تھے۔انہوں نے چاہا کہ اپنے شاگرد کو اپنے مذاق اور طرزِ عمل سے حصہ دیں،وہ اس ارادے میں بہت کچھ کامیاب بھی ہوئے۔''ایضاً44 ص3

اورینٹل کالج میں علامہ اقبال کو پروفیسر آرنلڈ کی علمی صحبت میسر رہی۔انگلستان کے زمانہء قیام میں بھی

ان سے اقبال کا رابطہ برابر قائم رہا۔ایم۔اے کے بعد اقبال نے وکالت پاس کی۔بعد ازاں اورینٹل کالج میں فلسفہ، منطق، اقتصادیات اور تاریخ کے مضامین پڑھاتے رہے۔ وہ تقریباً چار سال تک صاحبِ روزگار رہے۔ تاہم سفرِ انگلستان، وہاں کے قیام اور تعلیمی اخراجات کے لئے خطیر رقم کی ضرورت تھی۔علامہ اقبال کے عزمِ صمیم کو دیکھ کر شیخ عطا محمد (بڑے بھائی) اقبال کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے۔

**سفرِ انگلستان:**

یکم ستمبر 1905ء میں علامہ اقبال یورپ کے سفر کی طرف روانہ ہوئے، پہلے بذریعۂ ریل لاہور سے دہلی روانہ ہوئے۔دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر نظم ''التجائے مسافر'' پڑھی:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

پھر قریب ہی واقع مرزا غالب کی قبر اور بعد ازاں ہمایوں و داراشکوہ کے قبروں پر فاتحہ خوانی کی۔اگلے روز دہلی سے ممبئی اور ممبئی سے بحری جہاز کے ذریعے انگلستان روانہ ہوئے۔دہلی کے مختصر قیام اور ممبئی سے لندن تک کا احوالِ سفر اقبال نے مولوی انشا اللہ خان کے نام دو خطوط میں تفصیل سے رقم کیا ہے۔ان خطوط میں اقبال نے اپنے مشاہدات میں اہم شخصیات اور بعض چیزوں کے بارے میں اپنے احساسات تحریر کیے ہیں۔مثلاً محبوب الٰہی کا مزار، ممبئی کا ماحول، پارسیوں، چینیوں اور ترکوں کا ذکر، ہندی مسلمانوں کا انحطاط، بحری جہاز میں فرانسیسیوں کا حسنِ انتظام، سمندر کا نظارہ، طلوعِ آفتاب کا حسن، ساحلِ عرب سے گزرتے ہوئے رسول اللہ سے جذباتی اور قلبی وابستگی کا والہانہ اظہار، بعض ہم سفروں کا تعارف، ساحلِ مصر، سویز اور پورٹ سعید سے گزرتے ہوئے اسلامی اخوت کے تجربات وغیرہ۔بحیرہ روم سے گزرتے ہوئے ان کی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہوئی تو انہوں نے مشہور غزل لکھی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے

مثال پر تو مے طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا، صبح و شام کرتے ہیں

24 ستمبر کو اقبال لندن پہنچے جہاں ان کے دیرینہ دوست شیخ عبدالقادر ان کے منتظر تھے۔عبدالقادر کی موجودگی کی وجہ سے اجنبی ماحول اور دیارِ غیر میں درپیش مسائل سے عہدہ آبر ہونے میں اقبال کو بہت مدد ملی، نیز تعلیمی امور کے ضمن میں پروفیسر آرنلڈ ان کے مشیر اور رہنما بنے۔بہر حال لندن میں دو تین روز ٹھہر کر علامہ اقبال کیمبرج چلے گئے اور یہیں ٹرنٹی کالج میں Advance student یعنی ایسا طالبِ علم جس کے پاس پہلے سے

کسی یونیورسٹی کی ڈگری ہو' کے طور پر داخلہ لیا،لیکن سفر انگلستان کی اصل غایت تو بیرسٹری کی سند کا حصول تھا،اسی لئے اگلے ہی ماہ علامہ اقبال لندن آئے اور قانونی تعلیم کے معروف ادارے ''لنکنز ان'' میں داخلہ لیا۔ٹرنٹی کالج میں انہیں پوسٹ گریجویٹ طالب علم کی حیثیت سے خصوصی قواعد کے تحت بی۔اے کے امتحان کے لئے مقالہ ترین منزل ہے۔'' (ص۹۰)ایضاً

اقبال' تین برس کے اس عرصے میں وسیع اور گوناگوں تجربات سے گزرے،انہوں نے اپنی علمی تحقیق کے سلسلے میں ڈیڑھ سال تک مختلف یورپی علوم کا مطالعہ کیا۔نیز کیمبرج،لندن،ہائڈل برگ اور میونخ میں قیام کے دوران اپنی علمی اور تعلیمی استعداد میں اضافہ کیا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ یورپی معاشرے کے تمدن،معیشت،سیاست اور تعلیم کا مطالعہ کرتے رہے۔انہیں مختلف یورپی ممالک کی باہمی رقابتوں،ان کے استعماری عزائم اوران کی سرمایہ دارانہ ذہنیتوں پر تفکر وتجسس کے ساتھ غور کرنے اوراس طرح یورپ کے باطن میں جھانکنے کا موقع ملا۔

**آل واولاد:**

علامہ اقبال نے تین شادیاں کی تھیں اور تینوں بیویاں ایک ساتھ ان کے حبالہ نکاح میں رہیں۔پہلی شادی کریم بی بی سے ہوئی۔ وہ گجرات کی رہنے والی تھیں۔ انہی سے آفتاب اقبال اور معراج بیگم تولد ہوئے۔علامہ اقبال کی دوسری بیوی سردار بیگم تھیں جن کے بطن سے جاوید اقبال اور منیرہ پیدا ہوئیں۔تیسری بیوی مختار بیگم تھیں، جو اقبال کی حیات ہی میں انتقال کر گئیں۔

**علالت اور وفات:**

حیاتِ مستعار کے آخری برس،موسمِ سرما کی آمد کے ساتھ ہی بلغم کی مقدار میں اضافہ ہوتا گیا۔دواؤں کے اثر سے اس میں کچھ کمی تو ہوئی،مگر دمہ کی شکایت مکمل طور پر کم نہیں ہوسکی۔ذرا سی حرکت سے دم پھولنے لگا۔دمہ کی اصل وجہ قلب کی کمزوری تھی۔تیس،پینتیس برس سے مسلسل تمباکو نوشی جاری تھی،یہی علامہ اقبال کی بیماری کی جڑ تھی،مگر حقہ نوشی آخر تک ترک نہیں کی۔آخری علالت کے ایام میں اقبال کو دمے کے شدید متواتر دورے پڑنے لگے تھے۔وہ گرتی ہوئی صحت کے باوجود بھی صابر وشاکر تھے۔پابندی سے نمازیں ادا کرتے اور قرآن پڑھتے تھے،لیکن آخری ایام میں بینائی کمزور ہوجانے کے باعث قرآن سننے لگے تھے۔سنتے سنتے رونے لگتے اور بالآخر وجد میں آجاتے تھےاور اکثر دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ

''موت آئے گی تو انشاءاللہ مجھے متبسم پائے گی۔''

گویا انہیں اپنی گرتی ہوئی صحت کا بخوبی ادراک تھا۔انتقال سے ایک دن قبل رات گئے تک ملتِ اسلامیہ اور مسلمانوں کے متعلق سوچتے رہےاور پھر شدت سے روتے رہے۔

آخری شب معالجین جاوید منزل پر جمع ہوئے تو انہیں بتایا گیا کہ کل شام سے علامہ کو بلغم میں خون آ رہا تھا، معالجین کے نزدیک یہ علامت یاس انگیز تھی۔ اقبال کو اس بات کا علم ہو گیا۔ جاوید اقبال کہتے ہیں:

''انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی موت کا وقت قریب آ پہنچا ہے، بایں
ہمہ وہ ضرورت سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔''

رخصت ہوتی ہوئی بہار کے یہ آخری دن تھے، ابھی جاوید منزل کے چمن میں پھول کھلنا بند نہیں ہوئے تھے۔ اس شام جاوید منزل کا لان پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ علامہ اقبال باہر لان میں بچھی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ رات اترنے پر خنکی بڑھی تو چارپائی اندر گول کمرے میں لائی گئی۔ اتنے میں منیرہ ان سے آ کر لپٹ گئی۔ اقبال کی خادمہ ڈورس احمد بھی مزاج پرسی کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد جب خادمہ نے منیرہ کو اندر لے جانا چاہا تو اس نے کچھ اور بابا کے پاس بیٹھے رہنے پر اصرار کیا۔ علامہ نے مسکرا کر خادمہ سے کہا:

''اس کی حس اسے بتا رہی ہے کہ بابا کے ساتھ یہ اس کی آخری ملاقات ہے۔''

**علامہ اقبال کی شخصیت:**

علامہ اقبال محض ایک شخصیت نہیں بلکہ تاریخ کا ایک مکمل باب ہیں جو جامعیت اور ہمہ گیریت کو یوں اپنے اندر سمائے ہوئے ہیں کہ ان کی شخصیت کا احاطہ کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ سادگی، سنجیدگی اور کم گوفطرت کے ساتھ علامہ اقبال ایک لطیف طبیعت کے مالک تھے۔ مگر خاموشی کا عنصر طبیعت پر غالب تھا، گھر میں عموماً آنکھیں بند کیے کسی سوچ میں مستغرق دکھائی دیتے۔ شاعری میں جھلکنے والی صاف گوئی اور بے باک انداز کے برعکس ذاتی زندگی میں ان کا مزاج اظہارِ جذبات کے جذبات سے معدوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جاوید اقبال والد کے متعلق لکھتے ہیں:

زندگی میں شاذ و نادر ہی ایسا موقع آیا ہوگا جب علامہ نے روایتی شفقتِ پدری کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ اولاد سے محبت نہیں کرتے تھے بلکہ مزاجاً وہ ایسی شخصیت کے حامل تھے کہ ان کا ہر ردِعمل اور اظہار خاموشی کے اندر ہی پنہاں رہتا۔ گھر میں بچوں کو کھیلتا مسکراتا دیکھ کر مسکراتے۔ کوئی بیمار ہوتا تو بار بار اس کی طبیعت پوچھتے، اور پریشانی میں آس پاس ٹہلتے۔ زوجہ کی وفات کے بعد ان کی خاموشی اور بڑھ گئی لیکن بچوں کی ذمہ داری بحسن وخوبی پوری کی۔

سمندر کے سکوت جیسی ٹھہراؤ والی طبیعت میں اگر کبھی ہیجان پیدا ہوتا تو اس وقت جب کسی شعر کی آمد ہوتی۔ چہرہ متغیر ہو جاتا، بے چینی کے عالم میں بستر پر کروٹیں لیتے، کبھی اٹھتے اور کبھی بیٹھتے۔ اکثر اوقات رات میں علی بخش کو آواز دیکر قلم دوات لانے کو کہتے، اشعار لکھ لینے کے بعد رفتہ رفتہ ان کی بے چینی کم ہونے لگتی اور چہرہ پرسکون ہو جاتا۔

قرآن اور صاحبِ قرآن سے عقیدت اور انسیت کا جو تعلق علامہ اقبال کے ہاں دکھائی دیتا ہے وہ کسی

پیمانے میں سما نہیں سکتا۔قرآن سے آپ کا تعلق کبھی بھی محض قاری اور کتاب کا نہیں تھا بلکہ آپ کے اندر قرآن سے شغف، اور فکر و شعور کے ساتھ مطالعہ قرآن کا ایک والہانہ پن موجود تھا۔آپ اپنا ایک واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں روزانہ نمازِ فجر کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا۔والد صاحب دیکھتے تو پوچھتے کیا کرتے ہو؟ میں ہر روز ایک ہی جواب دیتا اور وہ خاموشی سے چلے جاتے۔ایک دن انہوں نے کہا کہ تم قرآن پڑھتے ہو تو یوں پڑھا کرو گویا قرآن اسی وقت نازل ہو رہا ہے۔اور خدا تم سے ہی ہمکلام ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے قرآن کو برابر سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور یوں ہی پڑھا گویا ابھی نازل ہو رہا ہے۔اسی محبت کا ثمر تھا کہ آپ کا ہر لفظ، ہر شعر قلب و روح کو ایک آفاقی سوز و گداز اور جلا بخشتا ہے۔اسی صدق، عقیدت، محبت اور ایمان کا کمال ہے جس نے آپ کے کمال کو زندہ جاوید کلام بنا دیا ہے۔

علامہ اقبال کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں میں سیاست، سماجیات، معاشیات، عمرانیات، اخلاقیات، ادبیات اور مذہبیات کو گہرا دخل ہے۔اقبال کو صرف شاعر سمجھنا اقبال شناسی کے منافی ہے۔ان کی شخصیت کے تخلیقی پہلوؤں میں اس قدر جامعیت ہے کہ ایک گوشہ جان کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہی کل شخصیت کے لیے کافی ہے۔مگر آپ نہ صرف ایک شاعر بلکہ مفکر، مدبر، قانوں داں، سیاست داں، فلسفی، صوفی اور پختہ مومن تھے۔آپ نے تضاد کے بغیر عقل اور عشق کا تقابلہ جس انداز میں کیا وہ عام انسان کے فکر و شعور کو جھنجوڑ کے رکھ دیتا ہے، آپ کے فکر میں عقل بھی عروج پر ہے اور عشق بھی کمال پر۔آپ نے جہاں جوانوں کو عشق و جنون کا درس دیا ہے وہیں عقل، تدبر اور حکمت کو نصب العین بنا کر زندگی کا مقصد حاصل کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔

گویا اقبال ایک ایسا سنگم ہیں جہاں علم و عرفاں کے بہت سے دریا آ کر ملتے ہیں۔اقبال کا پیغام، پیغامِ حیات ہے جو تمام انسانیت کے لیے ہے۔آپ نے اس کے ذریعے امت اور قوم کو اندھیرگی میں روشنی سے آشنا کر کے حیات کا علم بردار بنا دیا۔تاریخ بنی نوعِ انساں ایسی نادر ہستیوں کی ہمیشہ مقروض رہتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

**اقبال کا عہد:**

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز اس وقت کیا، جب ہندوستان میں برطانوی غلامی دور دورہ تھا۔ان کا جس عہد سے تعلق ہے اور جس کی عکاسی نمایاں طور پر ان کی شاعری اور نظریات سے ملتی ہے وہ ۱۹۰۰ء کے بعد شروع ہوا۔اور ۱۹۳۸ء میں اقبال کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۰۲ء میں کر دیا تھا۔اور ان کی شاعری و نظریات کا ارتقا جنگِ عظیم اول کے بعد اور جنگِ دوم سے پہلے ہوا، یہی وہ دور ہے، جس کی عبوری نوعیت نے اقبال کی شاعری اور افکار کی نمایاں خصوصیات کو نکھارا۔اقبال نے اپنی نظموں میں جو ۱۹۰۲ تا

۱۹۳۸ کی اپنی ادبی سرگرمیوں کے دوران تحریر کی گئیں خاص طور پر اس دور کے ہندوستان کی مرقع نگاری کی۔ جب وہ برطانوی سامراجیت کے زیر حکومت تھا۔ جاگیردار، ساہوکار اور کسان کا ہندوستان۔ تاریخِ ہند کے اس عہد کی عکاسی میں اقبال اتنے زیادہ اہم مسایل پیش کرنے میں کامیاب رہے اور انہوں نے اپنی فنی خوبیوں کو اتنی بلندی پر پہنچایا کہ ان کی نظموں کا شمار اردو، فارسی اور عالمی ادب کے بہترین شاہکاروں میں ہونے لگا۔ ایک ایسے ملک میں جو انگریزوں کی غلامی اور طبقاتی تفریق کی ایک زندہ مثال تھا، میں اقبال جیسے عظیم شاعر کا پیدا ہونا کسی معجزے سے کم نہیں۔

اقبال کا عہدِ حیات ایک نوآبادیاتی دور میں بسر ہوا۔ نہ صرف ان کا وطن ہندوستان بلکہ، پورا مشرق اور پورا افریقہ، مغربی استعمار کے خونی پنجوں میں جکڑا تھا۔ اپنے ماحول کے ناگفتہ بہ احوال وکوائف نے اقبال کو ہمیشہ بے چین اور مضطرب رکھا۔ وہ مسلمانوں کی حالتِ زار پر بہت فکر مند تھے۔ جو جدید تعلیم، ملازمتوں اور مادی وسایل کے لحاظ سے کہیں پیچھے تھے۔ مسلم دنیا کی صورتِ حال اور بھی ابتر تھی۔ اقبال اس صورتِ حال پر افسردہ اور رنجیدہ رہتے اگرچہ ان کی شخصیت باطنی اعتبار سے بہت توانا تھی اور بدترین حالات میں بھی وہ سپر انداز ہوے نہ کبھی مایوس، تاہم ایک شاعر کی طبعی رومانیت بعض اوقات انہیں مغموم کر دیتی۔ بحیثیت مجموعی وہ بہت رجائیت پسند تھے اور کائنات میں انسان کی حیثیت اس کے مستقبل اور دنیا جہاں کے بارے میں ہمیشہ پرامید رہے۔ ان کا فلسفہ خودی اور تصورِ عشق انسان کو اس کی خلیفتہ الارض کی حیثیت یاد دلا کر اسے حوصلہ عطا کرتا اور تگ وتازِ حیات میں جدوجہد پر ابھارتا ہے۔ ہم عصر سیاسی اور تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی صورتِ حال کا وہ برابر مطالعہ کرتے رہے، سوچتے رہے اور غور وفکر کرتے ہوے اپنے ذہن میں مستقبل کے نقشے بناتے رہے۔ ان کی سوچ کا محور ومرکز انسان تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ انسان ترقی وفلاح اور بہتر مستقبل کے لیے انسانیت اور عالمِ انسانیت کی تعمیرِ نوع کے لیے ظاہر ہے۔ یہ اسی وقت ممکن تھا اور ہے جب نظامِ عالم کی تشکیل نئی بنیادوں پر کی جاے۔ سنجیدہ علمی وفکری معاملات پر علامہ اقبال اپنے بعض فاضل دوستوں سے تبادلۂ خیالات بھی کیا کرتے تھے۔

علامہ اقبال سرسید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد سے بہت متاثر تھے۔ نیچرل اور قومی شاعری کے اثرات اقبال نے انہیں سے قبول کیے۔ اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور میں حالی، اکبر، داغ، شاد عظیم آبادی اردو شاعری کے افق پر چھائے ہوے تھے۔ حالی اور آزاد اردو شاعری کو نیچرل اور ادب کو تنقیدِ حیات بنانے میں لگے ہوے تھے، جس کے تحت انھوں نے متعدد تخلیقی کارنامے انجام دیے۔ علامہ کے معاصرین میں حسرت، یگانہ، فانی اور جگر کا نام خاص طور سے لیا جاسکتا ہے۔ اقبال نے قدیم اور جدید دونوں روایتوں کے مابین مستحکم اور مضبوط رشتہ بنایا۔ اقبال کی ذہنی وفکری تشکیل میں ان کے استاد پروفیسر آرنلڈ کا بھی اہم رول ہے۔ انہیں کی سرپرستی میں اقبال نے مغربی فلسفے کا مطالعہ کیا اور مشرقی فلسفے کو سمجھنے کے مواقع ملے۔

علامہ اقبال کے عہد کا جائزہ لیتے ہوئے جب ہم ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اردو شاعری میں ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔انہوں نے مشرق ومغرب کو سامنے رکھ کر ایک نئے فلسفے کی تشکیل کی اور یہی ان کی عظمت کی مسلم دلیل ہے۔اس سلسلے میں جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں کہ

''جہاں تک مشرقی اور مغربی فلسفے کو آپس میں ملانے کا تعلق ہے اقبال کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے ایک مضبوط پل کا کام کیا ہے۔،،

ادبی حیثیت سے اقبال کا عہد بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔اس زمانے میں فن برائے زندگی کے بجائے فن برائے فن کو ترجیح دی جارہی تھی،لیکن اقبال فن برائے زندگی کے قایل تھے۔ایسا نہیں کہ انہوں نے فن برائے فن کو بالائے طاق رکھا بلکہ وہ ادب میں اسلوب اور حسن سے زیادہ موضوع کو ترجیح دیتے ہیں۔

## 1.4 اپنا امتحان خود لیجیے

اس اکائی کے ذریعہ۔۔۔

۱۔ اقبال کے بچپن اور ابتدائی حالات سے واقفیت ہوئی۔

۲۔علامہ اقبال کی شخصیت سے آگاہی حاصل کی۔

۳۔اقبال کے مرض،علالت اور وفات سے متعلق معلومات حاصل کیں۔

۴۔علامہ اقبال کا عہد واضح ہوا۔

## 1.5 سوالات کے جوابات

1۔اقبال کے بچپن سے متعلق لکھیے؟

علامہ اقبال کا بچپن پنجاب کے قدیم شہر سیالکوٹ کی خوابیدہ خاموش گلیوں میں گزرا۔ذہنی نشوونما کا ابتدائی دور سید میر حسن جیسے نابغہء روزگار استاد کی صحبت اور اسکاچ مشن اسکول کے مخصوص تعلیمی ماحول میں بسر ہوا۔اوائل عمری میں اقبال نے لاہور کی شعری و ادبی محفلوں اور گورنمنٹ کالج کے اساتذہ بالخصوص پروفیسر آرنلڈ سے علمی استفادہ کیا۔بعد میں انہوں نے کیمبرج (جرمنی) اور ہائڈل برگ کی رومان پرور علمی فضاؤں سے بھی بہت کچھ اخذ کیا لیکن،ان کی شخصیت کی مجموعی تشکیل وتعمیر میں ان کے آباواجداد کے گوناگوں اثرات کا بھی دخل رہا ہے۔

سپرو برہمن طبقے کی ایک شاخ ہے،جب کہ برہمن ہندوؤں کی سب سے اونچی اور معزز ذات سمجھی جاتی ہے۔علامہ اقبال کے آباواجداد سپرو تھے۔سپروؤں کی اس نسل میں،ایک شخص بابا لول سب سے پہلے اسلام میں داخل ہوئے،انہی کی اولاد میں اقبال کے اسلاف کی چوتھی پشت میں شیخ محمد رفیق کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تھے،وہ درمیانہ قد کے بزرگ تھے اور نہایت وجیہ وخوبصورت تھے۔خد و خال،لب و لہجے اور ان کے درخشاں چہرے سے ان کی کشمیریت ٹپکی پڑتی تھی۔(۱) یہی شیخ محمد رفیق علامہ اقبال کے دادا تھے۔

شیخ محمد رفیق کے ہاں یکے بعد دیگرے دس بیٹے پیدا ہوئے مگر سوئے اتفاق کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔1873ء میں گیارہواں لڑکا تولد ہوا جس کا نام نور محمد رکھا گیا۔نور محمد تجارت پیشہ گھرانے کے سادہ مزاج، بردبار اور حلیم الطبع شخص تھے۔شیخ محمد رفیق نے ان کی شادی سمبڑیال، ضلع سیالکوٹ کے کشمیری گھرانے میں کر دی۔حسنِ اخلاق، اعلیٰ ظرفی، گوناگوں خوبیوں اور صلح کل طبیعت کی وجہ سے شیخ نور محمد کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔وہ نیک سرشت اور سادہ مزاج تھے۔تلاوتِ کلام پاک، عبادات خصوصاً تہجد سے شغف رکھتے تھے۔خدمت خلق کے ساتھ کلامِ اللہ کی تلاوت کو دین و دنیا کی ترقی کا سبب سمجھتے تھے۔وہ اپنی اولاد کو بھی تلاوت قرآن کی تاکید کیا کرتے تھے۔اللہ نے انہیں 1859ء میں اولادِ نرینہ عطا کی، نام شیخ عطا محمد رکھا گیا۔شیخ عطا محمد نے رڑکی انجینئرنگ کالج سے ڈپلوما حاصل کیا۔ بعد میں اقبال کے تعلیمی اخراجات وہی برداشت کرتے رہے۔ لاہور اور یورپ کے قیام اور حصولِ تعلیم میں بھی ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ بڑے لڑکے شیخ عطا محمد کی ولادت کے تقریباً پندرہ برس بعد شیخ نور محمد نے ایک خواب دیکھا کہ ایک وسیع و عریض میدان میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔فضا میں ایک خوب صورت پرندہ یا سفید کبوتر اڑ رہا ہے۔لوگ اٹھ اٹھ کر دیوانہ وار اسے پکڑنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ پرندہ کبھی نیچے اترتا، کبھی آسمان کی طرف اڑ جاتا۔آخر وہ پرندہ، فضا سے اترا اور ان کی گود میں آ گرا۔ چند روز بعد 8؟ نومبر 1877ء کو ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ اس خواب کی تعبیر ثابت ہوئی۔خواب اقبال مندی کا تھا۔اس لئے نومولود کا نام بجا طور پر شیخ محمد اقبال رکھا گیا۔

اقبال کی والدہ امام بی کا تعلق سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے سے تھا۔وہ ایک نیک دل، سلیقہ شعار اور دین دار خاتون تھیں۔ بالکل ان پڑھ تھیں، مگر ان کی معاملہ فہمی، حسنِ سلوک اور جذبہء خدمتِ خلق کی وجہ سے پورا محلّہ ان کا گرویدہ تھا۔ایسی والدہ کے گہوارہ تربیت میں پرورش پانے والے بچے کو اقبال مند اور ماہِ انجم کا ہم قسمت ہونا ہی تھا۔

ع تربیت سے تیری میں، انجم کا ہم قسمت ہوا

شیخ نور محمد، امام بی اور میر حسن جیسی نیک طینت ہستیوں کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے شیخ محمد اقبال۔ جن کا راست اثر ان کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔لسان العصر اکبر الہ آبادی نے بعد کے زمانے میں لکھی ہوئی اقبال کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' ملاحظہ کی، جو دراصل اقبال کی والدہ مرحومہ کا مرثیہ ہے تو نہایت صحیح بات کہی کہ اقبال کی شخصیت میں جو حق شناسی، خوش ذوقی، شوق معرفت، خودداری، تمکنت وغیرہ جیسی خوبیاں تھیں، ان کا بنیادی سبب یہی تھا کہ ان کے والدین ''ابرار'' تھے اور اقبال کی ذات میں انہی کا فیضِ تربیت جلوہ گر تھا۔

.2۔اقبال کا عہد پر نوٹ لکھیے؟

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز اس وقت کیا، جب ہندوستان میں برطانوی غلامی دور دورہ تھا۔ان کا

جس عہد سے تعلق ہے اور جس کی عکاسی نمایاں طور پر ان کی شاعری اور نظریات سے ملتی ہے وہ ۱۹۰۰ کے بعد شروع ہوا۔ اور ۱۹۳۸ میں اقبال کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۰۲ میں کر دیا تھا۔ اور ان کی شاعری و نظریات کا ارتقا جنگِ عظیم اول کے بعد اور جنگِ دوم سے پہلے ہوا، یہی وہ دور ہے، جس کی عبوری نوعیت نے اقبال کی شاعری اور افکار کی نمایاں خصوصیات کو نکھارا۔ اقبال نے اپنی نظموں میں جو ۱۹۰۲ تا ۱۹۳۸ کی اپنی ادبی سرگرمیوں کے دوران تحریر کی گئیں خاص طور پر اس دور کے ہندوستان کی مرقع نگاری کی۔ جب وہ برطانیہ کا غلام تھا۔ جاگیردار، ساہوکار اور کسان کا ہندوستان۔ تاریخِ ہند کے اس عہد کی عکاسی میں اقبال اتنے زیادہ اہم مسایل پیش کرنے میں کامیاب رہیا ور انہوں نے اپنی فنی خوبیوں کو اتنی بلندی پر پہنچایا کہ ان کی نظموں کا شمار اردو، فارسی اور عالمی ادب کے بہترین شاہکاروں میں ہونے لگا۔ ایک ایسے ملک میں جو انگریزوں کی غلامی اور طبقاتی تفریق کی ایک زندہ مثال تھا، میں اقبال جیسے عظیم شاعر کا پیدا ہونا کسی معجزے سے کم نہیں۔

اقبال کا عہدِ حیات ایک نوآبادیاتی دور میں بسر ہوا۔ نہ صرف ان کا وطن ہندوستان بلکہ، پورا مشرق اور پورا افریقہ، مغربی استعمار کے خونی پنجوں میں جکڑا تھا۔ اپنے ماحول اور احوال وظروف نے اقبال کو ہمیشہ بے چین اور مضطرب رکھا۔ وہ ہندی مسلمانوں کی حالتِ زار پر بہت فکرمند تھے۔ جو جدید تعلیم، ملازمتوں اور مادی وسائل کے لحاظ سے کہیں پیچھے تھے۔ مسلم دنیا کی صورتِ حال اور بھی ابتر تھی اقبال اس صورتِ حال پر افسردہ اور رنجیدہ رہتے اگرچہ ان کی شخصیت باطنی اعتبار سے بہت توانا تھی اور بدترین حالات میں بھی وہ سپر انداز ہوے نہ کبھی مایوس، تاہم ایک شاعر کی طبعی رومانیت بعض اوقات انہیں مغموم کر دیتی۔ بحیثیت مجموعی وہ بہت رجائیت پسند تھے اور کائنات میں انسان کی حیثیت اس کے مستقبل اور دنیا جہاں کے بارے میں ہمیشہ پر امید رہے۔ ان کا فلسفۂ خودی اور تصورِ عشق انسان کو اس کی خلیفتہ الارض کی حیثیت یاد دلا کر اسے حوصلہ عطا کرتا اور تگ وتازِ حیات میں جدوجہد پر ابھارتا ہے۔ ہم عصر سیاسی اور تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی صورتِ حال کا وہ برابر مطالعہ کرتے رہے، سوچتے رہے اور غور وفکر کرتے ہوے اپنے ذہن میں مستقبل کے نقشے بناتے رہے۔ ان کی سوچ کا محور ومرکز انسان تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ انسان ترقی وفلاح اور بہتر مستقبل کے لیے انسانیت اور عالمِ انسانیت کی تعمیرِ نوع کے لیے ظاہر ہے۔ یہ اسی وقت ممکن تھا اور ہے جب نظامِ عالم کی تشکیل نئی بنیادوں پر کی جائے۔ سنجیدہ علمی وفکری معاملات پر علامہ اقبال اپنے بعض فاضل دوستوں سے تبادلہء خیالات بھی کیا کرتے تھے۔

علامہ اقبال سر سید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد سے بہت متاثر تھے۔ نیچرل اور قومی شاعری کے اثرات اقبال نے انہیں سے قبول کیے۔ اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور میں حالی، اکبر، داغ، شاد عظیم آبادی اردو شاعری کے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ حالی اور آزاد اردو شاعری کو نیچرل اور ادب کو تنقیدِ حیات بنانے میں لگے ہوئے تھے، جس کے تحت انھوں نے متعدد تخلیقی کارنامے انجام دیے۔ علامہ

کے معاصرین میں حسرت، یگانہ، فانی اور جگر کا نام خاص طور سے لیا جاسکتا ہے۔اقبال نے قدیم اور جدید دونوں روایتوں کے مابین مستحکم اور مضبوط رشتہ بنایا۔اقبال کی ذہنی وفکری تشکیل میں ان کے استاد پروفیسر آرنلڈ کا بھی اہم رول ہے۔انہیں کی سرپرستی میں اقبال نے مغربی فلسفے کا مطالعہ کیا اور مشرقی فلسفے کو سمجھنے کے مواقع ملے۔

علامہ اقبال کے عہد کا جائزہ لیتے ہوئے جب ہم ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اردو شاعری میں ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔انہوں نے مشرق ومغرب کو سامنے رکھ کر ایک نیے فلسفے کی تشکیل کی اور یہی ان کی عظمت کی مسلم دلیل ہے۔اس سلسلے میں جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''جہاں تک مشرقی اور مغربی فلسفے کو آپس میں ملانے کا تعلق ہے اقبال کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے ایک مضبوط پل کا کام کیا ہے۔''

ادبی حیثیت سے اقبال کا عہد بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔اس زمانے میں فن برائے زندگی کے بجائے فن برائے فن کو ترجیح دی جارہی تھی،لیکن اقبال فن برائے زندگی کے قائل تھے۔ایسا نہیں کہ انہوں نے فن برائے فن کو بالائے طاق رکھا بلکہ وہ ادب میں اسلوب اور حسن سے زیادہ موضوع کو ترجیح دیتے ہیں۔

## 1.6 فرہنگ

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| مسلم | مانا ہوا |
| افکار | فکر کی جمع |
| ترسیل | پہونچانا |
| تسلسل | سلسلہ |
| ترجیح | فوقیت دینا |

## 1.7 کتب برائے مطالعہ


۱۔نئی شعری روایت،شمیم حنفی

۲۔اقبال اور اس کا عہد،جگن ناتھ آزاد

۳۔اقبال اور قومی یکجہتی،منظر اعجاز

# اکائی:2 علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف ادوار اور ذہنی ارتقا (تاریخی تہذیبی اور ادبی پس منظر)

ساخت:

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 علامہ اقبال کے ذہنی ادوار کا ارتقا

2.3.1 شاعری کی ابتدا

2.4 قومی ووطنی شاعری کا ارتقا اور دورِ اول

2.5 اسلامی کلام اور اقبال کی فکر

2.6 اقبال کے کلام یا فلسفے کی نوعیت کا دور ارتقا (خودی و بے خودی، اسلامی نظریہ)

2.7 تیسرا اور آخری دور

2.8 آپ نے کیا سیکھا

2.9 اپنا امتحان خود لیں

2.10 سوالات کے جوابات

2.11 فرہنگ

2.12 کتب برائے مطالعہ

## 2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

علامہ اقبال کی ابتدائی دور کی قومی اور وطنی شاعری کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

علامہ اقبال کی شاعری کے دور دوم کے بارے میں آگاہی ہوگی۔

اقبال کے تاریخی پس منظر سے روشناس ہوں گے۔

## 2.2 تمہید

اقبال جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ زمانہ دو مختلف انقلابات سے دوچار تھا۔ خود ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ سرسید احمد خان اور راجہ رام موہن رائے نے جو تعلیمی تحریک وسط انیسویں صدی میں شروع کی تھی وہ اب سیاسی میدان میں اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہو چکی تھی۔ کانگریس نے دبے دبے لہجے میں سوراج کا نعرہ بلند کر دیا تھا اور اقبال نے جس زمانہ میں شعر کہنا شروع کیا وہ دور تو ہندوستانی قومیت اور تحریک آزادی کا نقطۂ عروج تھا۔ اسی زمانہ میں یعنی بیسویں صدی کے پہلے سال ہی اقبال نے لاہور سے اپنی آواز بلند کی اور یہ آواز ہمالیہ کے زیر عنوان بلند ہوئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہندوستانیوں کی دل کی آواز بن گئی۔ اس نظم کو ہماری قومی زندگی میں وہی مقام حاصل ہوا جو وکوہ ہمالیہ کو حاصل تھا یعنی اقبال کے ابتدائی زمانہ کی نظم ہندوستانی قوم کی ترجمان بھی ہے اور نگہبان بن گئی ہے۔

اے ہمالہ داستان اس وقت کی کوئی سنا — مسکن آبائے انسان جب بناد امن تیرا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

## 2.3 علامہ اقبال کے ذہنی ادوار کا ارتقا

### 2.3.1 شاعری کی ابتدا

اقبال کی شاعری پر اظہار خیال کرنے والے مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی شاعری کا آغاز اسی وقت ہو گیا جب وہ ابھی اسکول کے طالب علم ہی تھے۔ اس سلسلے میں شیخ عبدالقادر کہتے ہیں کہ جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے اس وقت سے ہی ان کی زبان سے کلام موزوں نکلنے کا تھا۔ عبدالقادر سروری کا کہنا ہے کہ جب وہ اسکول کی تعلیم ختم کر کے اسکاچ مشن کالج میں داخل ہوئے تو ان کی شاعری شروع ہوئی۔ ان دونوں آرا میں اگر چہ معمولی سا اختلاف ہے لیکن یہ ثابت ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کا آغاز انھیں دنوں میں ہو گیا تھا۔ جب وہ اپنے آبائی شہر سیالکوٹ کے چھوٹے موٹے مشاعروں میں بھی شرکت کیا کرتے تھے لیکن ان کی اس زمانے کی شاعری کا نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ کچھ عرصے بعد علامہ اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور پہنچے تو اسی بھی وادبی مرکز میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ابھارنے اور تربیت پانے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ یہاں جگہ جگہ شعر و شاعری کی محفلوں کا چرچا تھا۔ اقبال بھی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے، شہرت ہونے لگی آہستہ آہستہ اقبال لوگوں کے دلوں پر راج کرتے نظر آئے۔

اقبال کی ذہنی وفکری ارتقا کے منازل کا تعین اس کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے کیا جاتا رہا ہے۔ کیونکہ اقبال نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کا ذریعہ شاعری کو ہی بنایا ہے۔ یہ طریقہ سب سے پہلے شیخ عبدالقادر نے

اختیار تھا انہوں نے بانگِ درا کے حوالے سے اقبال کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے اور اسے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے لیکن یہ تقسیم بعد میں اس لیے قابل قبول نہیں رہی کہ ان کے پیش نظر اقبال کا وہ کلام تھا جو بانگ درا میں شامل ہے۔ بہرحال اقبال کے شاعرانہ دور کو مختلف ناقدین نے تین اور چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

ا۔ پہلا دور: 1905ء یعنی اقبال کے بغرض تعلیم یورپ جانے تک کی شاعری (قومی شاعری کا دور)

۲۔ دوسرا دور 1908-1905ء یعنی اقبال کے قیام یورپ کے زمانہ کی شاعری (خودی و بے خودی کا فلسفہ)

۳۔ تیسرا دور 1924-1908ء یعنی یورپ سے واپس آنے کے بعد کی شاعری (اسلامی شاعری کا دور)

۴۔ 1938-1924ء بانگِ درا کی اشاعت سے اقبال کی وفات تک کی شاعری (ملی و اسلامی شاعری اور تصورات)

## 2.4 قومی و وطنی شاعری کا ارتقا اور دور اول

اقبال نے جب گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑنے کہا تو ان کا مقصد ماضی پرستی نہیں تھا۔ بلکہ وہ آزادی کے دن تھے جسے ہندوستانی قوم تاریخ کے المیہ کے نتیجہ میں کھو چکی تھی اور 1857ء میں غدر کے نام سے ظاہر ہوا تھا۔ اس طرح نظم ہمالہ سے اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں سیاسی افکار و نظریات کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا اور سیاست سے ان کی یہ دلچسپی زمانہ آخرت تک برقرار ی تھی کیونکہ وہ حالات اقبال کی موت تک باقی تھے۔ جن کے مجبور کرنے پر اقبال نے سیاست کے بارے میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ملک تو ان کے انتقال کے تقریباً دس گیارہ سال بعد آزاد ہوا۔ وقت کی یہ عجیب ستم ظریفی رہی کہ وہ بلبل خوش نوا جس نے ملک کی آزادی کے ترانے الاپے لیکن ملک کی آزادی کے خوش گوار واقعہ کے ظہور پذیر ہوتے وقت ہم میں موجود نہیں تھا۔

اقبال نے ہمالیہ کے بعد کئی ایک نظمیں لکھیں۔ چنانچہ بانگ درا کی نظموں میں ''پرندے کی فریاد''، ''صدائے درد''، ''سید کی لوح تربت''، ''ترانۂ ہندی''، ''جگنو''، ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، ''نیا شوالہ''، ''سوامی رام تیرتھ''، ''طلباء علی گڑھ کالج کے نام''، ''ترانہ ملی''، ''وطنیت''، ''رام''، ''نانک''، ''پیوستہ رہ شجر سے''، ''امید بہار رکھ''، ''اسیری''، ''خضر راہ''، ''شمع و شاعر'' اور ''طلوعِ اسلام'' ایسی اہم نظمیں ہیں جن کا مطالعہ اقبال کے اس ذہنی سفر کی نشاندہی کرتا ہے جو اقبال نے ابتدائی زمانہ میں کیا تھا۔ اقبال اپنے اسی دور میں جب کہ وہ ابھی لندن نہیں گئے تھے۔ ہندوستان کی قومی تحریک سے متاثر تھے اور وطنیت کے جذبوں سے سرشار تھے لیکن جب انہیں مغربی ممالک کے دورہ کرنے اور مغربی سامراج کی پالیسیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ان کے سیاسی عقائد میں تیزی سے تبدیلی آنی شروع ہوئی، بعد میں انہوں نے قومیت اور وطنیت کے نظریوں کی بیانگ دہل مخالفت کرنی شروع کر دی۔ میری اس بات کی تائید ان کی نظموں ''ترانہ ہندی''، ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' یا ''رام''، ''نانک'' اور ''سوامی رام تیرتھ'' جیسی قوم پرستانہ نظموں سے ہوسکتی ہے۔ ''نیا شوالا'' تو انقلابی نظم تھی جس نے قوم کے ایک

بڑے طبقہ کو بہت متاثر کیا لیکن اقبال نے لندن سے واپسی کے بعد خاص وطن پرستی کے جذبہ پر ضرب کاری لگائی ہے اور اقبال کی یہ ذہنی تبدیلی کچھ یوں ہی نہیں تھی، یا یہ کسی تعصب کا نتیجہ بھی نہیں تھی، اور یہ سمجھنا کہ اقبال نے ترانہ ملی لکھ کر ترانہ ہندی کی تردید کی ہے سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی کا نتیجہ ہے۔ اصل میں ترانہ ملی اقبال کی پہلی نظم ترانہ ہندی کا تسلسل ہی ہے۔ یہ اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں یہاں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اقبال کا جو زمینی سفر ہے یا یہ فکر اقبال کا تسلسل ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں میں خلیفہ عبدالحکیم کی مدد سے اپنی بات واضح کروں گا۔

''جب وہ (اقبال) یہ کہتا ہے کہ انسان کو وطنیت سے پاک ہونا چاہیے اور اس کی گرد کو دامن سے جھٹک دینا چاہیے تو اس سے اس کی مراد فقط غلط وطنیت کا جذبہ ہے۔ جس نے مغربی اقوام کو اندھا کر دیا وہ اس غلط وطنیت سے بچا کر اپنے ہموطنوں کو وطنیت کے اس جذبہ کی طرف لانا چاہتا تھا۔ جو کسی خاص زمین کے ٹکڑے کی پرستش پر مبنی نہ ہو بلکہ عروج انسان اور اس کی روحانی ترقی کے ماتحت ہو، ہندوستان کے دوسرے مشہور عالم شاعر ٹیگور کا نقطہ نظر بھی اقبال سے کچھ الگ نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ٹیگور میں جذبۂ وطنیت کی کمی ہے لیکن مغربی رنگ کی وطن پرستی کے خلاف ٹیگور نے اپنی آواز بلند کی۔ اقبال نے اپنے اس نقطۂ نظر کو وطنیت میں یوں ظاہر کیا ہے:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے
پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کفن ہے

اقبال کے خیال میں وطن جب ایک خدا کی صورت اختیار کر لیتا تو

ع اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے

علاوہ ازیں اقوام جہاں مختلف گرہوں میں بٹ جاتے ہیں، وہیں سیاست کا گھر صداقت سے خالی ہو جاتا ہے اور کمزور کا گھر غارت ہوتا ہے۔ یہ تو عمومی حیثیت سے ہوا۔ خصوصی طور پر مسلمانوں کیلئے بھی وطنیت کا یہ جذبہ گھاٹے کا سودا تھا کیونکہ بقول اقبال تہذیب نوی کا تراشیدہ یہ بت عمارت گر کاشانۂ نبوی تھا اس کی وجہ سے توحید کے قوی بازو کٹ جاتے تھے اور سنت رسول کے یہ مغائر بھی تھا۔ اسلئے انہوں نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا:

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال نے وطنیت کے جذبہ سے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں ہندوؤں کو بھی مخاطب کیا، کیونکہ مغرب میں جس قسم کا تصور پایا جاتا ہے، وہ مساوات اور آزادی جیسے اعلا اقدار کے خلاف ایک محاذ نظر آتا ہے، اس کے نتیجہ میں نسل پرستی

اور محدود وطنیت کے تصورات کو مدد ملتی ہے۔ اقبال اصل میں آزادی، اخوت اور مساوات انسانی میں یقین رکھتے تھے۔ ان کا نظریہ ان معنوں میں عالمی آفاقی اور ہمہ گیر تھا۔ گلستان کے کئی بچوں کو کھلتا مہکتا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ جیو اور جینے دو کے اصول کے قائل تھے۔ چنانچہ ان کے خیالات کی جھلک ہی ان کی ابتدائی نظموں مثلاً جگنو اور پرندے کی فریاد جیسی نظموں میں نظر آتی ہے۔ پرندے کی فریاد میں جو تڑپ، بے چینی اور اضطراری کیفیت جو پرندہ کے اندر ہے، وہ غلامی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اقبال چاہتے تھے کہ ہندوستانی قوم میں بھی یہ آج بے چینی اور اضطراری کیفیت پیدا ہو۔ اور جب پرندہ اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہے ؎

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

تو یہ آرزو کسی پرندے کی نہیں خود ہندوستانی قوم کی ہے، اقبال کی ہے۔ یہاں اقبال کا لہجہ بہت ہی بجھا بجھا سا ہے۔ یہاں وہ آزادی کی آرزو کرتے نظر آتے ہیں لیکن زمانہ گزرتا گیا، اور جوں جوں انگریزی سامراج کا علم بڑھتا گیا۔ آزادی کی آرزو آتش بداماں ہوتی گئی اور اقبال کا یہی نرم لہجہ انقلابی احتجاج کی صورت اختیار کر لیتا ہے ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے درودیوار ہلا دو

اور جب یہ آداب جنوں شاعر مشرق سیکھ لیتا ہے تو ہندوستان کی تحریک آزادی بھی ایک نیا موڑ اختیار کر لیتی ہے۔

اقبال کے سیاسی افکار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے صرف وطنیت کے تصور ہی کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس دور کے جو مغربی و مشرقی سیاسی نظریے تھے ان کی بھی نفی کی ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے ایک دانشور کی حیثیت سے انہوں نے اقوام عالم کے مختلف نظریوں کی مغربی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی نظمیں نپولین، مسولینی، کارل مارکس اور لینن اس بات کا ثبوت ہیں۔ اقبال کا مطالعہ وسیع تھا، اور اس سے وسیع ان کا مشاہدہ تھا، اور خوبی یہ کہ اقبال کی نظر اسلام پر تھی، جو کائنات کا سب سے بڑا انقلابی نظریہ ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اقبال کی فکر کہیں بھٹکنے نہیں پاتی وہ ہر شئے کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ اس کی آب و تاب سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور ان کی عقابی نظر جلد ہی اس چمکدار شے کی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی دیکھ لیتی ہے۔ وہ واپس ہوتے ہیں اور انھیں پناہ ملتی ہے تو صرف اسلام کی پناہ گاہ میں۔ اس لئے اقبال نے اسلام کو اس کی حقیقی صورت میں قبول کیا ہے۔ قدم قدم پر وہ اس سے رہبری حاصل کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے اس دور کے مسلمان خود بھی اسلام سے دور تھے اور صرف رسوم کو اسلام سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی یہ کج فہمی اقبال کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ خصوصاً منبر و محراب کے اجارہ داری اور کوتاہ اندیش علما کے تعلق سے اقبال نے کھری کھری باتیں سنائی ہیں چنانچہ وہ مسلمانوں پر چوٹ کرتے ہیں ؎

حق را بسجود سے صنماں رابطوافے  بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

اورایک جگہ ارشاد ہوتا ہے ۔

ر ہ ر سم حرم نا محرمانہ　　کلیسائی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیر ہن چاک　　نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

مذہبی ٹھیکیداروں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ۔

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہد قدیم　　اہل سجادہ میں اٹلی سیاست میں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ بری کا زور　　سیکڑوں صدیوں سے خوگر میں غلامی کے عوام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی　　پختہ ہو جاتے ہیں خوئے غلامی میں غلام

اقبال نے وطنیت کے علاوہ جن بتوں کو توڑا ہے ان میں جمہوریت سرمایہ داری، کمیونزم اور لادین سیاست جیسے بت بھی شامل ہیں۔ جو اس دور کا مقدر بن گئے تھے۔ جمہوریت دور جدید کا مقدر بن سکتی ہے لیکن انسانی تقدیر کا یہ عجیب المیہ ہے کہ وہ تباہی سے پوچھنے کیلئے دوسری تباہی کو مول لیتا۔ یہ شاہی کی جگہ جمہوریت نے لے لی جمہوریت کیا ہے؟ اقبال کی زبانی سنئے ۔

جمہوریت ایک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اقبال نے جمہوریت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور وہ گزر گئے، جمہوریت کے تجربے سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے وجود میں آئے کئی دہائیوں کا عرصہ بیت گیا۔ اس لمبے زمانے میں ہندو پاک کی سیاسی تبدیلیاں ہمارے سامنے ہیں۔ برصغیر سے ہٹ کر امریکہ، روس اور خصوصیت سے عرب و افریقہ کے اسلامی ممالک میں جہاں جمہوریت کا نظام رائج ہے وہی تباہی بچھی ہوئی ہے جو کبھی شاہوں کے دور میں ہوا کرتی تھی۔ سرمایہ دار ممالک میں انسانی ناز برداری کے واقعات روزمرہ کی چیز ہیں۔ انسانیت جمہوریت کے ان بلند و بالا ایوانوں کے زیر سایہ بلک رہی ہے۔ اس لئے اقبال نے اس سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی۔ اس سلسلے کی نظم خضر راہ کا ایک حصہ سرمایہ و محنت ہماری خصوصی توجہ چاہتا ہے ۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے　　خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر　　شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی　　اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش　　اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ　　خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاوں کیلئے　　سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

مزدوروں کوانکی تباہی کا احساس دلانے کے بعد اقبال پھر مخاطب ہوتے ہیں:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

گویا اقبال نے مزدورں کو، دعوت انقلاب دی اور مزدوروں کے انقلاب سے عبارت بھی تھا۔فرانس میں جو تحریک روسو کی وجہ سے پندرہویں صدی میں شروع ہو چکی تھی زار کے زوال کے بعد اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکی تھی۔روس میں مزدور انقلاب کی کامیابی نے افعالیت کو ایک نیا سہارا دیا تھا، اور طلوع اسلام کے بعد عالمی تاریخ کا یہ سب سے بڑا انقلاب تھا۔ جسے اقبال نے بھی قبول کیا اور لینن کو خدا کے حضور میں پیش کر دیا۔ یہ اقبال کی آزادی سے محبت اور مغربی سامراجیت سے دشمنی کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے مغرب کے خلاف ہر آواز کو لبیک کہا۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت اقبال نے نپولین اور مسولینی کی تعریف کی تھی۔ یہاں اس توصیف سے اقبال کی مراد بربریت کو ہوا دنیا نہیں بلکہ سامراجیت اور سرمایہ داری کو شکست فاش دینا تھا۔اصل میں یہ انتقامی جذبہ تھا۔جس نے اقبال کو مسولینی اور نپولین کی تائید کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ مسولینی کی زبان میں سرمایہ داروں سے سوال کرتے ہیں۔

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج!

اقبال کا انداز فکر ان کے سیاسی افکار کی بنیاد نہیں ہے۔ وہ جلد ہی مزدور کے انداز حیلہ بازی کو تاڑ جاتے ہیں اور مزدوروں کی آڑ میں جو نئی جہت انجور ہی تھی اس پر بھی وہ کاری ضرب لگاتے ہیں۔ چنانچہ کارل مارکس کی آواز کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

یہ علم وحکمت کی مہرہ بازی یہ بحث وتکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش مریز و کج د ار کی نمائش
جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہیں عقل عیار کی نمائش

اور وہ پھر مایوس ہو کر اس انقلاب کے بارے میں فرماتے ہیں۔

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز وسازِ حیات
خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت

یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال دنیا کے افکار سے مایوس ہو کر رجوع بہ درگاہ خداوندی ہوتے ہیں، اور صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں پورے اقوام عالم کی نجات کا ذریعہ انہیں صرف قرآن نظر آتا ہے۔ چونکہ مسلمان اس کتاب کے دعویدار ہیں، اس لئے اقبال کے پہلے مخاطب وہی ہیں۔ یہاں وہ شخصی تنگ نظری کی وجہ سے مسلمانوں سے مخاطب نہیں ہیں۔ اقبال کے خیال میں مسلمانوں کی اصلاح اقوام عالم کی اصلاح کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے وہ اشتراکیت کی بھی کھل کر مخالفت نہیں کرتے ان کے اس خیال کی وضاحت سیاسیات مشرق ومغرب کے چند شعروں سے ہوسکتی ہے۔ نظم اشتراکیت کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پر مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہو ا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

## 2.5 اسلامی کلام اور اقبال کی فکر

عام طور سے مذاہب تجربات حیات اور مظاہر فطرت سے استدلال نہیں کیا کرتے لیکن اسلام نے انفرادی، اجتماعی نفسی طبعی اور تاریخی ہر قسم کے حقائق پر فکر وتدبر کی دعوت دی ہے اور ان کو اپنے دعووں کی شہادت میں پیش کیا ہے یہ حقیقت ہے کہ دوسرے مذہبوں کے مقابلے میں اسلام اندرونی طور پر زیادہ اہمیت کی حامل ہے اس لئے علمائے اسلام ہر زمانے میں اسلام کی اس خصوصیت کو واضح کرتے رہے ہیں اور انہوں نے اس کی توثیق کے لیے متواتر تشریحیں کی ہیں۔

جدید مغربی انداز نظر نے سوچ بچار کی نئی راہیں نکالیں، نئے تجربوں نے نئے افق روشن کیے، مذہب کی پرانی توجیہیں ناکارہ ہونے لگیں۔ فرسودہ فلسفیانہ بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں اور قدیم مشاہدے مشتبہ سمجھے جانے لگے ماضی کے تجربات آج کے اوہام بن گیے۔ چنانچہ نئے رجحانات اور مذہب کے پرانے میلانات میں دوری پیدا ہونے لگی اور عقل وعقیدہ میں خلا پیدا ہوگیا۔ تاہم اس کے مابعد اثرات سے انکار نہیں لیکن اس عہد میں سرسید کے بعد اقبال نے نئے عقلی اور عالمی معیاروں کو سامنے رکھ کر اسلام اور اس کے روایتی کلام پر از سر نو غور کیا اور اس خیال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اقبال کی یہی فکری کوشش ان کا نیا کلام ہے۔ یہ کلام عصری عقل سے ہم آہنگ اور اسلام کے قریب قریب تمام اعتقادی وعملی پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اقبال کی یہ سچی فکر بجائے خود فلسفہ ہے لیکن اسلامی عقائد و اعمال کے حوالے سے اس کو کلام کہنا بھی غلط نہیں ہے۔

## 2.6 اقبال کے کلام یا فلسفے کی نوعیت کا دور ارتقا (خودی و بے خودی، اسلامی نظریہ)

اقبال کی فکر میں اسلام کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرح اسلامی عقائد واعمال کا حقیقی سر چشمہ نفسیاتی یا روحانی مشاہدات ہیں۔ مذاہب کے روحانی مشاہدات طبعی تجربات سے متضاد ومتناقص بھی ہوں مگر

ہم آہنگ نہیں ہوتے۔جنسی مشاہدات اور طبیعی تجربات کی طرح روحانی مشاہدات کو جب تک مستقل اور قابل اعتماد ذریعہ علم نہ ثابت کر دیا جائے مذہبی عقائد کی واقعیت اور اس کے اعمال کے استحقاق برابر مشتبہ رہے گی۔ اقبال کا فکری کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے روحانی مشاہدات کی واقعیت ثابت کرنے کی کوشش کی اور معاصر فکر و نظر سے ان کا قابل اعتماد اور مستقل ذریعہ علم ہونا واضح کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی فکریات کی تشکیل میں صوفیا کے عرفانی واردات، اوصاف اور بقا سے تعلق رکھنے والے احوال و مقامات کو بڑا دخل ہے۔ان کے یہ روحانی تجربے حقیقت میں جاذب ہو کر بلکہ اقبال کے زاویۂ نظر سے خود حقیقت کو جذب کر کے حقیقت کے کل اور سیاسی صورت میں راست مشاہدے ہیں۔ان مشاہدوں میں موضوع یا مشاہدہ کرنے والا اور معروض یا اصل حقیقت مدام اور جاذب ہو کر ایک وحدت بن جاتے ہیں بلکہ یہ حقیقت کا راست مشاہدہ ہے اس لیے زیادہ وقیع اور کہیں زیادہ حقیقی اور واقعی ہے۔حسی تجربات تو حقیقت کا باہر سے گزرتے زمانے اور زمان و مکان میں منجمد ٹکڑوں میں مشاہدہ ہے جو غیر حقیقی اور مغالطہ آمیز ہے۔

اقبال کی فکر میں صوفیانہ واردات کے علاوہ بیسویں صدی کی عام فلسفیانہ تحریک کا بھی بڑا حصہ ہے۔یہ ایک طرح کی روحانی تصوریت تھی۔ اس جدید روحانی تصوریت کا جرمنی میں انیسویں صدی میں آغاز ہوا۔ اس کو فلسفۂ رومانیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کی معروضی تصوریت ہے۔اس تحریک کی ابتدا کانٹ کے اس خیال سے ہوئی کہ روح خود فاعل اور مبدا ہے۔اس خیال کو اس طرح مزید آگے بڑھا دینا تخیل کے لیے غیر فطری نہ تھا کہ روح کی فعالی اور طبع زادگی غیر محدود غیر مشروط اور مطلق ہے۔ شلنگ، ہیگل وغیرہ نے اس خیال کو نقطۂ آغاز بنا کر بالکل نئے فلسفیانہ نظاموں کی عمارتیں کھڑی کر دیں۔ان فلسفوں میں حقیقت کو باہم اور اطلاقی وحدت میں بدل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مذہبیات، جمالیات، شاعری اور فلسفے کے روایتی تضاد کو دور کر کے مبہم وحدت میں جذب کر دیا گیا ہے۔ یہ اقبال کی فکر کو اس سلسلے کی مستقل اور ممتاز راہ سمجھنا چاہیے۔اقبال حقیقت کو روحانی مانتے ہیں مگر ان کی فکر اور عمل حالت میں یہ بنیادی فرق ہے کہ وہ حقیقت کو غیر مادی تسلیم کرتے ہوئے اس کو اہم نہیں بلکہ مستقل منفرد اور شخصی سمجھتے ہیں اور اپنے استاد میر حسن کے ان خیال سے متفق ہیں کہ حقیقت کی دنیا افراد کی دنیا ہے کہ اقبال کی فکر کا آغاز ایسی شخصیت اور خودی سے ہوتا ہے جو اپنے آپ میں ترقی کے لامحدود امکانات رکھتی ہے، ان کے اخلاقی تصورات کی بنیاد شخصیت کو ترقی دینے کی جدوجہد پر ہے۔

اقبال ذات الٰہی کو خودی یا شخصیت کا اعلا و اکمل مرتبہ قرار دیتے ہیں۔اس کے بعد ہی انسانی خودی کا مرتبہ ہے جو ترقی پذیر ہے اور جدوجہد اور شخصیت کے زور سے دوسری شخصیتوں کو اپنے آپ میں جذب کر سکتی ہے۔اس کے احاطۂ جذب میں مخلوق ہی نہیں خالق بھی شامل ہے۔ ہمت مردانہ محض شاعری نہیں فلسفیانہ عقیدہ ہے شخصیت میں ایسا جذب پیدا کرنے کے لیے اس کی تقویت ضروری ہے جس کے لیے باشعور کوشش درکار ہے۔اقبال کے اس صوفیانہ

فلسفے کی ممتاز خصوصیت اس میں جدوجہد اور فعالی کی پیوندکاری اور اس سے بےعملی اور خودفراموشی کا اخراج ہے۔

اقبال کے متصوفانہ فلسفے میں معروضی تصوریت کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے طبیعیات وحیاتیات کے بدلتے ہوئے حجانات اور کائنات کے متعلق اضافیت کے تصورات پھر کائنات میں حساسیت کے عمومی شمول کو جو دخل ہے اسے بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اقبال کا فلسفہ بیسویں صدی کے لگ بھگ ربع اول کی تشکیل ہے۔

## 2.7 تیسرا اور آخری دور

کئی اعتبار سے یہ گزشتہ ادوار کی تکمیل کرتا ہے مثلاً پہلے دور میں وہ یورپی تہذیب سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جبکہ اس دور میں وہ اس کے خلاف نعرۂ بغاوت بلند کرتے ہیں اور اس کے کھوکھلے پن کو واشگاف کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کے مندرجہ بالا تفصیلی جائزہ سے یہ بات پوری عیاں ہوجاتی ہے کہ وہ فکری ارتقائی مختلف منازل سے ضرور گزرے ہیں لیکن فکری اور نظریاتی تضاد کا شکار بھی نہیں ہوئے۔ ابتدائی دور میں وہ وطن پرست تھے تو آخری وقت تک محبّ وطن رہے ہیں لیکن وطن کی حیثیت انہوں نے تسلیم کرنے سے انکار کردیا جو انسان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے آپس میں برسرپیکار رہتی ہیں۔ کچھ عرصے بعد انہیں یہ شعور حاصل ہوا کہ وہ ایسی ملت کے فرد میں جو جغرافیائی حدود میں سمونا نہیں جانتی اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنے ہم وطن دیگر مذاہب کے پیروں کے لیے نفرت کا اظہار کیا ہو۔ بلکہ صرف یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے تشخص اس ملت کے حوالے سے کیا جس کا وہ حصہ تھے یہ ان کی فکری ارتقا کے مختلف مراحل کے نشانات میں اور وہ بہت جلد وطن اور ملت کے متعلق ایک واضح نقطہ نظر کو اپنا چکے تھے۔ اس کے بعد وہ آخر وقت تک اسی نقطہ نظر کی وضاحت اور تبلیغ میں مصروف رہے اور کسی مقام پر کوئی الجھاؤ محسوس نہیں کیا۔

## 2.8 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے۔۔۔

علامہ اقبال کی وطنی شاعری کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

علامہ اقبال کی شاعری کے دور دوم کے بارے میں آگاہی ہوئی۔

اقبال کے تاریخی پس منظر سے روشناس ہوئے۔

علامہ اقبال کی قومی شاعری سے واقفیت حاصل ہوئی۔

اسلامی فکر اور قومیت کا نظریہ واضح ہوا۔

اقبال کی ملی اور قومی شاعری سے محظوظ ہوسکے۔

## 2.9 اپنا امتحان خود لیں

1۔ علامہ اقبال اور قومی شاعری پر نوٹ لکھیے؟

2۔اسلامی فکر اور اقبال کی شاعری پر اپنے نے خیالات قلم بند کیجیے؟

## 2.10 سوالات کے جوابات

جواب 1: اقبال جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ زمانہ دو مختلف انقلابات سے دوچار تھا۔خود ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔سرسید احمد خان اور راجہ رام موہن رائے نے جو تعلیمی تحریک وسط انیسویں صدی میں شروع کی تھی وہ اب سیاسی میدان میں اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہو چکی تھی۔کانگریس نے دبے دبے لہجے میں سوراج کا نرو با نعرہ بلند کر دیا تھا، اور اقبال نے جس زمانہ میں شعر کہنا شروع کیا وہ دور تو ہندوستانی قومیت اور تحریک آزادی کا نقطہء عروج تھا۔اسی زمانہ میں یعنی بیسویں صدی کے پہلے سال ہی اقبال نے لاہور سے اپنی آواز بلند کی اور یہ آواز ہمالیہ کے زیر عنوان بلند ہوئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہندوستانیوں کی دل کی آواز بن گئی۔اس نظم کو ہماری قومی زندگی میں وہی مقام حاصل ہوا جو وکوہ ہمالیہ کو حاصل تھا یعنی اقبال کے ابتدائی زمانہ کی نظم ہندوستانی قوم کی ترجمان بھی ہے اور نگہبان بن گئی ہے۔

اے ہمالہ داستان اس وقت کی کوئی سنا　　مسکن آبائے انساں جب بناد امن تیرا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا　　داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اقبال نے جب گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑنے کہا تو ان کا مقصد ماضی پرستی نہیں تھا۔بلکہ وہ آزادی کے دن تھے جسے ہندوستانی قوم تاریخ کے المیہ کے نتیجہ میں کھو چکی تھی اور 1857ء میں غدر کے نام سے ظاہر ہوا تھا۔اس طرح نظم ہمالیہ سے اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں سیاسی افکار و نظریات کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا اور سیاست سے ان کی یہ دلچسپی زمانہ آخرت تک برقراری تھی کیونکہ وہ حالات اقبال کی موت تک باقی تھے۔جن کے مجبور کرنے پر اقبال نے سیاست کے بارے میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنا ضروری سمجھا تھا۔ملک تو ان کے انتقال کے تقریبا دس گیارہ سال بعد آزاد ہوا۔وقت کی یہ عجیب ستم ظریفی رہی کہ وہ بلبل خوش نوا جس نے ملک کی آزادی کے ترانے الاپے لیکن ملک کی آزادی کے خوش گوار واقعہ کے ظہور پذیر ہوتے وقت ہم میں موجود نہیں تھا۔

اقبال نے ہمالیہ کے بعد کئی ایک نظمیں لکھیں۔چنانچہ بانگ درا کی نظموں میں پرندے کی فریاد، صدائے درد، سید کی لوح تربت، ترانہ ہندی، جگنو، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، سوامی رام تیرتھ، طلباء علی گڑھ کالج کے نام، ترانہ ملی، وطنیت، رام، نانک، پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ، اسیری، خضر راہ، شمع و شاعر اور طلوع اسلام ایسی اہم نظمیں ہیں جن کا مطالعہ اقبال کے اس ذہنی سفر کی نشاندہی کرتا ہے جو اقبال نے ابتدائی زمانہ میں کیا تھا۔اقبال

اپنے اسی دور میں جب کہ وہ ابھی لندن نہیں گئے تھے۔ ہندوستان کی قومی تحریک سے متاثر تھے اور وطنیت کے جذبوں سے سرشار تھے لیکن جب انہیں مغربی ممالک کے دورہ کرنے اور مغربی سامراج کی پالیسیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ان کے سیاسی عقائد میں تیزی سے تبدیلی آنی شروع ہوئی، بعد میں انہوں نے قومیت اور وطنیت کے نظریوں کی بیا نگ دہل مخالفت کرنی شروع کر دی۔ میری اس بات کی تائید ان کی نظموں ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا گیت یا رام، نانک اور سوامی رام تیرتھ جیسی قوم پرستانہ نظموں سے ہوسکتی ہے۔ نیا شوالا تو انقلابی نظم تھی جس نے قوم کے ایک بڑے طبقہ کو بہت متاثر کیا لیکن اقبال نے لندن سے واپسی کے بعد خاص وطن پرستی کے جذبہ پر ضرب کاری لگائی ہے اور اقبال کی یہ ذہنی تبدیلی کچھ یوں ہی نہیں تھی، یا یہ کسی تعصب کا نتیجہ بھی نہیں تھی، اور یہ سمجھنا کہ اقبال نے ترانہ ملی لکھ کر ترانہ ہندی کی تردید کی ہے سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی کا نتیجہ ہے۔ اصل میں ترانہ ملی اقبال کی پہلی نظم ترانہ ہندی کا تسلسل ہی ہے۔ یہ اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں یہاں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اقبال کا جو زمینی سفر ہے یا یہ فکر اقبال کا تسلسل ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں میں خلیفہ عبدالحکیم کی مدد سے اپنی بات واضح کروں گا۔

''جب وہ (اقبال) یہ کہتا ہے کہ انسان کو وطنیت سے پاک ہونا چاہیے اور اس کی گرد کو دامن سے جھٹک دینا چاہیے تو اس سے اس کی مراد فقط غلط وطنیت کا جذبہ ہے۔ جس نے مغربی اقوام کو اندھا کر دیا وہ اس غلط وطنیت سے بچا کر اپنے ہموطنوں کو وطنیت کے اس جذبہ کی طرف لانا چاہتا تھا۔ جو کسی خاص زمین کے ٹکڑے کی پرستش پر مبنی نہ ہو بلکہ عروج انسان اور اس کی روحانی ترقی کے ماتحت ہو، ہندوستان کے دوسرے مشہور عالم شاعر ٹیگور کا نقطہ نظر بھی اقبال سے کچھ الگ نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ٹیگور میں جذبہ وطنیت کی کمی ہے لیکن مغربی رنگ کی وطن پرستی کے خلاف ٹیگور نے اپنی آواز بلند کی۔ اقبال نے اپنے اس نقطہ نظر کو وطنیت میں یوں ظاہر کیا ہے:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے
پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کفن ہے

اقبال کے خیال میں وطن جب ایک خدا کی صورت اختیار کر لیتا ہے ع

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے

جواب 2: عام طور سے مذاہب تجربات حیات اور مظاہر فطرت سے استدلال نہیں کیا کرتے لیکن اسلام نے انفرادی، اجتماعی نفسی طبعی اور تاریخی ہر قسم کے حقائق پر فکر و تدبر کی دعوت دی ہے اور ان کو اپنے دعووں کی شہادت میں پیش کیا ہے یہ حقیقت ہے کہ دوسرے مذہبوں کے مقابلے میں اسلام اندرونی طور پر زیادہ اہمیت کی حامل ہے

اس لئے علمائے اسلام ہر زمانے میں اسلام کی اس خصوصیت کو واضح کرتے رہے ہیں اور انہوں نے اس کی توثیق کے لیے متواتر تشریحیں کی ہیں۔

جدید مغربی انداز نظر نے سوچ بچار کی نئی راہیں نکالیں، نئے تجربوں نے نئے افق روشن کیے، مذہب کی پرانی توجیہیں ناکارہ ہونے لگیں۔فرسودہ فلسفیانہ بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں اور قدیم مشاہدے مشتبہ سمجھے جانے لگے ماضی کے تجربات آج کے اوہام بن گیے۔ چنانچہ نئے رجحانات اور مذہب کے پرانے میلانات میں دوری پیدا ہونے لگی اور عقل وعقیدہ میں خلا پیدا ہوگیا۔تاہم اس کے مابعد اثرات سے انکار نہیں لیکن اس عہد میں سرسید کے بعد اقبال نے نئے عقلی اور عالمی معیاروں کو سامنے رکھ کر اسلام اور اس کے روایتی کلام پر ازسرِنو غور کیا اور اس خیال کو سمجھنے کی کوشش کی۔اقبال کی یہی فکری کوشش ان کا نیا کلام ہے۔ یہ کلام عصری عقل سے ہم آہنگ اور اسلام کے قریب قریب تمام اعتقادی وعملی پہلوؤں پر حاوی ہے۔اقبال کی یہ سچی فکر بجائے خود فلسفہ ہے لیکن اسلامی عقائد و اعمال کے حوالے سے اس کو کلام کہنا بھی غلط نہیں ہے۔

## 2.11 فرہنگ

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| افق | وہ خط جو زمین کو آسمان سے الگ کرتا ہے |
| توجیہ | سبب،علت،دلیل |
| توثیق | یقین دلانا |
| مشتبہ | جس کی صحت میں شک ہو |
| معاصر | ایک ہی زمانے کا |

## 12.12 کتب برائے مطالعہ

1۔علامہ اقبال تقریر میں تحریریں اور بیانات،اقبال احمد صدیقی

2۔ میزان اقبال، پروفیسر محمود منور

3۔اسلوبیات اقبال ،طارق سعید

4۔اقبال کی شاعری کے ادوار،Urdunotes.com

5۔اقبال کا ذہنی اور فنی ارتقا،ڈاکٹر عبدالمغنی

# اکائی :3 اقبال کے فکری اور تخلیقی سرچشمے

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 اقبال کے فکری اور تخلیقی سرچشمے

3.4 آپ نے کیا سیکھا

3.5 اپنا امتحان خود لیجیے

3.6 سوالات کے جوابات

3.7 فرہنگ

3.8 کتب برائے مطالعہ

## 3.1 اغراض ومقاصد

۱۔علامہ اقبال کے ارتقائی سفر سے آگاہی حاصل کرنا۔

۲۔سرمحمد علامہ اقبال کے مغربی مفکرین اوران کے نظریات سے ہم آہنگی کی پیمائش۔

۳۔اقبال کے فکری اور تخلیقی سرچشموں سے معلوم کرنا

۴۔اقبال اور مشرقی مفکرین سے متعلق معلومات فراہم کرنا۔

## 3.2 تمہید

علامہ اقبال ایک بڑے مفکر، مدبر، فلسفی، حکیم الامت، ترجمانِ حقیقت، دانائے راز اور نباضِ عصر شاعر تھے۔ان کی شخصیت ہشت پہل تھی۔انہوں نے مشرقی اور مغربی دونوں مفکرین سے استفادہ کیا۔ جہاں انہوں نے مغرب سے اصول، عقل اور جدیدیت کا علم حاصل کیا وہیں مشرق سے عشق، روحانیت اور اسلامی افکار کو قبول کیا۔یہی اقبال کے فکری سرچشمے بنے جس نے اقبال کی شاعری کو عالم میں پھیلا دیا۔

## 3.3 اقبال کے فکری اور تخلیقی سرچشمے

فلسفہ مغرب کے تعلق سے کلام اقبال کا ذکر کرتے ہوئے اس قدر افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے کہ حقیقت اسی افراط وتفریط میں گم ہو کے رہ گئی ہے۔اہل قلم کی ایک جماعت نے مذہبی جوش میں یہ ثابت کرنے کے

لیے پورا زور لگا دیا ہے کہ علامہ اقبال نے قدم قدم پر مختلف مغربی فلسفیانہ نظریات کی تردید اور تقلید کی ہے۔ دوسری جماعت ان حضرات پر مشتمل ہے جن کے نزدیک علامہ اقبال کے افکار مغربی مفکرین کے افکار کا پرتو ہیں۔ یہ حضرات اس ضمن میں نطشے اور برگساں کا ذکر خاص طور سے کرتے ہیں۔

ان دونوں طرح کے خیالات کے لئے لوگ کلام اقبال پر بار بار بات چیت کرتے وقت غالبًا اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ادب العالیہ یا اعلا شاعری کسی فلسفیانہ نظریے کی تائید یا تردید کا نام نہیں ہے۔ ایک بڑا وسیع المطالعہ شاعر دوسروں کے نظریات کو پسند بھی کر سکتا ہے نا پسند بھی۔ وہ دوسرے بڑے شعراء اور فلسفیوں کے افکار سے اثر پذیر ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ ان کے افکار کی تائید بھی کر سکتا ہے اور تردید بھی۔ بڑا فنکار کٹھ ملا نہیں ہوتا کہ زندگی کے راستے میں ایک چٹان بن کے پڑا رہے بلکہ اُس میں دوسروں کے افکار کو پرکھنے کی، انھیں قبول یا رد کرنے کی اور اپنے افکار پر غور و خوض کرنے کی بڑی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اُس کی ماحول پر بڑی گہری نظر ہوتی ہے۔ اسی ماحول سے وہ متاثر بھی ہوتا ہے اور اسے متاثر بھی کرتا ہے۔ وہ دنیا کے چھوٹے بڑے واقعات کو آفاقی کینوس کے پس منظر میں دیکھتا ہے۔ کائنات اور کتاب کا مطالعہ ہر لمحہ اُس کے فکر و نظر پر نئی نئی راہیں کھولتا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر وہ ہر وقت اپنے نظریات اپنے خلوص کی کسوٹی پر پرکھتا رہتا ہے۔

اقبال ایک ایسے ہی بڑے فن کار ہیں جن کو کسی محدود اور تنگ نظریے کی چار دیواری میں مقید کرنا اقبال کے ساتھ ہی نہیں ہندوستان بلکہ سارے مشرق کے ادب کے ساتھ بے انصافی کرنے کے مترادف ہے۔

علوم مغرب سے متعلق علامہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے نہایت عمدہ بات کہی ہے۔ ''مقالات یوم اقبال'' کے دیباچے میں آپ لکھتے ہیں:

''اقبال نے یورپی تہذیب کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی اور اسلام کو جدید یورپی خیالات کی روشنی میں پیش کیا۔''

ڈاکٹر تاثیر کے یہ چند الفاظ اقبال کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ایک چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور دراصل جو کچھ تاثیر مرحوم نے کہا ہے وہ خود علامہ کے اپنے افکار ہی کا پرتو رہے۔ اقبال اپنی کتاب ''تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''تاریخ جدید کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آج دنیائے اسلام بڑی تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف گامزن ہے۔ مغرب کی طرف اس جادہ پیمائی میں کوئی خرابی نہیں ہے ..... اندیشہ صرف یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو ہم مغرب کی ظاہری چمک دمک ہی سے مسحور ہو جائیں اور مغربی تہذیب کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہ جائیں۔''

اس کے ساتھ ہی علامہ فرماتے ہیں:

''ہمارے سامنے واحد راستہ یہی ہے کہ ہم علوم جدیدہ کی جانب ایک
مؤدبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کریں اور انہی علوم کی روشنی میں تعلیم
اسلام کو سمجھیں خواہ اپنی اس کوشش میں تمہیں اپنے پیشروؤں سے
اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔''

علامہ اقبال نے یہ نظریہ ۱۹۲۸ء میں پیش کیا لیکن وہ دراصل شروع ہی سے مغرب کے متعلق اسی ترقی پسندانہ خیال کے حامی رہے۔ اقبال ایک وسیع النظر فلسفی شاعر تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر پرستاران کلام اقبال نے شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں ایک محدود انداز میں پیش کر کے دنیا بھر کے لیے غلط فہمیوں کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اقبال نے بڑے ذوق وشوق سے یورپی فکر ونظر کے سرچشموں سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں جب آپ تحصیل علم کے لیے یورپ روانہ ہو رہے تھے تو حضرت محبوب الٰہی کے آستانے پر پہنچ کر انھوں نے یہ دُعا مانگی تھی:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے　　شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
نظر ہے ابرِ کرم پر درخت صحرا ہوں　　کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی دھول ہو جائے　　یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

دل سے نکلی ہوئی یہ دعا قبول ہوئی اور اقبال نے قیام یورپ کے دوران میں بیکن، ڈیکارٹ اسپینوزا، لبنز، لاک، برکلے، ہیوم، کانٹ، نطشے، شوپن ہائر، ملٹن، گوئٹے، برگساں اور جیمز وارڈ وغیرہ کے نظریات کا اور زیادہ گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ ان کے علاوہ میکڈوگل، ڈبلیو جیمز، کارلائل، براؤننگ اور برنارڈ شا کے افکار کو بھی ہجا نچا اور پرکھا اور اس کے ساتھ ہی سقراط، افلاطون اور ارسطو ایسے متقدمین کی تحریروں کو اپنے فکر ونظر میں سمویا۔ اقبال ان مفکرین کے اکثر نظریوں سے متاثر بھی ہوئے اور ان کے افکار کو اپنے فکری رویوں میں ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ حالانکہ ایک وسیع المطالعہ انسان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ دوسروں کے افکار سے متاثر نہ ہو۔ دوسروں کے افکار سے متاثر ہونے کے بارے میں اقبال نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے۔ اس وقت ان کے الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن وہ لکھتے ہیں کہ انسانی ذہن ہر وقت ارتقا پذیر رہتا ہے اور انسانی ذہن پھر جمود کا شکار نہیں ہوتا ہے۔

پروفیسر ایم، ایم، شریف نے جناب بشیر احمد ڈار کی کتاب KANTIA-POST IQBAL VALUNTARISM کے پیش لفظ میں اس نکتے کی خاص طور سے وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ کہنا کہ ایک مفکر دوسروں کے انداز فکر سے متاثر ہوا ہے اُس کی
اہمیت کو کم کرنے کی کوشش نہیں ہے۔ ایک نابغہ جب ایک شاہ کار پیش
کرتا ہے تو اس شاہ کار کا تانا بانا وہ ماضی کے اُس سرمایے سے مستعار

لیتا ہے جو اسے اپنے دور کے ادب اور زندگی میں نظر آتا ہے۔ اور کسی
بھی نابغہ کی پوری شخصیت کا مطالعہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب
تک ہم ماضی کے اُس سرمایے کا مطالعہ نہ کرلیں جس کی بنیادوں پر اُس
نابغہ نے اپنے فن کی عمارت تعمیر کی ہے۔''

لیکن خود مصنف جناب بشیر احمد ڈار دیباچے میں اقبال کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر شریف کے اس بنیادی نکتہ کو فراموش کر گئے ہیں۔ بشیر احمد ڈار کے الفاظ میں:

''مغربی فکر اس تاثر کا محض ایک حصہ ہے جس کی مدد سے اقبال نے اپنا
ایک واضح نظریہ حیات پیش کیا۔ اس تاثر کا بیشتر اور زیادہ اہم حصہ
اقبال نے اسلامی تفکر کی قدیم روایات سے حاصل کیا اور یہ وہ تمدنی
سرمایہ ہے جس کی تشکیل و تکمیل میں بڑے بڑے فلسفیوں، صوفیوں اور
شاعروں نے حصہ لیا ہے۔''

جناب بشیر احمد ڈار یہاں دو حقیقتوں کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اقبال کی شخصیت اور ان کے فن کی تعمیر میں صرف مغربی انداز فکر اور اسلامی تفکر ہی شامل نہیں بلکہ ایک اور ہم سبک فکر بھی شامل ہے اور وہ ہے قدیم ہندوستانی انداز فکر۔ اس انداز فکر کی چھاپ کلام اقبال پر اول سے آخر تک موجود ہے۔ اور چونکہ کلام اقبال کے اس پہلو پر میں اپنی کتاب اقبال اور اس کا عہد میں مختصر سی بحث کر چکا ہوں اس لیے اسے یہاں نہیں دہراؤں گا اور صرف یہی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ کسی بھی نابغہ عصر کا تعلق اُس روایت سے توڑنا جس سے وہ زندگی کے ہر دور میں متاثر ہوا ہو اُس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش ہے۔ خواہ یہ کوشش شعوری ہو یا غیر شعوری۔

دوسرا یہ کہ یورپی فکر اس تاثر کا محض ایک حصہ نہیں ہے جس کی مدد سے اقبال نے اپنا ایک واضح نظریۂ حیات پیش کیا بلکہ اقبال نے اپنے اُس زاویہ نگاہ کو جو مغربی فلسفے کے مطالعہ کا نتیجہ ہے اپنی فطرت ثانیہ کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''میری زندگی کا بیشتر حصہ مغربی فلسفے کے مطالعے میں صرف ہوا ہے اور
یہ نقطہ نگاہ میری فطرت ثانیہ بن گیا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر میں
اسلام کے حقائق اور صداقتوں کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہوں، بلکہ
جہاں تک اظہار خیال کا تعلق ہے میرا تجربہ یہ ہے کہ گفتگو کے دوران
میں جب میں اپنے (فلسفیانہ) افکار کا اظہار اُردو میں کرنا چاہتا ہوں تو
اپنے آپ کو معذور پاتا ہوں۔''

اس حصے میں میرا موضوع اقبال کی شاعری اور فکر ونظر کا یہی پہلو ہے یعنی اقبال اور مغربی فلسفے کا باہمی تعلق۔لیکن مغربی فلسفے کی بات چیت شروع کرنے سے پہلے یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مغربی فلسفہ دنیا کے فلسفے سے کوئی الگ تھلگ فلسفہ نہیں ہے۔ یہ فلسفہ دنیا کے کسی حصے میں کسی صورت میں بھی ہمارے سامنے آیا ہے یہ انسان کی فکری کاوش کے ایک تسلسل کا نام ہے۔انسان نے جب اپنے آپ کو، اپنی حیات کو اور اپنی کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی تو اس کوشش کا نتیجہ فلسفے کی شکل میں نمودار ہوا۔فلسفے کی اس دنیا میں مخالف ہواؤں سے چراغ بجھتے بھی رہے اور چراغ جلتے بھی رہے لیکن روشنی کا تسلسل کہیں ٹوٹتے نہیں پایا۔سنسکرت میں فلسفے کو فکر و نظر کی طہارت کہا گیا ہے۔اور مذہب کو عملی فلسفی- غالبًا یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں محض نظریاتی اور تحصیلی فلسفہ پھل پھول نہیں سکا۔

اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ اقبال کے فکر وفن کی تعمیر میں کم وبیش مشرق ومغرب کے متعدد اکابر، صوفیا، اور شعرا نے حصہ لیا ہے۔ان میں سے بہت سارے مفکرین، مصلحین، مدبرین کے افکار ونظریات سے اختلاف بھی تھا اور بعض سے اتفاق وعقیدت بھی۔اقبال کے افکار ونظریات پر اہم مشرقی مفکرین کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں اور ان کے مابین مشابہت وافتراق کے جو چند اہم نکات ہیں ان پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے ایک معروضی تجزیہ پیش خدمت ہے۔اس ضمن میں آٹھ عظیم عبقری شخصیتوں؛ مولانا رومی، حافظ شیرازی، شیخ احمد سرہندی، سرسید احمد خاں، نیگور، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو جگہ دی گئی ہے۔

اقبال کی تصنیف میں سب سے پہلے رومی کا ذکر ان کے تحقیقی مقالہ The Development of Mataphysic in Persia ایران میں (ماسبعد الطبیعات کا ارتقا) میں کیا گیا ہے جس پر علامہ کو جرمنی کی میونخ یونی ورسٹی سے پی۔ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔اس مقالے میں شاعر مشرق نے اسلام کے اخلاقی پہلوؤں کو زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر شخص سے محبت اور بھلائی کرنے کی تلقین کرتے ہوئے اُس کی تائید میں رومی کے درج ذیل اشعار نقل کئے گئے ہیں۔

دل بدست اور کہ حج اکبر است
از ہزار آں کعب یک دل بتر است
کعبہ نگ خلیل اکبر است
دل گذر جلیل اکبر است

ادب میں ظہور پذیر ہو کر بیدار کیا اور اذن نغمہ سرائی دی کہ قوم کو نئی زندگی بخشنے کے لئے اپنی جدو جہد، جدید تجربات اور تازہ فکریات لوگوں کے سامنے پیش کروں۔اس کے علاوہ" رموز بیخودی مطبوعہ 1918ء کا پیش

لفظ بھی رومی کے اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

جہد کن، در بے خودی خود را بیاب　　زود تر واللہ عالم با الصواب

''پیام مشرق'' کی ایک نظم حکمت و شعر میں منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے بوعلی سینا (عقل) کے بجائے رومی (عشق) کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں۔" پیام مشرق کی کئی غزلوں میں رومی کے فلسفیانہ مضمرات کو آشکار کیا ہے، زبور عجم کے ایک شعر میں اپنا تعارف کراتے ہوئے اس کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے مثنوی مولانا روم سے اسرار حیات کے خزانے لوٹے اور تصوف کے گہرے سمندر کی تہہ سے نایاب موتی برآمد کر سکے۔ اس کے علاوہ ''زبورِ عجم'' کے کئی ابواب میں مرشد رومی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ''گلشن رازِ جدید'' کے خاتمے والے حصے میں اقبال مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اگر مغربی تہذیب کے تباہ کن مضمرات سے محفوظ رہنا چاہتے تو میرے خمیر سے جو شرارے نکلے ہیں ان کو پکڑ لو کیوں کہ میں نے اسی سوز میں زندگی بسر کی ہے جو رومی سے حاصل ہوا ہے۔

شرارے جستہ گیراز درونم　　کہ من مانند رومی گرم خونم

جاوید نامہ جو اقبال کا شاہکار فارسی شعری مجموعہ ہے، اس میں اقبال نے آسمانی سفر کے لئے مرشد پیر رومی کا انتخاب کیا۔ کتاب کے اختتام پر خطاب بہ جاوید کے تحت نئی نسل کو پیغام دیتے ہوئے تلقین کرتے ہیں کہ پیر رومی کو اپنا رفیق بناؤ۔ ارمغان حجاز میں یوں تو 47 رباعیاں ہیں لیکن ان میں سے دس رباعیوں میں اپنے مرشد رومی سے گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کے اُردو شعری مجموعوں میں بال جبرئیل میں رومی کا سب سے زیادہ اثر دکھائی دیتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ روشن ہے　　اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ایرانی شعرا میں رومی کے بعد جس شاعر کے اثرات اقبال پر سب سے زیادہ مرتسم ہوئے ہیں وہ خواجہ حافظ شیرازی ہیں گرچہ فکر و احساس میں دونوں عظیم فنکاروں میں بعد مشرقین ہیں۔ حافظ بھی تصوف کے نمائندہ تھے جو وحدت الوجود اور ہمہ اوست کا فلسفہ ہے۔ علی الرغم اس کے اقبال وحدت الشہود یعنی ہمہ از اوست کے حامی تھے۔ اقبال نے اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں حکیم افلاطون اور خواجہ حافظ شیرازی اور بعض دیگر مواقع پر نظریہ وحدت الوجود کی مخالفت بھی کی جس کے نتیجے میں ایک ادبی معرکہ آرائی کی صورت پیدا ہوگئی۔ اقبال وحدت الوجود اور افلاطون کے عینی فلسفہ کو اس لئے ہدف تنقید بناتے ہیں کہ ان کی رو سے یہ دھوکا اور مایا ہے لہذا اس نظریے سے بے عملی کی تلقین ملتی ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ نظریہ خودی کو مٹانے کی تلقین کرتا ہے جو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسرار خودی کی اشاعت اور حافظ شیرازی کے متعلق اقبال کے اشعار پر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ بعد میں اقبال کو صفائی دینی پڑی۔ یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت پر مبنی ہے کہ اسلوب

سخن کے اعتبار سے اقبال نے بڑے پیمانے پر حافظ سے استفادہ کیا ہے۔ اقبال نے اس مقصد کے لئے ایسے اسلوب کی تشکیل کی جو شیوہ دلبری کے ساتھ ساتھ جلال تیموری کا آہنگ رکھتا ہے۔ حافظ کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت نشاط عشق، جوش بیان اور مستی احوال و بے خودی ہے۔ اقبال مستی کردار کے نمائندہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے سبک ہندی اور سبک شیرازی کو ہم آہنگ و یک رنگ کرتے ہوئے حافظ کے اسلوب کو وسعت و نیرنگی اور رفعت و شوکت عطا کی اور یہی ان کی شاعرانہ عظمت کا سب سے اہم ثبوت ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال نے جہاں اپنے مرشد رومی کے اثرات کو سب سے زیادہ قبول کرتے ہوئے حقیقت کی آگہی کے لئے منطقی دلائل و براہین پر وجدان کو ترجیح دی ہے۔ ترک نفس پر تزکیۂ نفس یا تعمیر خودی کو فوقیت دی۔ مکتبی صوفیانہ نظریات کے مخالف رہے اور اس کو جہد عمل اور کارزار حیات کے منافی سمجھا۔ دوسری طرف ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اقبال کا صوفیانہ مسلک و نقطہ نظر حضرت شیخ احمد سرہندی سے متاثر و مستعار ہے۔ اس کے علاوہ وہ تصوف کے مختلف دبستانوں میں شریعت اسلامی کے دبستانوں کی حیثیت سے شیخ احمد سرہندی کے مکتب فکر کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کو تصور مرد مومن کا نمونہ تسلیم کرتے ہیں۔ شاعر مشرق حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے روحانی، علمی اور جہاد قلبی ولسانی کے باعث سب سے زیادہ معترف تھے اور عقیدت مند بھی۔ اقبال کے دل و دماغ پر حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی غیرت ایمانی، جوش جہاد، طاغوتی نظام سے نبرد آزما ہونے کا عزم، جرات وحق گوئی کا زبردست اور گہرا اثر تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اقبال کے ذہن کو مجدد الف ثانی کے ہی افکار سے روشنی ملی۔ وہ مجدد الف ثانی کے وحدت الشہود کے نظریے سے زبردست متاثر تھے اور حضرت شیخ احمد سرہندی کی طرح محی الدین ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کو گمراہ کن گردانتے ہیں۔ دونوں کا پختہ عقیدہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ مومن کی زندگی کی معراج ہے۔ لہذا تصوف اور طریقت کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کر کے قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائے۔

اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ سرسید کی عبقری شخصیت اپنے آپ میں ایک انجمن تھی۔ ایک تحریک تھی جنہوں نے اپنے فکر ونظر اور نیک و صالح عمل سے زمانے کے رخ کو بدل کر رکھ دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے عروق مردہ میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے۔ سرسید اور ان کی تحریک سے علامہ اقبال کسی حد تک متاثر تھے اور انہیں کسی حد تک قلبی لگاؤ تھا اس کا اندازہ ہمیں اقبال کی تحریر اور مکاتیب سے ہوتا ہے۔ اسلام کی تشکیل نو کا جو سلسلہ سرسید احمد خاں نے شروع کیا تھا علامہ اقبال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ شاعر مشرق اس بات کے معترف ہیں کہ سرسید کی بے چین روح نے ہی عہد جدید کے اثرات کو محسوس کرتے ہوئے مسلمان قوم کو جدید حالات کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے تیار کیا۔ دونوں مفکرین کے افکار ونظریات کا ایک اہم پہلو تقلید سے انحراف بھی ہے۔ دونوں مفکرین اندھی تقلید اور روایت پرستی کے بجائے معروضیت اور عقلیت کی ترغیب دیتے

تھے۔دونوں کے نزدیک اجتہاد اصلاح معاشرت کی کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔سرسید کی طرح اقبال نے بھی قوم کی زندگی اور تازگی کے لئے اجتہاد کو بہت زیادہ اہمیت دیا ہے۔وہ مسلمانوں کی صدیوں کی پستی کی وجہ اندھی تقلید کو ہی قرار دیتے ہیں جس کا تدارک ان کی نگاہ میں اجتہاد و تجدید ہے۔الغرض کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے افکار و نظریات پر سرسید کا کسی حد تک اثر تھا۔ ٹیگور اور اقبال دونوں عظیم شخصیتوں کا عہد تقریبا ایک ہے۔ان دونوں نے جب آنکھیں کھولیں اُس وقت ہندوستان کی فضا 1857ء کے واقعات کی بجھتی ہوئی آگ سے منور تھی۔دونوں سچے دیش بھگت تھے اور دونوں شانتی کے بہت بڑے امین۔دونوں رجائیت پسند شاعر تھے۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ علامہ اقبال کے تئیں مولانا ابوالکلام آزاد کے دل میں نیک جذبات و احساسات تھے۔سیاسی و نظریاتی اختلاف کے باوجود مولانا آزاد نے اخلاقی قدروں کو وسعت بخشی اور وہ علامہ اقبال کے قدردانوں میں تھے۔اقبال کے دل میں بھی مولانا آزاد کے لئے بڑی جگہ تھی۔دونوں ایک دوسرے کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔دونوں عظیم عبقری شخصیتوں کے مراسم و روابط کے علاوہ تحریک خلافت کے حوالے سے ان کے افکار و نظریات اور عملی کاوشوں کا تجزیہ معروضی انداز میں پیش کرنے کی ضرورت تو ہے،لیکن غیر جانبدارانہ اور منصفانہ طور پر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان شخصیتوں نے عوامی مزاج میں بری تبدیلی پیدا کر دی تھی۔

علامہ اقبال اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی دونوں کی تحریریں تلاش حق، مقصد حیات، اخلاق و روحانی تربیت،انفرادی و اجتماعی زندگی کی رفعت کی ضامن ہیں، جو آدم خاکی کو انسان کامل کے مقام تک لے جاتی ہیں۔ دونوں میں حمیت اسلامی و جذبہ ایمانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔دونوں کے دل و دماغ اقامت دین اور اعلائے کلمتہ الحق سے مزین تھے۔تعمیر حیات و تسخیر کائنات دونوں کا نصب العین تھا۔اقبال اور مولانا سید ابوالاعلی مودودی عنوان کے تحت دونوں عبقری شخصیتوں کے مابین تعلقات و روابط کا اجمالی جائزہ لیا جانا چاہیے۔دونوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بہت سے پہلو میں مماثلت اور مشابہت بھی ہے۔دونوں نے جدید ذہن کو سامنے رکھ کر اسلام کی تفہیم کی اور اپنے افکار و نظریات کی ضیا پاشیوں سے عالم انسانی کو منور کیا۔

اقبال کے شیدائیوں میں ایک اہم اور نمایاں نام مشہور عالم دین، بلند پایہ مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ہے۔یوں تو ان کی حیثیت معتبر و مستند مورخ کی ہے لیکن ان کی عربی تصنیف روائع اقبال کو اقبالیات کی تفہیم و تنقید میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔تقاریر اور مقالات پر مبنی مولانا علی میاں کی یہ تصنیف دار الفکر دمشق سے 1960ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔بعد میں اس کا اردو ترجمہ ''نقوش اقبال'' کے نام سے مولانا شمس تبریز خان نے کیا۔اس کتاب میں 21 مضامین ہیں جن کے مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ مولانا کو شاعر مشرق سے گہری عقیدت تھی اور ان کی شاعری کی اہمیت،افادیت اور معنویت کے معترف بھی تھے۔

## 3.4 آپ نے کیا سیکھا

ا۔علامہ اقبال مغرب کی نیطشے ، گوئٹے ،لینن برگساں جیسی عبقری شخصیات کی بہترین خدمات سے متاثر تھے۔
۲۔رومی، فارابی ،ظہیری، سعدی اور البیرونی جیسی شخصیتوں سے اقبال نے روحانی ومعنوی تعلیم حاصل کی۔

## 3.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔علامہ اقبال کی مشرقی فکر کا احاطہ کیا گیا ہے۔
۲۔اقبال نے کن مغربی مفکرین سے استفادہ کیا اس کی معلومات ہوئی۔
۳۔اقبال کے مغربی اور مشرقی تصورات کا موازنہ حاصل ہوا۔

## 3.6 سوالات

ا۔اقبال کن مغربی مفکرین کی خدمات سے متاثر تھے؟ اور کیوں؟
۲۔کس طرح مغربی مفکرین نے اقبال کی ذہنی وقلبی تربیت کی؟

## 3.7 سوالات کے جوابات

ا۔اقبال ایک ایسے ہی بڑے فن کار ہیں جن کو کسی محدود اور تنگ نظریے کی چار دیواری میں مقید کرنا اقبال کے ساتھ ہی نہیں ہندوستان بلکہ سارے مشرق کے ادب کے ساتھ بے انصافی کرنے کے مترادف ہے۔

علوم مغرب سے متعلق علامہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے نہایت عمدہ بات کہی ہے۔
''مقالات یوم اقبال" کے دیباچے میں آپ لکھتے ہیں:

''اقبال نے یورپی تہذیب کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی اور اسلام کو جدید یورپی خیالات کی روشنی میں پیش کیا۔''

ڈاکٹر تاثیر کے یہ چند الفاظ اقبال کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ایک چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور دراصل جو کچھ تاثیر مرحوم نے کہا ہے وہ خود علامہ کے اپنے افکار ہی کا پرتو رہے۔اقبال اپنی کتاب ''تشکیل جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ" میں لکھتے ہیں:

> ''تاریخ جدید کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آج دنیاے اسلام بڑی تیزی کیساتھ مغرب کی طرف گامزن ہے۔مغرب کی طرف اس جادہ پیمائی میں کوئی خرابی نہیں ہے .....اندیشہ صرف یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو ہم مغرب کی ظاہری چمک دمک ہی سے مسحور ہو جائیں اور مغربی تہذیب کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہ جائیں۔''

اس کے ساتھ ہی علامہ فرماتے ہیں:

''ہمارے سامنے واحد راستہ یہی ہے کہ ہم علوم جدیدہ کی جانب ایک
مؤدبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کریں اور انہی علوم کی روشنی میں تعلیم
اسلام کو سمجھیں خواہ اپنی اس کوشش میں تمہیں اپنے پیشروؤں سے
اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔''

علامہ اقبال نے یہ نظریہ ۱۹۲۸ء میں پیش کیا لیکن وہ دراصل شروع ہی سے مغرب کے متعلق اسی ترقی پسندانہ خیال کے حامی رہے۔ اقبال ایک وسیع النظر فلسفی شاعر تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر پرستاران کلام اقبال نے شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں ایک محدود انداز میں پیش کر کے دنیا بھر کے لیے غلط فہمیوں کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اقبال نے بڑے ذوق وشوق سے یورپی فکر ونظر کے سرچشموں سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں جب آپ تحصیل علم کے لیے یورپ روانہ ہو رہے تھے تو حضرت محبوب الٰہی کے آستانے پر پہنچ کر انھوں نے یہ دُعا مانگی تھی:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے　　شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
نظر ہے ابرِ کرم پر درخت صحرا ہوں　　کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی دھول ہو جائے　　یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

دل سے نکلی ہوئی یہ دعا قبول ہوئی اور اقبال نے قیام یورپ کے دوران میں بیکن، دیکارت اسپینوزا، لبنز، لاک، برکلے، ہیوم، کانٹ، نیٹشے، شوپن ہائر، ملٹن، گوئٹے، برگساں اور جیمز وارڈ وغیرہ کے نظریات کا اور زیادہ گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ ان کے علاوہ میکڈوگل، ڈبلیو جیمز، کارلائل، براؤننگ اور برنارڈ شا کے افکار کو بھی پرکھا اور اس کے ساتھ ہی سقراط، افلاطون اور ارسطو ایسے متقدمین کی تحریروں کو اپنے فکر ونظر میں سمویا۔ اقبال ان مفکرین کے اکثر نظریوں سے متاثر بھی ہوئے اور ان کے افکار کو اپنے فکری رویوں میں ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ حالانکہ ایک وسیع المطالعہ انسان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ دوسروں کے افکار سے متاثر نہ ہو۔ دوسروں کے افکار سے متاثر ہونے کے بارے میں اقبال نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے۔ اس وقت ان کے الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن وہ لکھتے ہیں کہ انسانی ذہن ہر وقت ارتقاء پذیر رہتا ہے اور انسانی ذہن پھر جمود کا شکار نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ اقبال کے فکر وفن کی تعمیر میں کم وبیش مشرق ومغرب کے متعدد اکابر، صوفیا، اور شعرا نے حصہ لیا ہے۔ ان میں سے بہت سارے مفکرین، مصلحین، مدبرین کے افکار و نظریات سے اختلاف بھی تھا اور بعض سے اتفاق وعقیدت بھی۔ اقبال کے افکار ونظریات پر اہم مشرقی مفکرین کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں اور ان کے مابین مشابہت وافتراق کے جو چند اہم نکات ہیں ان پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے ایک معروضی تجزیہ پیش خدمت ہے۔ اس ضمن میں آٹھ عظیم عبقری شخصیتوں مولانا رومی، حافظ شیرازی، شیخ

احمد سرہندی، سرسید احمد خاں، نیگور، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو جگہ دی گئی ہے۔

اقبال کی تصنیف میں سب سے پہلے رومی کا ذکر ان کے تحقیقی مقالہ The Development of Mataphysic in Iran ایران میں (بعد الطبیعات کا ارتقا) میں کیا گیا ہے جس پر علامہ کو جرمنی کی میونخ یونی ورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔ اس مقالے میں شاعر مشرق نے اسلام کے اخلاقی پہلوؤں کو زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر شخص سے محبت اور بھلائی کرنے کی تلقین کرتے ہوئے اُس کی تائید میں رومی کے درج ذیل اشعار نقل کئے گئے ہیں۔

دل بدست اور کہ حج اکبر است
از ہزار آں کعب یک دل بتر است
کعبہ نگ خلیل اکبر است
دل گذر جلیل اکبر است

ادب میں ظہور پذیر ہو کر بیدار کیا اور اذن نغمہ سرائی دی کہ قوم کو نئی زندگی بخشنے کے لئے اپنی جدو جہد، جدید تجربات اور تازہ فکریات لوگوں کے سامنے پیش کروں۔ اس کے علاوہ "رموز بیخودی مطبوعہ 1918ء کا پیش لفظ بھی رومی کے اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

جہد کن، در بے خودی خود را بیاب　　زود تر واللہ عالم با الصواب

''پیام مشرق'' کی ایک نظم حکمت و شعر میں منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے بوعلی سینا (عقل) کے بجائے رومی (عشق) کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں۔ "پیام مشرق کی کئی غزلوں میں رومی کے فلسفیانہ مضمرات کو آشکار کیا ہے، زبور عجم کے ایک شعر میں اپنا تعارف کراتے ہوئے اس کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے مثنوی مولانا روم سے اسرار حیات کے خزانے لوٹے اور تصوف کے گہرے سمندر کی تہہ سے نایاب موتی برآمد کر سکے۔ اس کے علاوہ ''زبور عجم'' کے کئی ابواب میں مرشد رومی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ گلشن راز جدید کے خاتمے والے حصے میں اقبال مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اگر مغربی تہذیب کے تباہ کن مضمرات سے محفوظ رہنا چاہتے تو میرے خمیر سے جو شرارے نکلے ہیں ان کو پکڑ لو کیوں کہ میں نے اسی سوز میں زندگی بسر کی ہے جو رومی سے حاصل ہوا ہے۔

شرارے جستہ گیراز درونم　　کہ من مانند رومی گرم خونم

جاوید نامہ جو اقبال کا شاہکار فارسی شعری مجموعہ ہے، اس میں اقبال نے آسمانی سفر کے لئے مرشد پیر رومی کا انتخاب کیا۔ کتاب کے اختتام پر خطاب بہ جاوید کے تحت نئی نسل کو پیغام دیتے ہوئے تلقین کرتے ہیں کہ پیر رومی کو اپنا رفیق بناؤ۔ ارمغان حجاز میں یوں تو 47 رباعیاں ہیں لیکن ان میں سے دس رباعیوں میں اپنے مرشد

رومی سے گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کے اُردو شعری مجموعوں میں بال جبرئیل میں رومی کا سب سے زیادہ اثر دکھائی دیتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ روشن ہے　　اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ایرانی شعرا میں رومی کے بعد جس شاعر کے اثرات اقبال پر سب سے زیادہ مرتسم ہوئے ہیں وہ خواجہ حافظ شیرازی ہیں گرچہ فکر و احساس میں دونوں عظیم فنکاروں میں بعد مشرقین ہیں۔ حافظ بھی تصوف کے نمائندہ تھے جو وحدت الوجود اور ہمہ اوست کا فلسفہ ہے۔ علی الرغم اس کے اقبال وحدت الشہود یعنی ہمہ از اوست کے حامی تھے۔ اقبال نے اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں حکیم افلاطون اور خواجہ حافظ شیرازی اور بعض دیگر مواقع پر نظریہ وحدت الوجود کی مخالفت بھی کی جس کے نتیجے میں ایک ادبی معرکہ آرائی کی صورت پیدا ہوگئی۔ اقبال وحدت الوجود اور افلاطون کے عینی فلسفہ کو اس لئے ہدف تنقید بناتے ہیں کہ ان کی رو سے یہ دھوکا اور مایا ہے لہذا اس نظریے سے بے عملی کی تلقین ملتی ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ نظریہ خودی کو مٹانے کی تلقین کرتا ہے جو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسرار خودی کی اشاعت اور حافظ شیرازی کے متعلق اقبال کے اشعار پر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ بعد میں اقبال کو صفائی دینی پڑی۔ یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت پر مبنی ہے کہ اسلوب سخن کے اعتبار سے اقبال نے بڑے پیمانے پر حافظ سے استفادہ کیا ہے۔ اقبال نے اس مقصد کے لئے ایسے اسلوب کی تشکیل کی جو شیوہ دلبری کے ساتھ ساتھ جلال تیموری کا آہنگ رکھتا ہے۔ حافظ کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت نشاط عشق، جوش بیان اور مستی احوال و بے خودی ہے۔ اقبال مستی کردار کے نمائندہ تھے۔ لہذا انہوں نے سبک ہندی اور سبک شیرازی کو ہم آہنگ و یک رنگ کرتے ہوئے حافظ کے اسلوب کو وسعت و نیرنگی اور رفعت و شوکت عطا کی اور یہی ان کی شاعرانہ عظمت کا سب سے اہم ثبوت ہے۔

## 3.7 فرہنگ

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| اسلوب | طریقہ، اندازِ تحریر |
| نیرنگی | جدت |
| رفعت | اونچائی |
| سبک | نازک، باریک |
| تسلسل | سلسلہ |
| متشکل۔ شکل پذیر | شکل پانے والی |

| | |
|---|---|
| مستحسن | اچھی |
| مسحور | جادو میں آیا ہوا |
| استوار | قائم |
| سحاب | بادل |
| برگ و بار | پتے اور پھل |
| پیش خیمہ | کسی واقعے سے پہلے پیش آنے والی صورت حال |
| حوالی | ماحول |
| تولید | پیدائش |

## 3.8 کتب برائے مطالعہ

| | | |
|---|---|---|
| ۱ | حکمتِ اقبال | ڈاکٹر رفیع الدین |
| ۲ | اقبال سب کے لئے | ڈاکٹر فرمان فتح پوری |
| ۳ | مقالات اقبال | مرتبہ سید عبدالواحد |

## بلاک2 :

## اقبال کے افکار و تصورات

اکائی4-قومی و وطنی تصورات (شاعری کے حوالے سے)

اکائی5-ملی، اسلامی، سماجی، فنی اور ادبی شعور

اکائی6-مابعد الطبیعاتی تصورات (خودی و بے خودی)

اکائی7-تصوراتِ عشق و خرد اور مردِ مومن

## بلاک 2 کا تعارف

اکائی 4 ''قومی و وطنی تصورات (شاعری کے حوالے سے)'' پر مبنی ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی شاعری میں قومی و وطنی تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی 5 ''ملی، اسلامی، سماجی، فنی اور ادبی شعور'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی شاعری میں ملی، اسلامی، سماجی، فنی اور ادبی شعور پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ان کی شاعری سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

اکائی 6 میں ''مابعدالطبیعاتی تصورات (خودی و بے خودی)'' پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی شاعری میں مابعدالطبیعاتی تصورات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 7 ''تصورات عشق و خرد اور مرد مومن'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ اس اکائی میں اقبال کی شاعری میں موجود تصورات عشق پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز خرد اور مرد مومن کے تصوارت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

# اکائی: 4 قومی ووطنی تصورات (شاعری کے حوالے سے)

ساخت

4.1 تمہید
4.2 اغراض ومقاصد
4.3 اقبال کے قومی ووطنی تصورات
4.4 آپ نے کیا سیکھا؟
4.5 اپنا امتحان خود لیجیے
4.6 سوالات کے جوابات
4.7 فرہنگ
4.8 کتب برائے مطالعہ

## 4.1 اغراض ومقاصد

.1۔اقبال کی حب الوطنی سے متعلق واقفیت ہوگی۔
۲۔علامہ اقبال کی شاعری میں قومی عناصر سے آگاہی حاصل ہوگی۔
۳۔علامہ کی شاعری میں یگانگت کے پہلو سے روشناسی۔

## 4.2 تمہید

اقبال نے جب ''ہمالہ'' اور ترانہ ہندی جیسی نظمیں لکھا تو ملک کے ہر فرد نے انہیں ہندوستان کا قومی شاعر تسلیم کیا۔ گو اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانہ میں ہمالہ، ترانہ ہندی، نیا شوالہ، اور ہندوستانی بچوں کو گیت کے علاوہ رام، نانک اور سوامی رام تیرتھ پر نظمیں کہی ہیں۔ لیکن آگے چل کر ان کے نظریہ میں فرق آیا اور اقبال نے ہندوستان کے گیت لکھے۔ اقبال کی قومیت کے بارے میں کہی گئی باتیں اس وجہ سے غلط ہیں کہ اقبال در حقیقت ہندوستانی ہیں اور نہ پاکستانی ہیں بلکہ وہ آفاقی نقطۂ نظر کے حامل شاعر ہیں۔ ان کی عالمی حیثیت مسلّم ہے۔ ایسی صورت میں اقبال کو پاکستانی یا ہندوستانی شاعر قرار دینا اقبال کی عظمت کو کم کرنا ہے اور خود کلام اقبال کی غلط انداز میں پیش کرنے کے مترادف ہوگا۔

## 4.3 اقبال کے قومی ووطنی تصورات

اپنے وطن سے محبت فطری بات ہے۔اور اقبال نے اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا ہے تو اس میں کچھ تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ وطن کی محبت کا یہ تخیل خالصاً غیر سیاسی ہے۔عبدالسلام ندوی کے قول کے مطابق یہ ایک نہایت شریفانہ اخلاقی بلکہ نظری جذبہ ہے جس سے کسی شریف آدمی کا دل خالی نہیں ہوسکتا۔حضرت بلال" مکہ میں اسقدر ستائے گئے تھے کہ وطن چھوڑنا پڑا تھا۔تاہم جب اُن کو مکہ یاد آتا تھا تو روتے تھے،اور پکار کہ یہ اشعار پڑھتے تھے(اشعار کا مفہوم درج ذیل ہے)

(آہ کیا کبھی پھر وہ دن آسکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی میں ایک رات بسر کروں اور میرے گرداز خر وجلیل ہوں (مکہ کی گھانسوں کا نام) اور کیا وہ دن بھی ہوگا کہ میں غیر کے چشمے پر اتروں اور شامہ وتخیل مکہ کے پہاڑ مجھے دکھائی دیں۔)

اقبال کا آبائی وطن ہندوستان میں خاص کشمیر تھا۔اس لئے کشمیر کی وادی کی روح کی نظمیں تخلیق ہوئیں۔ اِن کے کلام میں وادیٔ کشمیر کا حسن جھلکتا نظر آتا ہے۔

موتی عدن سے،لعل ہوائے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے چمن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

لیکن جیسے جیسے اقبال کا شعور ارتقائی منزل طے کرنے لگا،ان کی وطنیت کے تصور میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ چنانچہ ان ابتدائی رباعیوں کے بعد جب بانگ درا ہمارے سامنے آئی تو اب اقبال کا وطن صرف کشمیر نہیں تھا بلکہ پورا برصغیر ہندان کے خوابوں کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ ہمالہ انہیں پورے ہندوستان کی فصیل نظر آنے لگا۔اور جب انہوں نے وطن کی محبت سے سرشار ہوکر ترانہ ہندی لکھا تو سارے ملک کے بچے اور نوجوان سبھوں نے مل کر گایا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اقبال نے ہندوستان کے سیکولر پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے ایک قومی گیت لکھا جس کے بول ہیں۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ایک دن ایسا آیا کہ اقبال کو خاک وطن کیا ہر ذرہ دیوتا نظر آنے لگا۔اور بھگتوں کے گیت میں انہیں شکتی

اور شانتی نظر آنے لگی۔ یہ زمانہ اقبال کی قومی شاعری کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔اسی وطنیت کے جذبے میں ڈوب کر پیش کیا ہے۔ہم اقبال کی اس قومی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس میں ایک قسم کا والہانہ پن اور سچائی کی بوخود نظر آتی ہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ وطن سے محبت کا یہ جذبہ زمانہ فرنگ تک باقی و برقرار رہا۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں ان کی نظم ''شعاع امید" پیش کی جاسکتی ہے۔ بلکہ وہ یہاں کچھ زیادہ ہی جذباتی نظر آتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز　　اقبال کی اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن　　یہ خاک کہ ہے جس کا خذف ریزہ درنایاب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ خواص معانی　　جن کیلئے ہر بحرِ پر آشوب ہے پایاب

علاوہ ازیں اقبال کے آخری دور کا اردو کلام جوارمغان حجاز کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں بھی ''ملا زادہ ضیغم ولال کشمیری کا بیاض'' کے زیرعنوان نظم شامل ہے جس میں کشمیر کے حسن کی تعریف کی گئی ہے۔اس لئے ہمالہ سے خاک ہند کا جو مقدس تصور اقبال کی شاعری میں ابھرتا ہے وہ آخری زمانے تک اسی آب تاب کے ساتھ باقی رہتا ہے۔اس لئے وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اقبال ہندوستان کا شاعر ہے۔اس حقیقت کے باوجود کہ اقبال کے ترانہ ملی لکھی حق بجانب ہیں

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یہ تصور کسی عصبیت کی بنا پر نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال نے آگے چل کر پاکستان کا نظریہ پیش کیا اور جناح کو اس امر پر اکسایا ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے قیام کی جدوجہد کریں۔خود اقبال نے بھی اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ اپنے نظریہ کو عام کرنے کی ممکنہ کوشش کی، اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے۔ یہاں اقبال کی دوہری حیثیت سامنے آتی ہے۔

اقبال نے ہندوستان سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے۔اقبال کے ہاں جو تبدیلی آئی وہ محض سیاسی تھی۔ وہ شاعر تو تھے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سیاست دان بھی تھے۔خود جناح بھی کسی زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر کہلاتے تھے۔اس زمانے کے سیاسی حالات کچھ ایسے تھے کہ ملک کی تقسیم ناگزیر قرار پائی۔ چنانچہ خود ہندوستانی قائدین نے تبھی بادل ناخواستہ اس تقسیم کو تقدیر کا نوشتہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔اس لئے میرے خیال میں مدبر اقبال کو شاعر اقبال سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اقبال نے شعری سطح پر کہیں بھی نعرہ پاکستان بلند نہیں کیا۔اگر وہ ترانہ بھی لکھتے ہیں تو اس کے پس منظر میں پاکستان کا نظریہ نہیں بلکہ وطنیت کا وہ تصور ہے جو سیاسی، معاشی، سماجی، اخلاقی اور مختصر یہ کہ انسانی نقطہ نظر سے غیر فطری نظر آتا ہے اور یہاں اقبال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکساں طور پر ہدف ملامت بنایا۔

اس دور میں مئے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال نے اسلامی نقطہ نظر سے وطنیت کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وطنیت کا یہ تصور غیر مسلموں میں ہی نہیں بلکہ پان عرب ازم کی صورت میں خود مسلمانوں میں بھی موجود تھا، اور یہ بات قرآنی نقطۂ نظر سے انتہائی گمراہ کن ہے۔ اس لئے اس کی تکذیب اقبال نے ضروری سمجھی۔ اب اگر ہم ''ترانہ ملی'' کا مطالعہ کریں کو اقبال کے اصلی منشا کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور یہ غلط فہمی خود بخود دور ہو جاتی ہے کہ ترانہ ہندی کے بعد ترانہ ملی لکھ کر اقبال نے خود اپنی تردید کی ہے۔ یا یہ کہ اقبال نے ہندوستانی وطنیت سے دستبرداری اختیار کی اور یہ کہ اقبال نے مسلمانوں میں تنفر کے جذبات پیدا کیے۔ یہ سارے الزمات محض مفروضہ کے نتیجہ اور بے بنیاد ہیں۔ اقبال کے لئے سنت ابراہیمی کی تکمیل ضروری تھی۔ چنانچہ اسی سنت کی تکمیل میں انہوں نے ''ترانہ ملی'' مسلمانوں کو سنایا:

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا — ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میر حجازؐ اپنا — اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا — ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اور یہ کارواں کن کن منزلوں سے ہو کر گزرے گا۔

تو ابھی سے رہگذر میں ہے قید مقام سے گذر
مصرو حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

اصل میں رنگ ونسل، ذات پات اور وطن کے خلاف اسلام نے آواز اٹھائی تھی اور سارے ہی انسانوں کو ایک اللہ کی مخلوق اور ایک آدم کی اولاد قرار دیکر رشتہ اخوت اور بھائی چارگی کو استوار کیا تھا۔ بھلا ایسے میں اقبال کو یہ کیسے گوارا ہوتا کہ مسلمان رنگ ونسل اور وطن کے جذبات کے تابع ہوکر منتشر ہو جائیں۔ اقبال نے وطنیت کے جذبہ کی جونفی کی ہے وہ مقامی حیثیت سے نہیں بلکہ آفاقی اور عالمی حیثیت سے کی ہے۔ اور یہاں ملت اسلامیہ مراد کسی ایک ذات یا نسل کا اتحاد نہیں بلکہ تمام انسانوں کا نقطۂ اتحاد ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ پر اس کی بنیاد رکھ کر ایک ملت گیتی نورد پیدا کردی ہے:

حکمتش یک ملت گیتی نورد  برا سا میں کلمہ تعمیر کرد

برخلاف اس کے ؎

جو کرے گا امتیاز رنگ وخوں مٹ جائے گا  ترکِ خرگا ہی ہو یا اعرابی والا گہر

دراصل اقبال نے کل بنی نوع انسان کو وحدت انسانی کی دعوت دی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں اقبال کو ہندوستان یا پاکستان میں تقسیم کرنے کے بجائے آفاق میں ڈھونڈنا چاہیے۔ خود اقبال نے بھی شاید اپنے بارے میں کہا ہے:

نہ چینی عربی و جامی رومی و شامی  سماسکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

اقبال کے وحدت انسانی کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے میں یہاں اُن کی نظم جگنو کو پیش کرونگا۔ خصوصا جگنو کا آخری بند بڑا معنی خیز ہے ملاحظہ ہو ؎

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے  انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا  واں چاندنی ہے جو کچھ بس دور کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ  نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی  جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو  ہر شئے میں جب کہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

اقبال انسانی وحدت اور یکتائی میں یقین رکھتے ہیں اس لئے اقبال کو جغرافیائی حدود میں مقید کرنے کی کوشش بیکار محض ہے۔ اقبال کی تلاش ہندوستان یا پاکستان میں نہیں۔ بلکہ اس مرد آفاقی کو کائنات کی وسعتوں میں تلاش کرنا چاہیے۔

## 4.4 آپ نے کیا سیکھا

۱۔علامہ اقبال کی وطنی شاعری سے آگاہی حاصل کی۔

۲۔وطن سے محبت کے جذبات پیدا ہوے۔

۳۔قومی عناصر سے لبریز اقدار حاصل کیے۔

## 4.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔علامہ اقبال کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر واضح کیجیے؟

۲۔علامہ اقبال اور وطنیت پر نوٹ لکھے؟

## 4.6 سوالات کے جوابات

۱۔اقبال کا آبائی وطن ہندوستان میں خاص کشمیر تھا۔اس لئے کشمیر کی وادی کی روح کی نظمیں تخلیق ہوئیں۔اِن کے کلام میں وادی کشمیر کا حسن جھلکتا نظر آتا ہے۔

موتی عدن سے،لعل ہوائے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے چمن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

لیکن جیسے جیسے اقبال کا شعور ارتقائی منزل طے کرنے لگا،ان کی وطنیت کے تصور میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔چنانچہ ان ابتدائی رباعیوں کے بعد جب بانگ درا ہمارے سامنے آئی تو اب اقبال کا وطن صرف کشمیر نہیں تھا بلکہ پورا برصغیر ہندان کے خوابوں کا مرکز بن گیا تھا۔چنانچہ ہمالہ انہیں پورے ہندوستان کی فصیل نظر آنے لگا۔اور جب انہوں نے وطن کی محبت سے سرشار ہوکر ''ترانہ ہندی'' لکھا تو سارے ملک کے بچے اور نوجوان سبھوں نے مل کر گایا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اقبال نے ہندوستان کے سیکولر پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے ایک قومی گیت لکھا جس کے بول ہیں۔

چشتی نے جس زمین میں پیغام حق سنایا  نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا  جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ایک دن ایسا آیا کہ اقبال کو خاک وطن کیا ہر ذرہ دیوتا نظر آنے لگا۔اور بھگتوں کے گیت میں انہیں شکتی اور شانتی نظر آنے لگی۔یہ زمانہ اقبال کی قومی شاعری کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔اسی وطنیت کے جذبے میں

ڈوب کر پیش کیا ہے۔ہم اقبال کی اس قومی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس میں ایک قسم کا والہانہ پن اور سچائی کی بوخود نظر آتی ہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ وطن سے محبت کا یہ جذبہ زمانہ فرنگ تک باقی و برقرار رہا۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں ان کی نظم ''شعاع امید" پیش کی جاسکتی ہے۔ بلکہ وہ یہاں کچھ زیادہ ہی جذباتی نظر آتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز　　اقبال کی اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن　　یہ خاک کہ ہے جس کا خرف ریزہ در نایاب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ خواص معانی　　جن کیلئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

علاوہ ازیں اقبال کے آخری دور کا اردو کلام جوارمغان حجاز کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں بھی ''ملا زادہ ضیغم ابولولابی کشمیری کا بیاض'' کے زیر عنوان نظم شامل ہے جس میں کشمیر کے حسن کی تعریف کی گئی ہے۔اس لئے ہمالہ سے خاک ہند کا جو مقدس تصور اقبال کی شاعری میں ابھرتا ہے وہ آخری زمانے تک اسی آب تاب کے ساتھ باقی رہتا ہے۔اس لئے وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اقبال ہندوستان کا شاعر ہے۔اس حقیقت کے باوجود کہ اقبال کے ترانہ ملی لکھی حق بجانب ہیں

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

۲۔وطنیت کا یہ تصور غیر مسلموں میں ہی نہیں بلکہ پان عرب ازم کی صورت میں خود مسلمانوں میں بھی موجود تھا،اور یہ بات قرآنی نقطہ نظر سے انتہائی گمراہ کن ہے۔اس لیے اس کی تکذیب اقبال نے ضروری سمجھی۔ اب اگر ہم ترانہ ملی کا مطالعہ کریں کو اقبال کے اصلی منشاء کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور یہ غلط فہمی خود بخود دور ہو جاتی ہے کہ ترانہ ہندی کے بعد ترانہ ملی لکھ کر اقبال نے خود اپنی تردید کی ہے۔یا یہ کہ اقبال نے ہندوستانی وطنیت سے دستبرداری اختیار کی اور یہ کہ اقبال نے مسلمانوں میں تنفر کے جذبات پیدا کیے۔ یہ سارے الزامات محض مفروضہ کے نتیجہ اور بے بنیاد ہیں۔اقبال کے لئے سنت ابراہیمی کی تکمیل ضروری تھی۔ چنانچہ اسی سنت کی تکمیل میں انہوں نے ترانہ ملی مسلمانوں کو سنایا۔

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا　　ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میر حجازؐ اپنا　　اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا　　ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اور یہ کارواں کن کن منزلوں سے ہو کر گزرے گا۔

تو ابھی رہگزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر　　مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

اصل میں رنگ و نسل، ذات پات اور وطن کے خلاف اسلام نے آواز اٹھائی تھی اور سارے ہی انسانوں

کوایک اللہ کی مخلوق اورایک آدم کی اولاد قرار دیکر رشتہ اخوت اور بھائی چارگی کواستوار کیا تھا۔ بھلا ایسے میں اقبال کو یہ کیسے گوارا ہوتا کہ مسلمان رنگ ونسل اور وطن کے جذبات کے تابع ہوکر منتشر ہو جائیں۔ اقبال نے وطنیت کے جذبہ کی جونفی کی ہے وہ مقامی حیثیت سے نہیں بلکہ آفاقی اور عالمی حیثیت سے کی ہے۔

## 4.7 فرہنگ

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| منشا | ارادہ |
| مخفی | پوشیدہ |
| راہ گذر | راستہ |
| منتشر | بکھرا ہوا |
| استوار | قائم کرنا، مضبوط رکھنا |

## 4.8 کتب برائے مطالعہ

1۔ڈاکٹر وزیر آغا، تصورات عشق وخرد۔اقبال کی نظر میں، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان 1987ء
2۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال لاہور بزم اقبال 1988 (دسواں اور گیارہواں باب)
3۔ڈاکٹر یوسف حسین خان، روح اقبال۔لاہور آئینہ ادب 1969 (پہلے باب میں عشق اور عقل
4۔ڈاکٹر میر ولی الدین، رموزِ اقبال لاہور کتاب منزل 1950ء (اقبال کا نظریۂ عشق وعقل)

# اکائی 5 :علامہ اقبال کا ملی،فنی،سماجی اورادبی شعور

ساخت


5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 اقبال کی شاعری میں ملی،فنی،سماجی وادبی شعور

5.4 اپنا امتحان خود لیجیے

5.5 سوالات کے جوابات

5.6 فرہنگ

5.7 کتب برائے مطالعہ


## 5.1 اغراض ومقاصد

.1۔اس اکائی کے ذریعہ آپ علامہ اقبال کے ذہنی ارتقا سے واقف ہوں گے۔

۲۔علامہ اقبال کے فنی وفکری ارتقا کا علم ہوگا۔

۳۔اسلامی فکر اور اقبال کے نظریات سے روشناس ہوں گے۔

## 5.2 تمہید

اقبال صرف ایک صاحبِ فکر نہیں بلکہ دانشوارانہ ذہن کے حامل شاعر تھے۔وہ مشرق ملتِ اسلامیہ، ہندوستان اور علمِ انسانیت کی حریت و اخوت اور اس مقصد کے لیے آفاقی نشاۃ الثانیہ کے علم بردار تھے۔ان کے علمی مقالات وخطبات، ذاتی مکاتیب اور وعوامی بیانات اس کی شہادت دیتے ہیں۔یہ طے ہے کہ ادب ایک روحانی سرگرمی،تخلیقی کارنامہ اور تہذیبِ انسانی کا مخرج ہے۔فنی تخلیق بے شمار تجربوں اور بصیرتوں کا نچوڑ ہوتی ہے۔اس پر دوسرے حالات کے ساتھ ساتھ سماجی،اقتصادی صورتِ حال بھی اثر انداز ہوتی ہے۔چونکہ ادیب اپنے عہد اور معاشرے کا حساس انسان ہوتا ہے۔لہذا وہ زندگی کے حقائق اور تاریخی و ادبی تصورات کا دوسرے افراد کی نسبت زیادہ قوی شعور رکھتا ہے۔

## 5.3 ملی،اسلامی،سماجی،فنی اورادبی شعور

**اقبال کا ادبی شعور:**

اقبال کی فکر مذہب اور فلسفے کے اشتراک سے وجود میں آئی۔لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ قدامت پسند تھے۔یا انہیں تقلید و ماضی پرستی سے کوی علاقہ تھا۔بلکہ وہ ہر واقعے کو عقل،علم اور منطق کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔وہ تحرک اور تبدیلی کو ضروری گردانتے تھے۔اور ہر لحظہ جدوجہد اور تگ ودو کے قائل تھے۔رک جانا اور جمود کا شکار ہونا ان کے لیے گویا موت کا پیغام تھا۔

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اقبال ماضی سے حاصل شدہ بصیرت کی روشنی میں حال اور مستقبل کے لیے راہِ عمل متعین کرنا چاہتے ہیں۔اس لیے کہتے ہیں،

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

اقبال فنونِ لطیفہ کی جمالیاتی اقدار پر گہری نظر رکھتے تھے۔آرٹ اور اخلاق،آرٹ اور زندگی کے رشتے کے متعلق وہ وسیع زاویۂ نگاہ رکھتے تھے۔وہ تخلیق کے پراسرار عمل میں تاریخ،سائنس،فلسفہ اور مذہب کے حدود کو جانتے تھے۔اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انہیں عناصر کی موجودگی میں فن لامحدود ہو جاتا ہے۔اقبال کے افکار ماضی کی اعلی روایات،انسان کے سفر کی بصیرت،اسلام کی تیز تر روشنی،یورپ کے افکار و خیالات،اور ایشیا کے تہذیبی روایات کا خوب صورت امتزاج ہیں۔ماضی کے تجربوں،موجودہ صدی کے حالات اور انسانی شکست و ریخت سے ان کے ذہن کا گہرا رشتہ ہے۔انسان کیا ہے؟اس کا مقام اور دائرہ کار کیا ہیں؟اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے؟یہ وہ سوالات ہیں جو ازل سے انسان کے سامنے طرح طرح سے درپیش رہے۔وہ ماضی کے فنکاروں کے تجربوں کو اپنی تخلیقی بصیرت کی موجودگی میں نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔اقبال کے سامنے دو طرح کے مکتبہ ہائے فکر تھے۔ایک طرف تو وہ ادب جس میں آسانی،خود فراموشی اور غلامانہ ذہنیت،خودی اور اخلاقی اقدار کی گراوٹ اور آزادی فکر کی کمی جیسے مضامین تھے۔دوسری طرف ایسا ادب جو اعلی انسانی روایات اور اخلاقی اقدار سے آراستہ و پیراستہ تھا۔لہذا انہوں نے اپنی شاعری میں اخلاق و آزادی،جذبہ و عمل،قوت و سطوت،احساسِ خودداری،نگاہ شوق،ذوقِ نظر،سوزِ حیات اور عظمت انسان کے موضوعات بیان کیے ہیں۔

اقبال کے ادبی شعور میں دنیا بھر کے نامور مفکرین،شعرا،ادبا و حکما اور مذہبی رہنماوں سے استفادے کی روایت ملتی ہے۔اقبال کا مطالعہ وسیع ہونے کے سبب نہ صرف ہندی بلکہ عربی،فارسی،اور فرنگی ادبیات کے اسرار و رموز سے بھی پوری طرح واقف تھے۔وہ کلاسیکی ادبی روایت کے پیچ وخم سے آشنا تھے۔خصوصا اقبال کو فارسی سے نسبتِ خاص تھی۔اسی لیے انہوں نے فارسی کے بہترین خیالات کو اردو میں منتقل کیا اور ایران و عرب تہذیب و

تمدن کو بھی شاعری میں پیش کیا۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اقبال کا مرتبہ بطور شاعر اردو زبان و ادب میں ہی بلند نہیں ہے بلکہ وہ دنیا کے عظیم شاعروں کے ہم پلہ ہیں۔ اقبال نے اردو شاعری کو نئی جہت اور نئی روایت دی، ان کی شاعری کا انداز بالکل نیا تھا اس لیے اقبال کو اپنی شاعری کے لیے نئی زبان وضع کرنا پڑی۔ کیونکہ اقبال کو کارنامہ اردو شاعری میں انجام دینے والے تھے وہ ان سے پہلے کسی اور شاعر نے انجام نہ دیا تھا۔ اقبال کی شاعری با مقصد شاعری تھی۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے وہ اپنی شاعری کے ذریعہ قوم کو پیغام دینا چاہتے تھے ان کی شاعری فقط واردات کا بیان نہ تھی۔ اقبال ایک اجتماعی مشن رکھتے تھے اس لیے ان کی شاعری کے موضوعات بھی بالکل نئے تھے۔ ان موضوعات کے لیے زبان ولب و لہجہ بھی نیا اپنانا پڑا۔ لہذا انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز اردو زبان سے کیا۔ اقبال کو اردو زبان سے بہت محبت تھی وہ اسے ہندوستان کی زبان سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اردو زبان کا خمیر عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے الفاظ سے تیار ہوا تھا۔

اقبال نے اردو شاعری کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی یہ کہنے پر مجبور ہوے کہ اقبال نے فن کے رموز، زبان کی اہمیت اور شاعری میں فکر، جذبہ اور تخیل کے مقامات پہچانے میں بہت ریاض کیا۔ انہوں نے اردو شاعری میں ایسا اسلوب اپنایا کہ جس کی مثال پہلے نہ تھی۔ الفاظ اور معنی کا رشتہ پایدار بنیادوں پر استوار کیا۔ روزمرہ اور محورہ، فصیح اور غیر فصیح کا خیال رکھا۔ الفاظ کی ترتیب، قافیہ و ردیف، بحر و عروض نے ان کی شاعری میں نغمگی، موسیقیت اور غنایت پیدا کر دی اس کے ساتھ ساتھ اقبال نے تجربات، مشاہدات اور شاعرانہ تخیل نے ان کے ادبی شعور کو نکھار دیا۔

اقبال کے ذہنی و فکری ارتقا کی منازل کا تعین ان کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے کیا جاتا رہا ہے۔ کیونکہ اقبال نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کا ذریعہ شاعری ہی کو بنایا ہے۔ علامہ اقبال کے فنی ارتقائی دور بھی چار دور رہے ہیں۔

۱۔ پہلا دور از ابتدا ۱۹۰۵ یعنی اقبال کے بغرض تعلیم یورپ جانے تک کی شاعری

۲۔ دوسرا دور ۱۹۰۵ تا ۱۹۰۸ یعنی اقبال کے یورپ سے واپس آنے کے بعد۔

۳۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ تا ۱۹۲۴ بانگِ درا کی اشاعت کی شاعری

۴۔ چوتھا دور ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۸ بانگ درا کی اشاعت سے اقبال کی وفات تک کی شاعری

علامہ کی شاعری میں مشرقیت کے ساتھ ساتھ مغربی افکار و فنی عناصر کی آمیزش ملتی ہے۔ اقبال کی ابتدائی دور کی نظمیں اس لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہیں کہ ان میں اقبال کے فلسفہ خودی کے عناصر اپنی ابتدائی اور خام

شکل میں موجود ہیں۔یہی عناصر نے آگے چل کر مربوط ومنظّم ہوکر ابتدای صورت حاصل کرلی۔اقبال کے فلسفہ خودی میں انسان کی فضیلت،استعداد اور صلاحیتوں پر زور دیا گیا ہے۔

خودی کا دوسرا بڑا عنصر عشق اور عقل کی معرکہ آرائی ہے جس میں عشق کو برتری حاصل ہے۔نیز اس کا ایک اور اہم عنصر زندگی کی جہدِ مسلسل ہے۔

اقبال کے یہاں فطرت نگاری جابجا ہے انہوں نے اپنے فن کا عروج فطری شاعری کے ذریعے پیش کیا ہے۔تشبیہات،استعارات اور تخیل کی بہترین عکاسی اقبال کے شاعری کی نمایاں خوبی ہے۔

**ملی اسلامی شعور:**

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا گہرا ادراک واحساس تھا۔اور اس عظمت کے کھو جانے کا شدید ملال تھا۔مگر وہ اس پر ماتم نہیں کرتے تھے بلکہ مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام یاد کراتے تھے۔نیز یہ مقام پھر سے حاصل کرنے کا ولولہ وحوصلہ دیتے ہیں۔علامہ اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ ملتِ اسلامیہ کے عظمت کی بحالی کے عزم سے مزین ہے۔علامہ نے ملتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے،باوقار قوم کی طرح جینے کا ہنر وحوصلہ دیا ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی

علامہ نے اردو سے زیادہ فارسی کلام لکھا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی شعوری کوشش یہی تھی کہ ان کا پیام ہندوستان کی سرحدوں سے باہر نکل کر مسلمانانِ عالم تک رسائی حاصل کر سکے کیونکہ یہ پیام پوری امت کے لیے ہے۔ہندوستان کے فارسی داں طبقے کے علاوہ ایران،افغانستان،ترکی اور تاجکستان سمیت دنیا کے کئی خطوں میں فارسی پڑنے والے موجود تھے۔

علامہ کے کلام کا بڑا حصہ ملتِ بیضا اور مردِ مومن سے متعلق ہے۔انہوں نے امت کی بے بسی،پسماندگی،معاشی،سیاسی اور عمرانی کسمپرسی شدت سے محسوس کی۔ان کا ادراک اور امت کا درد ان کے کلام میں جابجا نظر آتا ہے۔انہیں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ یاد آتی ہے تو ان کے دل سے کسک اٹھتی ہے۔

کیا سناتا ہے مجھ کو ترک وعرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز وساز
ہوگیا مانندِ آب ارزاں مسلمانوں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

ایک صدی قبل جب اقبال نے مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے اس وقت حالات اس لحاظ سے

مزید برتر تھے۔کہ بیشتر اسلامی ممالک براہِ راست یورپی اقوام کے زیرِ تسلط تھے۔خلافت کا قلع قمع کر کے ان کی مرکزیت ختم کردی گئی تھی۔عالمِ اسلام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک غلامی کی زنجیریں کھنک رہی تھیں۔یہ تمام حالات علامہ اقبال کے روبرو تھے۔ان سے نالاں ہوکر اور خود مسلمانوں کے طرزِ عمل سے مایوس ہوکر انہوں نے لکھا:

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں

ان حالات میں علامہ نے امتِ مسلمہ کو جگانے کا فریضہ ادا کیا اور انہیں آزادی کی قدر و قیمت کا احساس دلایا۔

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات

علامہ نے نہ صرف آزادی اور غلامی کا فرق بتایا بلکہ غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے کا ہنر بھی سکھایا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اسلام کی سربلندی کے لیے علامہ اقبال کے بے تاب جذبوں اور مضطرب تمناوں کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انہیں اسلام کی حقیقت کے ساتھ، اسلام کے روشن مستقبل پر بھی کامل یقین تھا۔بیسویں صدی کے آغاز میں اسلام کی طرف سے غلبہ اسلام کی یہ نوید دیوانے کا ایک خواب معلوم ہوتی تھی یا محض ایک شاعرانہ تعلّی۔مگر اقبال کو ایک عالم گیر اسلامی انقلاب پر کامل یقین تھا، جس کا واشگاف اظہار انہوں نے نثر میں بھی کئی جگہ کیا ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہوجائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی

علامہ اقبال کی شاعری کا مرکزی موضوع انسان اور کائنات ہے۔انہوں نے نوعِ انسان کی عظمت کو مذہب اور فلسفے کے آئینے میں مختلف زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ان کا ایقان ہے کہ انسان کے دستِ تصرف میں قدرت کی تخلیق کردہ ہر شئے ہے اور وہ تسخیرِ کائنات، خلیفہ فی الارض، مسجود ملائکہ، شاہین، شہ لولاک اور

قدرت کا راز دان بھی ہے۔لہذا انہوں نے نوعِ انسان کی رفعتوں کی مطمحِ نظر رکھتے ہوئے اپنی شاعری میں مرکزی اہمیت دی۔اور اسے منتہائے کمال تک پہنچنے کے اسرار و رموز کے ساتھ ساتھ خود شناسی و خودداری، عزتِ نفس، جہد و عمل اور مقصدِ حیات کا احساس دلانے کی بھرپور سعی کی۔فرماتے ہیں۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

**سماجی شعور**

ڈاکٹر نکلسن کے نام ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ کے خط میں علامہ اقبال نے لکھا کہ میری شاعری اور ساری جستجو کا مقصد یہ ہے کہ عالمی سماجی تشکیلِ نو کی جائے۔اور میں نے اپنی شاعری میں اسلام کے اقدار و تعلیمات کو پیشِ نظر رکھا ہے کیونکہ عقلاً یہ بات محال ہے کہ اس کی کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام کو نظر انداز کر دیا جائے جس کا واحد مقصد ذات پات، مرتبہ درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔اقبال نے یہ خط نکلسن کو اس وقت لکھا جب نکلسن اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے انگلستان میں مقبول ہونے کے بعد وہاں اقبال کے بنیادی تصورات کے بارے میں مغالطے بھی پیدا ہونے شروع ہوئے۔مثلاً (دی ایتھینیم) میں پبلش ہونے والے ایک مضمون میں علامہ اور نطشے کے خیالات اور ان کے انسانِ کامل اور نطشے کے فوق البشر کے تصور میں مماثلت و مشابہت تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔اقبال نے اس خط میں اس کی تردید کی، کہ انہوں نے اپنا انسانِ کامل کا تصور نطشے کے زیرِ اثر تشکیل دیا ہے۔اقبال نے اس خط میں بڑے واضح طور پر لکھا کہ ان کا فکر و فلسفہ قرآنِ حکیم اور مسلمان صوفیہ کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔

ہم آج سماجی سطح پر انتشار اور افتراق کا شکار ہیں۔اس انتشار کے اثرات ہماری فکری و سماجی زندگی دونوں پر ہیں۔دین کی بنیادی تعلیمات کی تعبیر میں غلطی کی وجہ سے ہماری کوششیں اجتماعی سطح پر تعمیر کے بجائے تخریب میں صرف ہو رہی ہیں۔دنیا جس جنگ و جدل کے ماحول سے دوچار ہے ہر صاحبِ فکر اس کے خاتمے کی تمنا کرتا ہے۔علامہ نے یکم جنوری ۱۹۸۳ء کو نئے سال کے پیغام میں فرمایا کہ (ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاہدے، لیگیں، پنچایتیں اور کانفرنسیں، دنیا کی جنگ و جدال اور خون ریزیوں سے نجات نہیں دے سکتی۔ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان لیگوں اور کانفرنسوں اور معاہدوں کے ذریعے سے طاقتور قومیں کمزور قوموں کو اپنا ظلم و ستم کا شکار بنانے کے

لئے زیادہ پرامن وسائل اختیار کرلے گی۔

ضربِ کلیم کی ایک نظم میں علامہ نے مجلسِ اقوامِ متحدہ جیسے اداروں کے بارے میں انہیں خیالات کا اظہار کیا۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
مکہ نے دیا خاکِ جینوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

یعنی انسانیت کی نجات جمعیتِ اقوام میں نہیں بلکہ جمعیتِ آدم میں ہے۔اس کے لئے ان کی آرزو رہی

طہران ہو اگر عالمِ مشرق کا جینوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

ایک ایسا شخص ہی اقبال کا مردِ کامل ہے اور اس مردِ کامل کی نمود ایک ایسے معاشرتی نظام سے ہوسکتی ہے جو اپنے مزاج کے لحاظ سے آفاقی ہو۔اور انسانی ضمیر کو اپنا مخاطب بنانے کی اہلیت رکھتا ہو۔اقبال کہتے ہیں کہ یہ معاشرتی نظام اسلام ہے۔کیونکہ انسانیت کے عالم گیر نصب العین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔اور اسلام اس عقیدہ کا سب سے بڑا دشمن ہے۔اگر مسلم دنیا عالم گیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے نسل،علاقے،جغرافیائی حدود اور قومیت کے عقیدے کو اپنا لے گی تو ایک ابلیسی اور گمراہ کن عقیدے کو اپنا لے گی۔اقبال نے مسلمانوں کے اس عالم گیر نصب العین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ انسانیت کی فلاح ان انجمنوں،عہد ناموں اور لیگوں میں نہیں جو اس دنیا میں پیامِ امن کے لیے قائم رکھی ہے۔بلکہ انسانی فلاح تمام انسانوں کی مساوات اور حقیقی حریت میں ہے۔جبکہ جدید جمہوری افکار اور نظام اس سے عاری ہے

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن،اندروں چنگیز سے تاریک تر!

فکرِ اقبال ہمیں اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ ہم عالم گیر اخوت کے قیام کی جدوجہد کرتے ہوئے انسانیت کو باہمی افتراق،عدم برداشت اور انتہا پسندی کے ماحول سے نجات دلائے

ہوس نے کردیا ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا،محبت کی زباں ہوجا

## 5.4 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔اس اکائی کے ذریعہ آپ کو اقبال کی شاعری میں اسلامی شعور سے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔

۲۔اقبال اور ملتِ اسلامیہ سے آگاہی ہوئی۔

۳۔علامہ اقبال کی شاعری میں سماجی عناصر کے بارے میں علم حاصل ہوا۔

## 5.5 سوالات وجوابات

۱۔علامہ اقبال کا سماجی شعور بیان کیجیے؟

۲۔علامہ اقبال کا ملی شعور بیان کیجیے؟

۱۔ ڈاکٹر نکلسن کے نام ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء کے خط میں علامہ اقبال نے لکھا کہ میری شاعری اور ساری جستجو کا مقصد یہ ہے کہ عالمی سماجی تشکیلِ نو کی جائے۔اور میں نے اپنی شاعری میں اسلام کے اقدار وتعلیمات کو پیشِ نظر رکھا ہے کیونکہ عقلاً یہ بات محال ہے کہ اس کی کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام کو نظر انداز کر دیا جائے جس کا واحد مقصد ذات پات، مرتبہ درجہ، رنگ ونسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔اقبال نے یہ خط نکلسن کو اس وقت لکھا جب نکلسن اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے انگلستان میں مقبول ہونے کے بعد وہاں اقبال کے بنیادی تصورات کے بارے میں مغالطے بھی پیدا ہونے شروع ہوئے۔مثلاً (دی اتھینیم) میں پبلش ہونے والے ایک مضمون میں علامہ اور نطشے کے خیالات اور ان کے انسانِ کامل اور نطشے کے فوق البشر کے تصور میں مماثلت و مشابہت تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔اقبال نے اس خط میں اس کی تردید کی، کہ انہوں نے اپنا انسانِ کامل کا تصور نطشے کے زیرِ اثر تشکیل دیا ہے۔اقبال نے اس خط میں بڑے واضح طور پر لکھا کہ ان کا فکر وفلسفہ قرآنِ حکیم اور مسلمان صوفیہ کے افکار ومشاہدات سے ماخوذ ہے۔

ہم آج سماجی سطح پر انتشار اور افتراق کا شکار ہیں۔اس انتشار کے اثرات ہماری فکری وسماجی زندگی دونوں پر ہیں۔دین کی بنیادی تعلیمات کی تعبیر میں غلطی کی وجہ سے ہماری کوششیں اجتماعی سطح پر تعمیر کے بجائے تخریب میں صرف ہورہی ہیں۔دنیا جس جنگ وجدل کے ماحول سے دوچار ہے ہر صاحبِ فکر اس کے خاتمے کی تمنا کرتا ہے۔علامہ نے یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو نئے سال کے پیغام میں فرمایا کہ (ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاہدے، لیگیں، پنچایتیں اور کانفرنسیں، دنیا کی جنگ وجدال اور خون ریزیوں سے نجات نہیں دے سکتی۔ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ان لیگوں اور کانفرنسوں اور معاہدوں کے ذریعے سے طاقتور قومیں کمزور قوموں کو اپنا ظلم وستم کا شکار بنانے کے لئے زیادہ پرامن وسائل اختیار کرلے گی۔

'ضربِ کلیم' کی ایک نظم میں علامہ نے مجلسِ اقوامِ متحدہ جیسے اداروں کے بارے میں انہیں خیالات کا اظہار کیا۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
مکہ نے دیا خاکِ جینوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

یعنی انسانیت کی نجات جمعیتِ اقوام میں نہیں بلکہ جمعیتِ آدم میں ہے۔اس کے لئے ان کی آرزو رہی

طہران ہو اگر عالمِ مشرق کا جینوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

۲۔حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا گہرا ادراک و احساس تھا۔اور اس عظمت کے کھو جانے کا شدید ملال تھا۔مگر وہ اس پر ماتم نہیں کرتے تھے بلکہ مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام یاد کراتے تھے۔نیز یہ مقام پھر سے حاصل کرنے کا ولولہ وحوصلہ دیتے ہیں۔علامہ اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ ملتِ اسلامیہ کے عظمت کی بحالی کے عزم سے مزین ہے۔علامہ نے ملتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے، باوقار قوم کی طرح جینے کا ہنر وحوصلہ دیا ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی

علامہ نے اردو سے زیادہ فارسی کلام لکھا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی شعوری کوشش یہی تھی کہ ان کا پیام ہندوستان کی سرحدوں سے باہر نکل کر مسلمانانِ عالم تک رسائی حاصل کر سکے کیونکہ یہ پیام پوری امت کے لیے ہے۔ہندوستان کے فارسی داں طبقے کے علاوہ ایران،افغانستان،ترکی اور تاجکستان سمیت دنیا کے کئی خطوں میں فارسی پڑنے والے موجود تھے۔

علامہ کے کلام کا بڑا حصہ ملتِ بیضہ اور مردِ مومن سے متعلق ہے۔انہوں نے امت کی بے بسی،پسماندگی،معاشی،سیاسی اور عمرانی کسمپرسی شدت سے محسوس کی۔ان کا ادراک اور امت کا درد ان کے کلام میں جابجا نظر آتا ہے۔انہیں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ یاد آتی ہے تو ان کے دل سے کسک اٹھتی ہے۔

کیا سناتا ہے مجھ کو ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز وساز
ہوگیا مانندِ آب ارزاں مسلمانوں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانایے راز

## 5.6 فرہنگ

| | |
|---|---|
| کسمپرسی | بدحالی، پریشانی |
| انتشار | بکھرنا۔منتشر ہونا |
| اخوت | بھائی چارہ،محبت |
| تخریب | فساد |

## 5.7 کتب برائے مطالعہ

| | |
|---|---|
| 1 ۔میزان اقبال | پروفیسر محمود منور |
| 2 ۔اسلوبیاتِ اقبال | طارق سعید |
| 3۔اقبال کی شاعری میں فکری وفنی عناصر | urdunotes.com |
| 4۔ اقبالیاتی جائزے | پروفیسر منظر حسین |

# اکائی 6 :مابعدالطبیعاتی تصورات

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 اقبال کے مابعدالطبیعاتی تصورات

6.3.1 خودی

6.3.2 بےخودی

6.4 آپ نے کیا سیکھا

6.5 اپنا امتحان خود لیجیے

6.6 سوالات کے جوابات

6.7 فرہنگ

6.8 کتب برائے مطالعہ

## 6.1 تمہید

اقبال کے فلسفیانہ تصورات کا محوران کا فلسفہ خودی ہے۔اس یونٹ میں ہم اقبال کے تصور خودی کے معنی و مفہوم اور مدارج پر بحث کریں گے اور کوشش کریں گے کہ آپ اقبال کے اس اہم ترین فلسفیانہ نکات کو ان کی تمام ترجیہات و جزئیات سمیت سمجھ سکیں۔ اقبال کے فلسفہ خودی کی با قاعدہ پیش کش کا عنوان تو ان کی فارسی تصنیف اسرار خودی ہے لیکن ان کی فارسی اور اسی طرح اردو شاعری میں بھی جابجا ان کے مقالات وخطبات اور بعض مکاتیب میں بھی خودی کی وضاحتیں موجود ہیں۔ مطالعہ خودی کے وقت ہمیں ان مآخذ کی طرف بھی دھیان دینا ہوگا۔

## 6.2 اغراض ومقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہوسکیں گے کہ

1۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کے معنی ومفہوم اور مآخذ سے واقفیت حاصل کرسکیں۔

2۔ خودی کے معنی ومطالب، تربیت اور مدارج سے آگاہ ہوسکیں۔

3۔ خودی کو کمزور کرنے اور تقویت دینے والے عناصر کو جان سکیں۔

4۔ خودی کے حامل افراد و اقوام کی زندگی پر اثرات کا جائزہ لے سکیں۔

5۔ خودی اور بے خودی کے ربط و تعلق سے واقف ہو سکیں۔

### 6.3.1 علامہ اقبال کا تصورِ خودی

ایک صدی پہلے یعنی بیسویں صدی کے پہلے سال اقبال کی شاعری عوام کے سامنے آنے لگی۔ اگر علامہ اقبال کی شاعری کی بات کی جائے تو 37 برسوں کا یہ شعری سفر کم از کم ایک جہان معنی پر پھیلا ہوا ہے۔

اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کوئی شاعر تنوع افکار اور ثروت تصورات میں اقبال کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فلسفہ جدید اور فلسفہ قدیم تصوف اسلامی اور غیر اسلامی کے تمام انواع مذاہب عالم کے گونا گوں تصورات معاشرتی سیاسی اور اخلاقی مسائل، فکر اور عمل کے تمام قدیم اور جدید تحریکات ان تمام چیزوں کو اقبال نے اپنی شاعری کے غم میں غوطہ دے کر انسانوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ (رومی، نطشے اور اقبال۔ خلیفہ عبدالحکیم)

مقام اقبال کے تعین کے لیے ابھی یہ صرف عمومی مطالعہ ہے۔ اقبال کی فکریات کی پیشکش جس شاعرانہ ہنر اور اسلوب میں سے کی گئیں ان کا مطالعہ تو حیرت اندر حیرت کی کیفیات لئے ہوئے ہے کہ لفظ و معنی کا یہ دروبست بھی تازہ ہے لفظ کے استعمال کی یہ سطح بھی نئی اور تشکیل لفظی کی یہ صورت بھی اچھوتی ہے۔

اقبال صاحب پیغام شاعر ہیں اور ان کے پیغام یا فلسفے کی کنجی ان کا تصور خودی ہے اگر چہ اقتصادیات پر ان کی کتاب شروع ہی میں یعنی 1904ء ہی میں چھپ چکی تھی پھر بھی 1922ء میں پڑھی گئی ان کی نظم خضر راہ ہی سے ان کی شاعری کا معاشی پیغام اعلان میں آتا ہے بلکہ جب کہ عزیز احمد نے کہا اقبال کی شاعری کا انقلابی دور شروع ہو جاتا ہے خودی کا تصور بھی ان کے ہاں آغاز ہی سے ملنے لگتا ہے جب انہوں نے کہا کہ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے تو خود آگاہی ان کا تب بھی سوال تھا تاہم پوری ترتیب کے ساتھ یہ تصور ان کی کتاب اسرار خودی میں ظاہر ہوا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کہتے ہیں کہ خودی کا تصور اقبال کے فلسفہ حیات و کائنات کی بنیاد ہے اکثر لکھنے والوں مثلاً مولانا صلاح الدین احمد، عبدالمجید سالک اور قاضی محمد ظریف وغیرہ نے سادہ لفظوں میں خودی کو انسان کا وہ جوہر ذاتی قرار دیا ہے جو ایک طرف ہر فرد کی خصوصی پہچان بنتا ہے اور دوسری طرف اس کی قوت عمل۔ خالق کائنات نے ہر انسان کو دوسرے سے مختلف جوہر ذات عطا کیا ہے۔ طبائع سے شخصیت تک انسانی اختلاف اور رنگارنگی اتنا پھیلا کر رکھتے ہیں کہ روز اول سے آج تک کوئی دو انسان ایسے نہیں گزرے جن کے انگوٹھوں کے نشان ایک سے رہے ہوں۔ اس خالق حکیم کی بخشی ہوئی اس بوقلمونی نے ہر کسی کو ایک خاص صلاحیت خاص توفیق اور خاص جوہر سے نوازا اسی جوہر کی پہچان خودشناسی ہے۔ اس جوہر کو ترقی دینا گویا اپنی پوری توفیق اور تمام صلاحیت کار کو بروئے عمل لے آتا ہے۔ اقبال کا تصور خودی اسی جوہر کی تربیت اور پھر اس کی نمود پر زور دیتا ہے۔ افراد کی

خودی کو آگے چل کر اپنی قوم کی مجموعی خودی کا حصہ بننا ہوتا ہے جسے اقبال بے خودی کہتے ہیں۔ بے خودی سے ہی معاشرتی اتحاد اور قومی مزاج کی شکل بنتی ہے۔ سب اقوام اپنی خودی ہی کی نمود سے اپنی شناخت پاتی ہیں۔ خودی کا یہ تصور اگر 1940ء میں برصغیر کے مسلمانوں کی خصوصی پہچان کے کام آیا تھا تو آج اس خودشناسی کی ضرورت ان ساری اقوام کو ہے جنہیں مغربی کلچر کی شدید ترین یلغار نے اپنی پہچان سے محروم کر دینے کا عملاً آغاز کر دیا ہے۔ خودی ہر قوم کی ضرورت ہے اور ہر عہد اس کی اہمیت پہلے سے بڑھ کر پائے گا۔

اقبال نے قومی زوال کو دیکھا تو سوچا کہ یہ انا (میں) یا خودی جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور نمایاں ہے مگر اپنی حقیقت میں چھپی ہوئی پستی ہے کیا شے ہے؟ کیا یہ ایک لازوال صداقت ہے یا زندگی کا اوڑھا ہوا کوئی لبادہ ہے؟ مشرقی دانشوروں نے ہستی ہی کو دھوکہ سمجھ رکھا تھا۔ شعور کو کہاں گردانتے، خودی کو کیا سمجھتے۔

## عالمِ شرق میں خودشناسی کی روایت

اسرار خودی کے دیباچے میں علامہ نے خود ارشاد کیا کہ خودی شعور کا وہ نکتہ مستند ہے کہ جس سے عمل کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ خودی اس خودشناسی سے عبارت ہے جو بذاتہ عمل آمیز ہے۔ مسلمانوں کی بے عملی کے علاج کے لیے مسئلہ "انا" کی حقیقی تصویر دکھانا کیوں ضروری تھا۔ اقبال سے سنیے۔

مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب مماثلت ہے وہ یہ کہ جس نکتہ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی اسی نکتہ خیال سے شیخ محی الدین عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی۔ جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ ان تھک مفسر تھے اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عصر بنا دیا۔ وحید الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام مذہبی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل و مافی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ انہوں نے جزو و کل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے چراغ میں خون آفتاب اور شرار سنگ میں جلوۂ طور کا مشاہدہ کیا۔

## برِصغیر میں وحدت الوجود

ہندو حکما نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعرا نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا۔ یعنی انہوں نے دل کو اپنی آماجگاہ بنا دیا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تمام اسلامی قوم کو ذوق عمل سے محروم کر دیا۔ اس تصویر نے ایک طرف جہاں موجود کو غیر حقیقی کہہ دیا جسے حضرت ابراہیم نے بحوالہ قرآن ان الفاظ میں حقیقت کہا تھا کہ ربنا ما خلقت ہذا باطلا، اے ہمارے رب تو نے یہ جھوٹ اور دھوکا نہیں بنایا) دوسری طرف انسان جو خود مسجود کائنات

تھا اس کے وجود کو دھوکا اور غیر حقیقی قرار دے کر عمل کی بنیاد ہی غارت کر دی۔ خودی کے تصور کی اصلاح کے بغیر حرکت اور عمل کا پیغام دیا ہی نہ جا سکتا تھا۔ اقبال کہتے ہیں کہ کائنات کی اصلیت ایک عظیم وجود بے حسی کے اندر شعور اور ارادے کی قوتیں ہیں۔ ان قوتوں کو حرکت میں لانے کے لیے اس نے اپنے آپ کو خود اور غیر خود میں (فلسفیانہ لفظوں میں موضوع اور معروض میں تقسیم کر دیا۔ یہ غیر خود خودی کے مشاہدے کے لیے آئینے کا کام کرتا ہے خودی اپنی ترقی کے راستے پر غیر خود سے ٹکراتی چلی جاتی ہے۔ ارتقاء کے اس سلسلے کی آخری کڑی انسانی ذات ہے یہ انسانی ذات محترم ہے۔ آدمیت احترام آدمی باخبر شواز مقام آدمی۔ انسان کی خودی اس کو اہمیت عطا کرتی ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے　　خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

یوں بھی کہا کہ:

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات　　خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی　　ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر　　ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے　　فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اپنی خودی کا شعور انسانی زندگی کا نقطہ آغاز ہے انسان زندگی کا مقصود خودی کو مستحکم تر کرتے جاتا ہے۔ یہ استحکام عمل مسلسل سے نصیب ہوتا ہے۔ یہ عمل غیر خود کے ساتھ مسلسل مصاف اور مقابلہ ہے۔ رکنا یہاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ دائمی حرکت و عمل ہے۔ خودی اس جہاں کی تسخیر کے بعد اور جہان بھی رکھتی ہے، جن کا نہیں کوئی نام لیکن وہ اس زقند میں آتے ہیں۔

تری آگ اس خاک داں سے نہیں　　جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر　　طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا　　ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

عشق اس شعر کا رہنما ہے۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

مرد خدا کے عشق کے ہاتھوں انجام پانے والے کام بھی لافانی ہو جاتے ہیں

ہے مگر اس نقش میں رنگِ حیات دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

یہ خودی سوال کرنے اور مانگنے سے کمزور ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کہتے ہیں کہ:

''خودی کی غیر محدود قوت تعمیر و تخریب دونوں کام کر سکتی ہیں۔ خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لئے توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی تادیب و تربیت بھی ضروری ہے۔ بے قید و بے تربیت خودی کی مثال شیطان ہے جس کے متعلق اقبال کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے وہ بھی گوئٹے کی طرح اسے خودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں جو محبت اور اطاعت کی راہ مستقیم سے بھٹک گئی۔''

**خودی کی تربیت کے مدارج**

تہذیب خودی اور تربیت خودی کے لیے پہلا قدم اطاعت الٰہی ہے۔ خداوند کریم کی بے چوں و چرا اطاعت خودی کی تہذیب اور تربیت کی بنیاد ہے دوسرا درجہ ضبط نفس کا ہے۔ اس منزل میں انسان کو اپنی خواہشات دنیا کو فتح کرنا اور خوف ہوں و جنس و حرص پر غالب آتا ہے۔ اس کے بعد تیسرا درجہ حاصل ہو جائے گا جو نیابت اعلا کی منزل ہے خدا کا نائب ہونا ہی انسانیت کا مقصود ہے اس مطلوب و مقصود انسان کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں۔

اے سوارِ اشہبِ دواں بیا　　اے فروغ دیدۂ امکاں بیا

(اے زمانہ کے گھوڑے پر سواری کرنے والے اور اے ممکنات کی آنکھ کی روشنی اپنا جلوہ دے)

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات　　ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

دوسرے فلاسفہ کے برعکس اقبال کا مردِ مومن محض خیالی یا تصوراتی خاکہ نہیں بلکہ ایسے مردان مومن سے مسلم تاریخ بھری پڑی ہے۔ آنحضورؐ، انسان کامل کا معیار کامل ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے لفظوں میں:

''اقبال کا مرد مومن یا انسان کامل دراصل ایک طاقتور انسانی شخصیت ہی ہے اور ان کے عشق رسول کا راز بھی یہی تھا کہ وہ آنحضور کو انسان کامل تصور کرتے تھے۔'' (زندہ رود، ص1064)

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

### 6.3.2 بےخودی

خودی کی ترقی کے ساتھ اس کی تربیت جس طرح ملی ہوتی ہے اس طرح خودی اور بےخودی کے مراتب باہم دگر متصل ہیں۔ تربیت یافتہ خودی کے حامل افراد چونکہ کسی نہ کسی معاشرے کے رکن اور سوسائٹی یا سماج کے افراد ہوتے ہیں لہذا الازم ہے کہ معاشرتی نظم وضبط کے لیے وہ اپنے اور اپنے اجتماعی وجود کے درمیان رابطہ پیدا کریں۔ جس کے لیے فرد اپنے مشترکہ معاشرے کی تشکیل کے لیے خود بعض اختیارات سے دستبرداری اختیار کر کے معاشرے کے اجتماعی نفس کے سپرد کر دیتا ہے۔ عام مثال یہ ہے کہ ہم جب مل کر رہنا چاہتے ہیں تو سڑک پر ایک خاص سمت نہ چلنے کی پابندی قبول کرتے ہیں۔ خاص قسم کی رقم اجتماعی مفاد کے لئے ادا کرنا قبول کرتے ہیں۔ افراد معاشرے کی خاطر اسی طرح پابندیاں قبول کر کے اپنی مرکزی حیثیت کو توانا کرنے اور اپنے معاشروں اور ملکوں کو شکل دیتے ہیں۔ اسے اقبال بےخودی قرار دیتے ہیں۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

ڈاکٹر جاوید اقبال کا کہتا ہے کہ:

''اقبال کے ہاں اسلام دراصل انسان کا انکشاف ہے اس لیے ان کے فکر کے انسانی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا پیغام خودی صرف مسلمانوں ہی کے لیے وقف نہ تھا بلکہ ہندوؤں اور ان سب اقوام کے لیے بھی تھا جو پسماندہ تھیں یا مغربی نو آبادیاتی اور استعماری قوتوں کے سیاسی واقتصادی استحصال کا شکار تھیں۔''

(زندہ رود ص9-1058)

چنانچہ علامہ کی آخری زمانے کی کتاب پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، تمام عالم مشرق کی قوموں کے مستقبل اور حال کے مسائل وجود کو زیر بحث لاتی ہے کمزور کی خودی کو توانا کرنے والی صفات اقبال کی نگاہ میں عشق حریت جرات اور فقر ہیں۔ جاوید اقبال' زندہ رود ص1064

اقبال نے جگہ جگہ ان کرداری خواص کی تحسین کی اور انہیں لازم قرار دیا۔ یہ غفاری وقدوسی و جبروت کی عطا ہیں۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

صفات کے لفظ اور لفظوں کے نام بدلتے رہتے ہیں یہی عناصر جداگانہ اقبال کے ہاں یوں بھی بیان

ہوئے کہ ذہن ہی کو اس نے فقر غیور کر دیا۔

ع دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور

بے خودی میں ڈھلنے کے بعد خودی ایک معاشرے کو صورت دیتی ہے۔ اقبال کا پسندیدہ معاشرہ وہی تھا جو اس کے اکابر نے اسلامی شورائیت کی شکل میں متشکل کیا تھا۔ یہ شورائیت بادشاہت اور ڈکٹیٹر شپ سے دور دور کا رشتہ بھی نہیں رکھتی تھی۔ اس کے تمام نہیں تو اکثر راستے جمہوریت کی طرف جاتے ہیں مگر اقبال نے عمومی جمہوری تماشوں پر ہمیشہ طنز کیا۔ خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں۔

''افلاطون کے نزدیک وہ جمہوریت جس میں سقراط جیسے انسان کو مخرب اخلاق اور دشمن انسانیت سمجھ کر زہر پلایا جائے کسی حیثیت سے مستحسن نہیں ہوسکتی۔ نطشے نے اس کے خلاف اس وقت جہاد کیا جب کہ تمام مغرب اس کا فریفتہ تھا۔ اقبال نے بھی ہندوستان میں اس کی حقیقت کو اس زمانے میں پیش کیا جبکہ انگریزی ملوکیت اور انگریزی خیالات کے زیر اثر مشرقی اقوام اس سے مسحور ہو رہی تھیں۔''

(خلیفہ عبدالحکیم رومی نطشے اور اقبال۔ مضمون رسالہ اردو اقبال نمبر 1938ء)

اقبال قومیت کے مادی بنیادوں پر قیام کو انسانیت کے لیے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ وہ ملت کو وطنیت کے مغربی معیاروں سے بلند اور دینی بنیاد پر استوار سمجھتے ہیں۔ جغرافیائی لسانی، نسلی اشتراک سے وطنیت کہیں بلند ہے وہ ایک ستارے کی زبان سے کہلاتے ہیں۔

آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں

یوں ملت کا تصور ان کے ہاں علمی سطح اور دنیوی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ فرد کے لیے بار بار تاکید کرتے ہیں کہ اپنے معاشرے اپنی قوم کے برے دنوں کو دیکھ کر اس سے ربط نہ توڑ لے۔ چمک دمک والی اقوام کا ساتھی بننے سے اسے ترقی نہیں ملے گی۔ اس کی ترقی اس کی اپنی قوم اور ملت سے متعلق ہے۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ وبار سے

## اقوام کی خودی

شاعر و فلسفی کا اولین خطاب اپنے لوگ ہی ہوتے ہیں۔اس کے ہاں مثالیں واقعات اور حوالے اپنی بھی تاریخ سے پھوٹتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ سر تیج بہادر سپرو نے یہی کہا تھا کہ اقبال کے ہاں اسلامی استعارے اور واقعات نیز اسلامی تاریخ کے حوالے انہیں محدود نہیں کر دیتے کیونکہ اس کا خطاب مسلمانوں سے ہوتا ہوا عالم انسانیت کے لیے ہے۔ پیام مشرق کے دیباچے میں علامہ نے کہا:

> ''حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب (جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس وقت اس وجہ سے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں) ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی اضطراب کا پیش خیمہ ہے یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا تھا اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے انّ اللہ لایغیرما بقوم حتیٰ یغیرمابانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی پہلو پر حاوی ہے۔ اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و قوم کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو قابل احترام ہے۔''

اقبال نے مشرق اور مغرب کو اسی عظیم اور صحیح انسانی سیرت کی تولید و تجدید کا پیغام دیا۔ اس انسانی سیرت کی تولید اور تجدید کی صورتیں دنیا نے امت مسلمہ کے ہاتھوں عظیم ترین سطح پر بھی دیکھیں اور اس امت کے ممکنات سے آج بھی یہ عمل بعید نہیں کیونکہ اسلام نے کسی زوال یافتہ بنیاد پر انسانوں کو متحد نہیں کیا تھا وطن یا نسل یا اسلامی دعوت کی بنیاد نہیں بنتے بلکہ انسانوں کا یقین اور فیصلہ ان کے مجتمع ہونے کی بنیاد بنتے ہیں اور یہ آج بھی سب سے جدید ترین نقطہ نظر ہے جو وسائی کو مجتمع کر سکتا ہے۔ ملت کی مقصدیت، مرکزیت اور اس کے مشترکہ قانون کی یک

رنگی سب مل کر اس کو تو انا وحدت میں ڈھال دیتے ہیں۔ اپنی مشترکہ تاریخ اور عظیم روایات ان کی مشترکہ یاداشت بن جاتے ہیں یہ اجتماعی حافظہ ان کی پر افتخار تاریخ بن جاتا ہے۔ تصور خدا اور معنی دعا پر مبنی خطبہ میں خدا کے شخصی وجود کی بات کی اللہ کی ذات انائے بسیط اور وجود مطلق ہے اقبال اللہ کو صاحب وجود کہ کر زمان و مکاں سے ماورا قرار دیتے ہیں۔ اللہ ان کے مطابق ہر گھڑی نے جلوے میں ہے۔ سو متحرک فعال لمحہ یہ ہے۔ اللہ کی حرکت سے وہ اپنے فرد یا مرد مومن میں بھی حرکت کا لازمہ مسلسل دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حرکت سارے جہاں میں موجود ہے۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات　　تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

گویا کہ اب بے خودی کی ایک اور منزل رو برد ہے یعنی جب فرد اور جماعت دونوں انا نے مطلق یعنی ذات الٰہی سے ملاقی ہوتے ہیں اقبال دریا سے اس وصل میں اپنی قطرے والی حیثیت کم نہیں کرتے۔ تخلیق با خلاق اللہ کے مطابق اس قطرے نے اپنی تربیت خدائی راستے پر قدم اٹھاتے ہوئے کی اب:

افلاک سے آتے ہیں نالوں کے جواب آخر
کرتے ہیں خطاب اول اٹھتے ہیں حجاب آخر

نطشے نے کہا تھا ''خدا مر گیا ہے'' اقبال نے کہا:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

ٹھہرتا نہیں کاروان وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

وہ خود اپنی ذات کو بے کنار کرنے کے آرزومند ہیں

تو ہے محیط بے کراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

یہاں وہ مقام آتا ہے جب کہا جائے کہ یاایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیہ۔ فادخلی فی عبادی و دخلی جنتی اے نفس مطمئنہ لوٹ چل اپنے رب کی طرف۔۔ راضی خوشی پس داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو میری جنت میں۔ (القرآن)

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا عمدہ بات کہی ہے:

اس نے دیکھا کہ ایشیاء قوائے ذہنی کو ماؤف اور اس کے دست عمل کو شل کرنے والا نفی خودی اور نفی

کائنات کا فلسفہ ہے۔اب رہا یورپ تو اس میں شک نہیں کہ اس نے اثبات خودی کی اہمیت کو سمجھ کر میدان عمل میں قدم بڑھایا اور فرد و جماعت کے ربط سے اپنی زندگی کو استوار بنایا لیکن چونکہ اس ربط کی بنیاد کس عالم گیر روحانی عقیدے پر نہیں بلکہ نسل و وطن کے تنگ مادی نظریے پر تھی۔اس لیے بہت جلد اس کے اندر انتشار کی قوتیں نمودار ہوگئیں۔صحیح نصب العین اقبال کے نزدیک اسلام ہے،جس نے ایشیاء کی روحانیت اور یورپ کی عملیت کو سمو کر دنیا کو دین فطرت کی راہ دکھائی مگر گردش زمانہ سے اسلام کے پیرو بھی وحدت الوجود کے عقیدے کی بدولت جو نفی ٔخودی اور فنی کائنات کی تعلیم دیتا ہے۔اسی خلقت اور جمود کا شکار ہو گئے، جو ایشیا کی قوتوں پر طاری تھا۔اس کی سزا انہیں یہ لی کہ یورپ کی ذہنی اور سیاسی غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ان حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کے بعد اقبال اپنے جاں بخش اور جان افزا نغمہ امید سے ملت اسلامی کو غفلت سے جگاتا ہے تا کہ وہ دنیا کو اس روحانی اور مادی ہلاکت سے جو آج چاروں طرف منڈلا رہی ہے نجات دے۔اقبال کی نظر مشرق و مغرب میں ایک زبردست سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے آثار دیکھتی ہے اور اسے صحیح راہ پر لگانے کے لیے وہ پہلے مسلمانوں کے اور پھر کل اقوام عالم کے قلوب میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔

''اپنے چھٹے خطبے''الاجتہاد فی الاسلام'' میں اقبال اس امر پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں جمہوریت کی طرف قدم اٹھ رہا ہے۔بلادِ اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشو ونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بہت بڑا ترقی آفریں قدم ہے۔

پاکستان کہہ کر ہم نے جس خطہ ملک کو پکارا وہ اقبال کے خوابوں کی سرزمین ہے جسے وہ جمہوری خطوط پر استوار دیکھنا چاہتے تھے تا کہ اسے اسلام کے اقتصادی اور معاشرتی نظام کی تجربہ گاہ بناتے ہوئے اس میں عام سے عام آدمی کے مفاد کی نگہ داری بھی ہو اور اس کی حس قومی کی شراکت بھی۔ان کا کہنا تھا کہ اس ملک (پاکستان) کے ذریعے اسلام کو یہ موقع ملے گا کہ وہ اس چھاپ سے نجات پا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر لگا رکھی ہے اور یوں یہ اپنے قانون اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو تحریک دے کر انہیں اپنی اصل روح اور روح عصر سے قریب تر لا سکے گا''

اگر کسی بھی ملک میں انسانی قدروں کا احترام نہیں ہوگا اور مسلم اقوام اپنے وجود کی اہمیت کو نہیں سمجھ پائیں گے یا حاکم اپنی رعایا کی صورت حالات پر گہری نظر رکھتے ہوئے انھیں قابل قبول مراعات سے سرفراز نہیں کر سکے گا تو پھر ان کی قوم کا حال بقول اقبال ہماری داستان بھی داستانوں میں نہ ہوگی، کے مصداق ہو جائے گا۔علامہ نے کہا تھا۔

> ''اسلام کے مطابق زندگی کی بنیاد ازلی و ابدی روحانی قدروں پر ہے۔
> لیکن زندگی کی نشو ونما نت نئے قالبوں میں ہوتی ہے جو معاشرہ اس
> حقیقت کی بنیاد پر ابھرے گا اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ زندگی کے

نظم وضبط کی خاطر مستقل اور ابدی اصولوں (وحی) کی پیروی کرے
لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے مفہوم
میں پھیلاؤ کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک
واقع ہوئی ہے جامد ہو کر رہ جائے گا۔''

ہمارے معاشرے میں جاری ہوس زر نے مغرب پرستی کے ساتھ مل کر ایسی ہی صورت پیدا کر دی اب تک اتنا تو ہونا چاہیے تھا کہ ہم اخلاقی، روحانی اور انسانی قدروں اور اصولوں کا احترام کریں اور معاشرتی طور پر اپنے وجود کی تکمیل کے لئے کوشاں ہو جائیں اور بلا مذہب وملت یکجہتی کے تصورات سے کو پایہء تکمیل تک پہنچا سکیں۔

## 6.5 آپ نے کیا سیکھا

اقبال کی خودی سے واقفیت حاصل ہوئی۔

خودی اور بے خودی کے درمیان فرق کی آگاہی حاصل ہوئی۔

## 6.6 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔علامہ اقبال کی شاعری کے موضوعات کا جہاں سب شعرا سے زیادہ وسیع ہے وضاحت کیجئے کہ کیا اس طرح کی بات کسی نے علامہ اقبال کے بارے میں کہی ہے؟ اگر کہی ہے تو ان کی بات وضاحت سے کہیے۔

۲۔علامہ اقبال کے پیغام کی کلید خودی مرکزی تصور بنتا ہے۔

۴۔بے خودی کیا ہے؟ اس کا خودی سے کیا تعلق ہے؟ کیا ان دونوں میں تضاد موجود ہے۔

۵۔خودی کا تصور کس حد تک مشرقی یا اسلامی ہے اور کس حد تک مغربی؟

۶۔کیا تصور خودی کی اہمیت آج کے عہد میں بھی بدستور موجود ہے؟ یا یہ فلسفہ محض ماضی بن کر رہ گیا۔

۷۔کیا اقبال کا تصور خودی ایک قابل عمل تصور ہے۔

۸۔علامہ محمد اقبال کا تصور خودی کیا صرف مسلمانوں ہی کے لیے ہے یا اس کے دامن میں دوسری اقوام کے لیے بھی گنجائش ہے

## 6.7 سوالات کے جوابات

۱۔شاعری میں یوں تو سارے جہاں کی باتیں کی جاسکتی ہیں اور ایسا ہر شاعر کرتا ہے مگر علامہ اقبال کے ہاں فن بھی پھیلاؤ رکھتا ہے اور ان کے خیالات بھی وسیع تر ہیں۔خیالات کا یہ عالم ہے کہ فلسفہ قدیم وجدید اسلامی اور غیر اسلامی تصوف مذاہب عالم کے مختلف تصورات، معاشرتی مسائل اخلاقی مسائل سیاسی مسائل پھر نگر اور عمل کی قدیم اور جدید تمام تحریکیں اور محرکات ان کی شعری دنیا میں آباد ہیں۔

اس طرح ان کا فن محض لفظی ومعنوی حسن پر ہی محیط نہیں بلکہ یہ لفظ کے بالکل نادر استعمال کا ہنر ہے لفظ

جس شان اور شکوہ کے ساتھ اقبال کے ہاں استعمال ہوا ہے اس کی مثال اردو کی غزلیہ و نظمیہ شاعری میں سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ بلکہ دنیا کی شاعری میں لفظ کے ایسے استعمال کی مثالیں نہیں ملتیں پھر تاثیر کی جو کیفیت اقبال کی شاعری کو نصیب ہے وہ چیزے دیگر ہے۔

۲۔تصورِ خودی۔خودی کے تصور کے گردان کا تصور مردِ مومن پھرتا ہے جو اقبال کا آئیڈیل ہے۔خودی کا نمایاں ترین جوہر عشق ہے۔سو تصور عشق سے اس کا ربط بنا۔عشق کا تعلق عمل مسلسل سے ہے جو اقبال کا پیغام ہے پھر شاہین اس مردِ مومن کی علامت ہے، جس کا کمال خودی ہی سے مرتب ہوتا ہے۔

۳۔یہی پہچان جو ہمیں عمل اور مسلسل عمل کی جانب راغب کئے رکھتی ہے غفاری، قہاری، قدوسی و جبروت جیسی صفات خداوندی کو مردِ مومن کی صفات بنایا ہے کیوں کہ حکم ہے کہ اللہ کا اخلاق اختیار کرو۔خودی کی انتہا ذات خداوندی کی صفات کو زیادہ سے زیادہ اختیار کرنا ہے اس لیے ان کا ذکر آیا۔یہ خودی کی منازل نہیں خودی کے مدارج ہیں۔(1)اطاعت الٰہی۔(2)ضبطِ نفس(3)نیابت الٰہی۔ان مدارج میں سے گزرنے والا اپنوں پر رحیم دشمنوں کے لیے زبردست کردار میں پاکیزہ اور عمل میں صاحب جبروت ہوتا ہے ہیں اقبال نے کہا:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

۴۔خودی فرد کی شخصیت کا ارتقا ہے۔بے خودی معاشرے کی اجتماعی شخصیت سے متعلق ہے خودی عروج پر پہنچی کر خود معاشرے کا حصہ بنی اور بے خودی کو قبول کرتی ہے ان میں تعامل ہے تضاد نہیں۔

۵۔جن ملکوں کو اپنا وجود منوانا اور ثابت کرتا ہے ان کے لیے خود شناسی و خود گری اور خود نگری سے بہتر اور کون سی راہ ہو سکتی ہے جن کا رستہ کھوٹا ہو گیا انہیں بھی اس راہ پر آنا اور ملتا ہے اور جنہوں نے یہاں منزلیں ماریں انہیں اپنی برتری کے لیے خود نگر رہنا ہے۔

۶۔فلسفانہ افکار کے لیے یہ بات کبھی لازم نہیں گردانی گئی کہ کسی فلسفہ کے اندر کس قدر عملیت پذیری موجود ہے تاہم علامہ اقبال کے تصور خودی کو یہ تخصیص نصیب ہے کہ نہ صرف یہ قابل عمل ہے بلکہ اس کے خیر البشر کے معیار کی شخصیت اپنے انتہائی کمال میں آنحضورؐ کی پھر دیگر انبیاء اور پھر صحابہ کرام اور اہل بیت کی شکل میں موجود رہی ہے۔اولیا اللہ اسی طور کی اعلیٰ شخصیات جو ہر عہد میں ہر ملک میں رہیں۔

۷۔ہر فلسفی کا ایک مخاطب طبقہ ہو سکتا ہے۔اس حوالے سے بات کرنا کسی فلسفی کو محدود نہیں کرتا۔جگن ناتھ آزاد نے اقبال پر لکھتے ہوئے کہا کہ کسی نے متن پر لکھتے ہوئے عیسوی روایات دیکھ کر ملٹن کو عیسائیوں کا شاعر اور کالیداس کو ہندوؤں کا شاعر کبھی نہیں کہا تو اقبال کو ایسا کیوں کہا جائے کہ وہ صرف مسلمانوں کا شاعر ہے۔اقبال کے مخاطب مسلمان ہیں اقبال نے علامات بھی اپنے ہی ماحول سے چنیں مگر اقبال کے تصورات انہیں صرف

مسلمانوں تک محدود نہیں کرتے۔اسی حوالے سے آج مشرق کے ساتھ مغرب میں بھی فکر وفن اقبال کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ملی حوالے سے بھی اقبال کے ہاں قوم کے بجائے ملت کا جو تصور ہے وہ اقبال کی فکر کو عالمگیر روحانی اور اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے جو ڈاکٹر سید عابد حسین کے خیال میں قوم کے محدود تصور سے کہیں وسیع ہے کیونکہ اخلاقی اور روحانی نصب العین کل انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے علمی وحدت بناتے ہیں۔

## 6.6 فرہنگ

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| جہان معنی | معنی کی دنیا | تنوع | افکار خیالات کی رنگارنگی |
| ثروت | دولت مندی/ مالا مال ہونا | گوناگوں | طرح طرح کے |
| تحریکات | تحریک کی جمع | دروبست | سب،تمام،انتظام |
| تشکیل | شکل دینا/ بناتا | معروض | پیش کیا ہوا،خارجی عصر مراد جہان |
| وغیرہم | اوردوسرے | موضوع | عنوان ، وہ مقصد جس پر گفتگو ہو،داخلی عصر مراد انسان |
| طبائع | طبیعت کی جمع | بوقلمونی | رنگارنگی |
| حکیم | حکمت (دانائی) والا | معاشرتی | معاشرے سے متعلق |
| معاشرہ | انسانی ماحول/سوسائٹی | نمود | ظہور/ ظاہر ہونا |
| بذات | اپنی ذات میں | عمل آمیز | وہ جس میں عمل شامل ہو |
| تدقیق | باریک بینی/گہری تحقیق | مماثلت | یک رنگی/ مشابہت |
| عجم | غیرعرب | متحمل | اٹھانے والا/ والی |
| لطیف الطبع | نازک مزاج | دشوارگزار | جس میں سے گزر پانا مشکل ہو |
| آماج گاہ | عمل یا کارروائی کا مقام | خاک دان | مراد جہان دنیا |
| زمان | زمانہ | مکان | جگہ |
| تادیب | سکھانے کا عمل/تربیت | تخریب | خراب کرنے کا عمل |
| مستقیم | سیدھا | نیابت | قائم مقامی،تائب ہونے کا مقام |
| فلاسفر | فلسفی حضرات | قلیل | تھوڑے |
| جلیل | عظیم | مجاز | غیر حقیقی |
| حلقۂ آفاق | مراد دنیا | باعدگر | آپس میں ایک دوسرے سے |

| | | | |
|---|---|---|---|
| متصل | ملے/ جڑے ہوئے | انکشاف | کشف ہونا/ کھلنا/ خبر میں آنا |
| پس ماندہ | جو پیچھے رہ گیا | استعمار | غیر کی حاکمیت |
| استحصال | اپنے فائدے کے لئے دوسرے کو نقصان کرنا | حریت | آزادی |
| تحسین | تعریف | لازمہ | ضروری عنصر |
| عناہر چہارگانہ | چار عناصر کائنات | شورائیت | ایسی حکمرانی جس میں مشورہ سے فیصلہ ہو |
| متشکل | شکل پذیر/ شکل پانے والی | مستحسن | نیک شمار کرنے والا، اچھی |
| مسحور | جادو میں آیا ہوا | استوار | قائم |
| سحاب | بادل | برگ وبار | پتے اور پھل |
| پیش خیمہ | کسی واقعے سے پہلے پیش آنے والی صورت حال | حوالی | ماحول |
| تولید | پیدائش | تجدید | نیا بنانا/ پرانے کو نیا کرنا |
| بلیغ | استائی/ بامعنی، بلاغت سے پر | انّ اللہ لایغیر ما بقوم حتیٰ یغیر مابانفسھم | بے شک اللہ تعالی کسی قوم کے حالات جب تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے احوال خود تبدیل نہ کرے |
| ممکنات | ممکن کی جمع، جو بات ہو سکے | خدا کا شخصی وجود | یعنی خدا ایک شخصیت رکھتا ہے |
| بسیط | وسیع، چوڑا، بہت | مطلق | سب پر حاوی |
| ملانی | ملنے والا | نفی | انکار |
| جمود | جما ہوا، ٹھہرا ہوا، بے حرکتی | | |

## 6.8 کتب برائے مطالعہ


| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | اقبال کا فلسفۂ خودی | ڈاکٹر آصف جاہ کامرانی |
| ۲۔ | فکرِ اقبال | ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم |
| ۳۔ | روحِ اقبال | ڈاکٹر یوسف حسین |
| ۴۔ | حکمتِ اقبال | ڈاکٹر رفیع الدین |
| ۵۔ | اقبال سب کے لئے | ڈاکٹر فرمان فتح پوری |
| ۶۔ | مقالاتِ اقبال | مرتبہ سید عبدالواحد |

# اکائی 7 :اقبال کا تصورِ عشق وخرد اور مردِ مومن

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 تصوراتِ عشق وخرد اور مردِ مومن

7.3.1 کلامِ اقبال میں عقل کا تذکرہ

7.3.2 کلامِ اقبال میں عشق کا تذکرہ

7.3.3 تصوراتِ عقل وعشق کی کلامِ اقبال سے مزید تشریحات

7.3.4 اقبال کے مآخذ

7.3.5 اقبال کا تصورِ مردِ مومن

7.4 آپ نے کیا سیکھا

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

7.6 سوالات کے جوابات

7.7 فرہنگ

7.8 کتب برائے مطالعہ

## 7.1 اغراض ومقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

۱۔اقبال کے تصورِ عقل سے آگاہ ہوسکیں۔

۲۔اقبال کے عشقیہ تصورات سے متعارف ہوسکیں۔

۳۔یہ جان سکیں گے کہ ان تصورات کی تشکیل میں علامہ اقبال نے کن افکار ونظریات سے استفادہ کیا ہے۔

۴۔اقبال کے تصورِ مردِ مومن یا انسانِ کامل کے بنیادی مآخذ سے آگاہ ہوسکیں۔

## 7.2 تمہید

علامہ اقبال کے تصور عقل وعشق بہت وسیع ہے۔علامہ کے افکار ونظریات سے واقفیت کے لیے ضروری ہے کہ انسانی عقل اور انسانی جدیوں سے متعلق ان کے خیالات کے بنیادی رویوں سے آگاہی حاصل کی جائے۔ انسانی جذبوں میں ان کے نزدیک ایک بنیادی جذبہ عشق ہے جس کے نتیجے میں دنیا کے بڑے بڑے کام انجام پاتے ہیں۔اس یونٹ میں اختصار کے ساتھ آپ کو علامہ اقبال کا تصور عقل وعشق کے بارے میں بتایا جائے گا تا کہ آپ کلام اقبال کی روشنی میں ان کے تصورات سے آگاہ ہوسکیں۔اقبال اپنے نظام فکر میں انسانی شرف امتیاز اور خودی کے استحکام وسعت کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ان کا تصور مرد مومن یا مرد کامل یا صاحب خودی اس کی وضاحت وصراحت لیے ہوئے ہے۔اس یونٹ میں ہم اقبال کی نظم ونثر کے حوالے سے ان کے مرد مومن یا مرد کامل یا انسان کامل کے تصور کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

## 7.3 تصورِ عشق وخرد اور مردِ مومن

**عقل:**

یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں اچھے برے میں تمیز یعنی فرق کرنے کی صلاحیت اور اس میں سے اچھے کا انتخاب کرنا ادراک،فہم سمجھ بوجھ وغیرہ الفاظ بھی عقل کے لیے استعمال کیئے جاتے ہیں۔دنیا میں رنگ رنگ کے کام اور راستے ہیں انسان اپنی عقل سے کام لے کر اپنے لیے بہترین راستے کا انتخاب کرتا ہے اور عقل کی مدد سے ہی اس راستے کی اونچ نیچ کو سمجھتا ہے اور اس کا مقابلہ کرتا ہے۔انسانوں کو حیوانوں سے جو چیزیں ممتاز کرتی ہیں انسانی عقل بھی ان میں سے ایک ہے حیوان بھی محدود سمجھ بوجھ رکھتے ہیں لیکن انہیں عقل کا وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا جو حضرت انسان کے حصے میں آیا ہے۔

**عشق :**

یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے کسی شخص کام خیال یا مظہر سے انتہا درجے کی دوستی کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔آخری سلام یا اس سلام کو بھی عشق کہتے ہیں جو پہلوان اکھاڑے میں اتر کر کرتے ہیں اردو میں عشق پیچاں ایک بیل کا نام بھی ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جس درمحبت سے چمٹ جائے اسے سکھا دیتی ہے۔مشق ہے" کے معنی آفرین اور شاباش کے ہیں عام طور سے عشق حقیقی اور عشق مجازی کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں ۔حقیقی عشق سے مراد خالق کائنات سے غیر معمولی تعلق اور شیفتگی ہے جب کہ مجازی سے مراد انسانوں سے ایسا ہی تعلق لیا جاتا ہے۔

### 7.3.1 کلام اقبال میں عقل کا تذکرہ:

علامہ اقبال کے اردو کلام کا پہلا مجموعہ بانگ درا ہے اس اولین مجموعے میں ایک نظم عقل ودل'' کے نام سے شامل ہے جس میں علامہ اقبال نے عقل اور دل کے موازنے میں دراصل عقل اور عشق ہی کا موازنہ پیش کیا

ہے۔اس کے علاوہ بانگ درا کی متعدد دوسری نظموں فلسفہ غم جواب شکوہ وغیرہ میں بھی عقل سے متعلق علامہ کے خیالات کا اظہار ہوا۔

ع آہ یہ عقل زیاں اندیشہ کیا چالاک ہے فلسفۂ غم

ع عقل انسانی ہے خانی، زندہ جاوید عشق فلسفۂ غم

ع عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر مری جوابِ شکوہ

دوسرے مجموعہ کلام ''بال جبریل'' میں بھی عقل اور دل کا موازنہ جاری رہا ان کے خیالات کا جھکاؤ اس مجموعے میں بھی عقل کے خلاف اور دل یا مشق کے حق میں رہا۔مختلف غزلوں میں بہ کثرت ایسے خیالات ظاہر ہوئے۔

عقل گو آستاں دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

یا

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے

تیسرے مجموعہ کلام ''ضرب کلیم'' میں بھی عقل کو راہ نما بنانے کے رویے کی مذمت اور دل یا عشق کی برتری ہی کا اظہار ہوا اور یہ بتایا گیا کہ عقل جمع تفریق کرتی رہتی ہے اور زندگی کا معرکہ جمع تفریق سے نہیں بلکہ جذبۂ عشق سے جیتا جاتا ہے۔

یہ عقل جو مرد پر دیں کا کھیلتی ہے شکار
شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن تخمیں تو زبوں کارِ حیات

عقل کی بے بسی اور نارسائی کا یہ احساس ارمغان حجاز میں بھی نظر آتا ہے۔

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تار رفو
عقل کو ملتی نہیں اپنے بتوں سے نجات
عارف و عامی تمام بندہ لات و منات

ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

یہی صورت ان کے فارسی کلام کے مجموعوں میں بھی پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع کلام اقبال میں اول تا آخر موجود رہا اور زندگی کے کسی بھی مرحلے میں علامہ اقبال نے اس موضوع کو ترک نہیں کیا۔

### 7.3.2 کلام اقبال میں عشق کا تذکرہ:

کم وبیش وہ تمام مقامات جہاں علامہ اقبال نے عقل کی تردید یا تنقیص کی ہے وہاں اس پر دل یا عشق کی برتری بھی ثابت کی ہے۔ مذکورہ بالا مثالوں میں اس تدریج کے ساتھ جس کے ساتھ آپ نے عقل سے متعلق علامہ کے خیالات ملاحظہ فرمائے ہیں عشق سے متعلق ان کے خیالات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً جہاں انہوں نے عقل کو فانی قرار دیا ہے اس کے ساتھ ہی عشق کو زندہ جاوید کہا، جہاں عقل کو سپر کہا وہاں عشق کو شمشیر قرار دیا ہے۔ عقل کو حکیمانہ نظر پیدا کرنے والی اور عشق کو سرمستی ورندی سکھانے والا قرار دیا ہے جہاں عقل کو عیار کہا وہاں عشق کو صوفی ملا اور حکیم کے پیر بہنوں سے آزاد تھایا اور جہاں یہ کہا کہ عقل پرانے چاک سینے کی صلاحیت نہیں رکھتی وہیں عشق کے اس کمال کا تذکرہ کیا کہ عشق انہیں چاکوں کو کسی سوئی اور دھاگے کے بغیر ملاسکتا ہے، اس طرح گویا کلام اقبال میں عشق کا تذکرہ عقل کی طرح شروع سے آخر تک موجود ہے اور عقل کے حریف اور مقابل کے طور پر لایا گیا ہے اور عقل پر اس کی برتری وفوقیت بتائی گئی ہے۔

### 7.3.3 تصوراتِ عقل وعشق کی کلام اقبال سے مزید تشریحات:

علامہ اقبال کے تصور عقل وعشق کے سلسلے میں ضروری ہے کہ بانگ درا کی نظم عقل ودل پر ایک نظر ڈالی جائے جس میں ان کا نظریہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے اور یہ اس موضوع پر ملنے والی ان کی پہلی مکمل نظم ہے لیکن اس میں پیش کیے گئے خیالات ان کے آخری عمر کے خیالات سے بھی مختلف نہیں ہیں بلکہ خلیفہ عبدالحکیم نے تو اس نظم کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''اقبال نے عقل وعشق کے موازنہ اور مقابلہ میں سینکڑوں اشعار لکھ ڈالے اور دل نواز نکتے پیدا کئے لیکن ان سب کا لب لباب درحقیت وہی ہے جو اس سادہ سی نظم میں آ گیا ہے''۔

اب نظم ملاحظہ فرمائیں

## عقل ودل

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا — بھولے بھٹکے کی راہ نما ہوں میں
ہوں زمین پر گزر فلک پہ میرا — دیکھ تو کس قدر رہا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا — مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں

ہوں مفسر کتاب ہستی کی　　مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن　　غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے　　پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
راز ہستی کو تو سمجھتی ہے　　اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے　　اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے　　تو خدا جو خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی　　اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی　　حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا　　طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا　　عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

اس نظم کے پہلے پانچ اشعار میں عقل کا موقف یا بہ الفاظ دگر عقل کی صفات پیش کی گئی ہیں کہ عقل انسان کو زندگی کے راستوں سے آشنا کرتی ہے اور کتاب حیات کی تشریح وتفسیر کا فریضہ انجام دیتی ہے اور زمین پر اللہ تعالی کی عظمت وشان کے ایک مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے مقابلے میں دل کا موقف آخر کے سات شعروں میں پیش کیا گیا ہے (درمیان کا ایک شعر شمار نہیں کیا گیا) دل کا کہنا یہ ہے کہ عقل جن رازوں کو بہ صد کوشش وکاوش سمجھتی ہے میں انہیں کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں، عقل کا واسطہ حقائق کی خارجی سطح سے ہے جب کہ میں حقائق کی حقیقت (باطن) کو پہچانتا اور جانتا ہوں یہ درست ہے کہ حصول علم، عقل کے ذریعے ممکن ہوتا ہے لیکن معرفت کا درجہ بلند حضور قلب کے بغیر ممکن نہیں۔ علم جب بہت بڑھ جاتا ہے تو انجام بے اطمینانی ہوتا ہے جب کہ معرفت یا عشق اس بے اطمینانی کا مداوا کر سکتے ہیں اور معرفت وعشق کا تعلق دل سے ہے عقل سے نہیں۔

عقل سچائیوں کو تلاش کرتی ہے جب کہ دل کا دعوی ہے کہ وہ حسن ازل کا راز جو ہے آخر میں دل اپنے فضائل کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میری عظمت اور بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے قیام کے لیے مجھ ہی کو پسند کرتا ہے۔

اس نظم سے علامہ اقبال کے عقل وعشق سے متعلق تصورات ہی کی نہیں بلکہ ان کی اصطلاحات کی بھی وضاحت ہوگئی ہے۔

عشق کا تصور شاعری کی دنیا میں عام تھا اور شعرا اسے سو سو رنگ سے باندھتے چلے آئے تھے کسی ارضی محبوب کی محبت اس کے وصال کی تمنا اس سے جدائی پر لاحق ہونے والی کیفیات ہجر اس کے عارض وگیسو کا بیان

وغیرہ مضامین کم وبیش تمام شعرا کے ہاں مل جاتے ہیں۔اس مضمون کے بیان میں شعرا کے ہاں ولولہ اور جوش وخروش پایا جاتا ہے اقبال بھی شاعر تھے انہوں نے بھی عشق کا مضمون اختیار کیا۔آغاز میں بہت ہی کم مدت تک ان کے ہاں عشق کا رائج روایتی تصور اپنی چمک دکھا سکا لیکن جلد ہی انہوں نے اپنا جدا نظمِ فکر مرتب کر لیا اور افکار و خیالات اس نظام فکر کے سانچے میں ڈھلتے چلے گئے۔علامہ اقبال کے افکار و خیالات کا مرکزہ (نیوکلیس) تصور خودی ہے یعنی انسانی شخصیت کی تکمیل وتہذیب اور استحکام جس کی تربیت کے مراحل انہوں نے اپنی اولین تصنیف اسرار خودی میں بیان کیے۔

علامہ اقبال نے اسرار خودی کے انگریز مترجم پروفیسر نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں شخصیت سے متعلق اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''شخصیت جوش یا ولولے کی ایک کیفیت کا نام ہے شخصیت کا وجود اس وقت تک قائم ہے جب تک اس جوش یا ولولے کی کیفیت قائم ہے یہی کیفیت انسان کی بیش قیمت متاع ہے۔۔۔۔۔''

انسانی شخصیت میں جوش دولولے کی اس کیفیت کو قائم رکھنے کے لیے اقبال عشق کو ضروری سمجھتے ہیں اور چونکہ عقل یا خرد انسان کو نفع نقصان کی راہ دکھاتی ہے اور نفع نقصان کو نگاہ میں رکھنے والا عشق کے مطالبات پورے نہیں کر سکتا اس لیے اقبال عقل کی مخالفت کرتے ہیں وہ عقل کے نتیجے کے طور پر حاصل ہونے والے علم محض کو بھی پسندیدہ قرار نہیں دیتے اور علم وعشق کے موازنے میں کہتے ہیں۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ بنا
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندہ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

(علم وعشق)

عشق کو سراپا حضور کہنے سے اقبال کے نزدیک عشق کے تقدس وطہارت کا پتہ چلتا ہے۔وہ عشق کو حضوری لذت کا حامل قرار دیتے ہوئے علم وتعقل کو حجاب قرار دیتے ہیں (کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل) یوں ان کا تصور عشق حیات وکائنات کی گتھیاں سلجھانے اور انسان کی آنکھوں پر حائل پردے اٹھانے کا ذریعہ بن جاتا ہے اور وہ کائنات کے ذرے ذرے میں عشق کی کارفرمائی دیکھتے ہیں اور یہ قرار دیتے ہیں کہ وہ نقش جس کی صورت گری عشق کے ہاتھوں ہوتی ہو لہ لحہ فنا ہوتا ہے اس کائنات میں ٹھہر جاتا ہے اور ایسے عشق کا ظہور کسی مرد کامل سے ہی ممکن ہوتا ہے یوں وہ عشق کو دم جبرئیل اور دل مصطفیٰ اور خدا کا کلام قرار دے کر اس کی رفعت، عظمت اور تقدیس

کے مدارج کھولتے چلے جاتے ہیں۔

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے تارِ حیات

(مسجد قرطبہ)

عشق کے تصور کو اقبال سے پہلے بھی تقدس حاصل ہوا تھا اور یہ تقدس صوفیائے کرام کے افکار و تعلیمات سے ظاہر ہوتا تھا۔ ذات باری تعالٰی سے بندے کا عشق ان کے خیالات کا اہم نکتہ تھا لیکن اقبال کے تصور عشق اور صوفیانہ تصورات عشق میں ایک بڑا بنیادی فرق ظاہر ہوا کہ صوفیاء کے نزدیک کمال عشق یہ تھا کہ قطرہ (انسان) خود کو دریا (ذات احدیت) میں فنا کر دے تو نہیں قطرے کا کمال ہے۔ اقبال نے اس تصور فنا سے اختلاف کیا اور کہا کے عشق تو خودی کی تربیت سے پیدا ہونے والا ایسا کمال ہے جو انسان کو بقا عطا کر دیتا ہے اور وہ فنا پر غلبہ پا لیتا ہے جیسا کہ ابتداء میں انہوں نے ٹینی سن سے ماخوذ ایک نظم عشق اور موت'' میں اس خیال کا اظہار کیا اور آخر تک اس پر قائم رہے۔

چنانچہ اقبال نے صوفیا کے مقابلے میں ذات احدیت سے ایک ایسے تعلق کا تصور پیش کیا جس میں شخصی و

جذباتی لہر شامل ہے اور جو فنا پذیر نہیں بلکہ باقی رہنے والا فنا ناپذیر تعلق ہے۔

چونکہ عشق جرات رندانہ کا طلب گار ہوتا ہے اور عقل ایسے مقامات پر محو تماشائے لب بام رہتی ہے اس لیے اقبال عقل کو مسترد کرتے ہیں یہ استرداد کبھی کی طرف لے جانے والا نہیں بلکہ یہ بتانے کے لیے ہے حیات و کائنات کی گتھی سلجھانا عقل کے بس کی بات نہیں اس بے بسی اور نارسائی کے اظہار سے اقبال اپنے قاری کو پھر عشق کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عقل محض راستہ دکھانے والا ایک چراغ ہے اسے منزل سمجھ لینا بصری دھوکا ہے منزل اس سے کہیں آگے واقع ہے:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل پر عشق کو ترجیح دینے کا سبب یہ ہے کہ معقل حقائق اشیا کا کامل ادراک نہیں کر سکتی۔ یہ وہ عقل ہے جسے ڈاکٹر یوسف حسین خان کے مطابق عقل جزوی کہا جا سکتا ہے جو مارے کی حقیقت کو بجھتی ہے لیکن زندگی کو نہیں سمجھ سکتی۔ جب وہ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کو مسخ کر ڈالتی ہے۔"

اقبال نے زندگی کا ایک مرحلہ یورپ میں طے کیا تھا اس لیے انہوں نے مغرب کی معاشرت اور تہذیب کو قریب سے دیکھا انہوں نے محسوس کیا کہ مغرب میں زندگی کی تفہیم عقل کے راستے سے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس روش پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مغرب کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور برملا کہا:

فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

اس سے آگے بڑھ کر یورپ کی تعلیم کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل

تاہم اقبال کے خیالات میں ارتقا بھی ہوا اور نفی کی اس منزل سے انہوں نے اثبات کی طرف بھی سفر کیا اور عقل کے بتوں کو گرا دینے کے بعد جب مطلع صاف ہو گیا تو انہوں نے عقل اور عشق کے امتزاج کی بات کی اور یہ قرار دیا کہ مرد کامل یا مرد حق عقل اور عشق دونوں کا جامع ہوتا ہے اور اس کی یہ جامعیت اسے محفل کائنات کی رونق بناتی ہے۔

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

اور یہ بھی کہا کہ جب خرد تپش آشنا ہو جاتی ہے تو دل بن جاتی ہے اور دل و عقل کا تضاد تحلیل ہو جاتا ہے۔

چہ می پرسی میانِ سینۂ دل چیست
محرد چون سوز پیدا کرد دل شد

یہ خیالات دراصل ان کے اس نظریے کے آئینہ دار بن کر سامنے آئے جس میں انہوں نے کہا کہ عقل جب اپنے کمال کو چھو لیتی ہے تو وہ وجدان میں بدل جاتی ہے وجدان عشق کا ایک مظہر ہے افکار و نظریات کی اس سطح پر آ کر اقبال نے کہا:

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

گویا انہوں نے تسلیم کیا کہ معقل بھی اہم ہے اور اس میں بھی ذوق نظر پیدا ہو سکتا ہے لیکن کہی یہ ہے کہ اس میں عشق جیسی جرات رندانہ پیدا نہیں ہو سکتی

(عقل بھی عشق ہے اور ذوق نظر سے بیگانہ نہیں ہے لیکن اس بیچاری میں جرات رندانہ کی کمی ہے)

### 7.3.4 اقبال کے مآخذ

ہر مفکر کے افکار کے پس منظر میں کچھ قدیم و جدید مآخذ تلاش کیے جا سکتے ہیں جنہیں اپنی فہم و بصیرت اور مطالعہ و مشاہدہ کائنات کی روشنی میں وہ ایک نئے رنگ و روپ میں پیش کرتا ہے ان پر اضافے کرتا ہے اور نظریہ سازی کرتا ہے یوں کہ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھل کر کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے تصور عقل و عشق کے پس منظر میں دیکھا جائے تو بہت سے مظاہر ان کی توجہ کو مبذول کرتے دکھائی دیتے ہیں ذیل میں ہم ترتیب وار ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

**مزاج**

مفکر کے نظریات کی تہہ میں اس کا مزاج بہت بنیادی اہمیت رکھتا ہے علامہ اقبال باوجود یکہ ایک رجائیت پسند فلسفی اور مفکر تھے لیکن ان کے مزاج میں غم کے لیے کشش موجود تھی۔ چنانچہ مشق کا تصور جو عدم تکمیل کے احساس پر منتج ہوتا ہے انہیں فطری اور طبیعی طور پر بھایا انہوں نے خود کہا:

جس طرح رفعت شبنم ہے مزاج غم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

یا

غم نہیں غمِ روح کا اک نغمہ خاموش ہے
جو سرود بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

ان کے خیالات میں عدم تکمیل کا عنصر بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور انہوں نے کئی پیرایہ ہائے بیان میں

اس بات کا اظہار کیا کہ عشق میں کامیابی زندگی، تحرک اور جذبے کی موت ہے۔

تو خناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام

(تو نے اب تک یہ نہیں جانا کہ وصال شوق کے لیے موت کا پیغام لاتا ہے حیات دوام کیا ہے؟ مسلسل چلتے رہنا حیات وام ہے)

اس لیے وہ ایک منزل کے بعد دوسری) اور دوسری کے بعد تیسری اور اس سے آگے اس سے آگے کی بات کرتے ہیں اور قرار کو موت قرار دیتے ہیں۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے

**شعری روایت:**

اردو اور فارسی کی شعری روایت میں غم اور محبت کا مضمون عام تھا۔ اقبال نے فارسی اور اردو کی شعری روایت سے بھرپور استفادہ کیا ہے ان کے پسندیدہ شعراء کے ہاں عشق، محبت وصال ناتمامی کے مضامین بہ کثرت ملتے ہیں اقبال کا ان سے متاثر ہونا فطری امر تھا لیکن انہوں نے روایت کو محض تقلیدی طریقے سے آگے نہیں بڑھایا بلکہ اس میں اضافے کیسے اور عشق کا پامال مضمون ایک ایسے زاویے سے پیش کیا کہ وہ کسی محدود جذبے کی بجائے حیات و کائنات کی وسعتوں کو محیط ہو گیا۔

**فلسفے کا مطالعہ اور پی ایچ ڈی کا مقالہ:**

علامہ اقبال نے فلسفے کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ فلسفہ حیات و کائنات کی گتھیوں سے بحث کرتا ہے عشق محبت اور انسانی زندگی کے دوسرے مسائل خوشی، غم، کامیابی ناکامی فلسفے کا موضوع بنتے ہیں۔ اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء موضوع منتخب کیا تھا۔ اس تحقیقی مطالعے کے دوران انہوں نے اکابر فلاسفہ اور صوفیا کے افکار کا یہ نظر عمیق مطالعہ کیا جن میں سے کچھ کے اقبال کی فکر پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور بعض سے اقبال نے اختلاف بھی کیا۔ مسلم فکر کی روایت میں انہوں نے ابن العربی، عراقی، حافظ وغیرہ کے خیالات سے استفادے کے باوجود ان سے اختلاف کیا جب کہ مولانا روم کو انہوں نے اپنا معنوی مرشد قرار دیا اور ان کے افکار سے بیش بہا استفادہ کیا یہاں تک کہ خود کو عصر جدید میں مولانا روم ہی کے مقام پر دیکھا اور کہا:

چورومی در حرم دادم اذان من — من ازو آموختم اسرارِ جانِ من
بہ دور فتنۂ عصرِ کہن او — او بدور فتنۂ عصرِ روانِ من

میں نے حرم میں رومی کی طرح اذان دی ہے اور میں نے روحانیت کے اسرار و رموز اسی سے سیکھے ہیں پرانے فتنوں کے زمانے میں رومی (ان کے مقابل) تھا اور عصر رواں کے فتنوں (کے مقابل) میں ہوں۔

**مغربی حکما کا مطالعہ :**

اقبال کی فکر بعض مغربی حکما مثلاً گوئٹے، نطشے وغیرہ سے بھی متاثر ہوئی لیکن مسلم مفکرین کی طرح یہاں بھی اثر پذیری کا اظہار تقلید کی صورت میں نہیں ہوا بلکہ اختلاف تنقید، تنقیح اور نظریہ سازی کی صورت میں ہوا ہے۔ بعض مقامات پر اقبال نے مغربی حکما کے افکار قبول بھی کیسے ہیں۔

**اسلامی افکار و تعلیمات:**

اقبال کے جملہ نظریات کی تشکیل میں جن افکار نے کلیدی کردار ادا کیا ہے وہ اسلام کی تعلیمات ہیں۔ مسلم مفکرین کے افکار سے تو اقبال نے اختلاف کیا ہے لیکن اسلام کی حقیقی تعلیمات سے اقبال سرمو انحراف نہیں کرتے انحراف کجا ان سے ایک لمحے کی جدائی بھی گوارا نہیں کرتے انہوں نے محمد سعید الدین جعفری کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

''میں خالص اسلامی نقطۂ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں۔''

اشعار میں بھی وہ بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے راہنمائی کی التجا کرتے نظر آتے ہیں اور خود کو قرآنی تعلیمات تک محدود رکھنے کے آرزومند دکھائی دیتے ہیں۔

تو اے مولائے یثربؐ آپ میری چارہ سازی
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

قرآنی تعلیمات سے اسقدر والہانہ شیفتگی کا اظہار کیا ہے

گر دلم آئینہ کی جوہر است
در بحرنم غیر قرآن مضمر است
روز محشر خوار درسوا کن مرا
بی نصیب از بوس پا کن مرا

(اگر میرا دل آئینہ ہے جوہر ہو اور اگر میرے حرف میں قرآن کے سوا کوئی بات ہو تو مجھے حشر کے دن خوار و رسوا کر دیا جائے اور مجھے حضور پہ لانے کے بوسہ پا سے محروم کر دیا جائے۔)

اسلام کی نظر میں رسول کریم صلی اللہ علی وسلم سے امت محمدیہ کے افراد کا تعلق ایسی محبت پر مبنی ہونا چاہیے جو اولاد خاندان مال و دولت اور اپنی ذات کی محبت سے زیادہ ہو۔ یہی محبت اور محبت کا یہی درجہ انسان کو اللہ رب کائنات کے قریب کرتا ہے اور اللہ کا قرب محبت کے نئے جہان منکشف کر دیتا ہے۔ اور جو اللہ سے محبت کرتا ہے

اللہ اس سے محبت کرتا ہے اس کی صفات میں صفت رحمت بہت نمایاں ہے اس طرح عشق اور والہانہ تعلق کا تصور اسلام میں موجود ہے۔ گو عشق کا لفظ کہیں قرآن یا حدیث میں مذکور نہیں لیکن اقبال نے اسلامی تعلیمات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

## 7.3.5 اقبال کا تصورِ مردِ مومن

### اقبال کا تصورِ کامل

دنیا بھر کے اہل فکر و دانش دنیا کے مسائل کے حل کے سلسلے میں انسانی اہمیت بلکہ انسانی کردار کی مرکزی حیثیت کے بارے میں متفق الرائے اور یک زبان ہیں۔ یہ جہان انسانوں ہی کا ایک وسیع جنگل ہے جسے صرف انسانوں نے آباد کر دکھانا ہے بلکہ اس کی شکل وصورت کے بنانے اور اس میں جاری نظام کو چلانے میں انسانی فکر اور انسانی ہاتھ ہی کی ساری کارگزاری ہے۔ مگر انسان کا اس سے بھی بڑا کردار اس جہاں کے مسائل کے حل کے سلسلے میں ممکن ہے اور وہ یہ کہ خود انسان کی اصلاح ہو جائے۔ زیادہ بہتر انسانوں کی موجودگی سے ہی انسان اس شرف آدمیت کا حقدار بن سکتا ہے جو روز اول سے اللہ تعالیٰ نے اسے فرشتوں سے سجدہ کرا کے اس کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اس جہان کی پیدائش ایسے ہی عظیم انسان یا انسان کامل کی جلوہ گاہ کے طور پر کی گئی تھی کہ وہ عظیم انسان اس جہان کی کمزوریوں کو اپنے حسن عمل اور خیر حمل سے دور کرتا جائے اور نتیجہ کے طور پر اس بیماری بڑھائے کمزوری، موت اور عذاب کی زد میں آئے ہوئے فانی جہان کی زندگی کو ایک دوسرے کے لئے اچھے کام کر کے آپس کی محبت اور قربانی کے جذبے سے پھر مذہب کی رہنمائی کے وسیلے سے ایک اچھی دنیا میں تبدیل کر دے۔ وہ بڑے لوگ جو انسانی کمزوریوں کے باوجود اپنے لالچ اپنی نمود و نمائش شہرت اور دکھاوے سے بلند ہو کر محض ہم جنسوں کی مدد اور انسانی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر بنی نوع انسان کی رہنمائی اور مدد کے لئے آگے بڑھ بڑھ کر کام کرتے رہیں وہی اشرف المخلوقات ہیں وہی مسجود ملائک کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ انسان کامل کا تصور دنیا کے ہر خطے میں موجود رہا اسے مرد منتظر بھی کہا گیا ہے۔

بعض مذاہب اور بعض عقائد میں بھی یہ بات شامل رہی ہے کہ وہ بڑا آدمی ضرور آئے گا سو ہر زمانے نے اس کا صدیوں انتظار کیا۔ عظیم انسان کا تصور بڑا فطری اور قدرتی سا تصور ہے کیونکہ جس طرح انسان سے پہلے کے جاندار بھوک اور جنس کی جبلت کے اسیر ہیں۔ اگر انسان کا عمل بھی بھوک پیاس، جنسی عمل اور نیند کی تسکین تک ہی محدود رہے تو انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت کیا تھی؟

کائنات جمادات سے نباتات پھر حیوانات تک ترقی کا ایک سفر کرتی نظر آتی ہے۔ پھر مٹی حرکت سے بھی محروم تھے۔ نباتات میں حرکت اور زندگی آئی مگر یہ زندگی ارادہ سے خالی تھی۔ اس کی حرکت طے شدہ تھی۔ حیوان سے انسان تک کے سفر میں ارادہ اور شعور کو ترقی ملی۔ جس نے عقل اور تمیز کو راہ دی۔ عقل اور تمیز کا لازمی تقاضہ

نفاست، عظمت اور لطافت کی طرف سفر تھا۔ پاکیزگی، بلند کرداری اور ایمانداری کی واضح صورتیں ہیں جو انسانی زندگی میں بلند کردار لوگوں کی شخصیت سے ظاہر ہوئیں۔

**مغرب میں انسان کامل کا تصور**

یہ تجربہ کہ انسان دوسرے جانداروں سے برتر ہے انسان کے اس یقین کا باعث ہوا کہ انسان کی ذمہ داریاں دوسرے جانداروں کے مقابل کہیں زیادہ ارفع اور اعلیٰ ہیں۔ سو عظیم انسان کے بارے میں عہد قدیم کے یونان فلاسفہ بھی بات کرتے رہے ہیں۔ vahid S.A نے ارسطو کی فکر میں بھی ایسے عناصر کی دریافت کی ہے جو بعد میں اقبال کے تصور مرد مومن میں بھی شامل ہوئے مثلاً ارسطو کہتا ہے۔

"He is of a dispositive to do men service he is ashamed to have a service done to him"

''الحذر از منت غیر الحذر"(اقبال)

اسی طرح ارسطو کہتا ہے۔

''His carriage is sedate his voice deep him speech measured"

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو (اقبال) یعنی مرد مومن اپنے عمل میں سرگرم اور رویہ میں مہربان ہوتا ہے مگر دراصل یہ عناصر ارسطو اور اقبال میں مشترک ہونے کے ساتھ ارسطو کی فکر اور قرآنی ارشادات میں مشترک ہیں دراصل یہ اقبال اور قرآن کے اشتراکات میں سے ہیں۔ عظیم انسان کے بارے میں مشہور برطانوی شاعر William Shakespeare نے بھی کہا تھا کہ اس کی شخصیت انتہا پسندی سے پاک ہوگی۔

And elements so combined that nature might stand up and say to have is the man.

فطری عناصر میں اعتدال اور توازن وہ جوہر ہے جو ہر کہیں زمانے میں ہر حوالے سے بڑائی کا معیار رہا ہے۔ مگر خود عظیم انسان کے بارے میں مغربی فکر جلدی زوال آشنا ہوگئی۔ نشاۃ ثانیہ ہی سے ان کے ہاں عناصر قدرت کی عظمت اور پاکیزگی کے تصور نے انسانی عظمت و رفعت کی جگہ لے لی۔ یورپی فکر میں تصور خدا کے متاثر ہونے نے تصور انسان کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ اقبال نے 78-1907 ہی میں یورپی تہذیب کے اس خلا کو محسوس کر کے اس کی زوال یا تنگی کی پیش گوئی کر دی تھی جب کہا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

یا

کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

بیسویں صدی مغربیوں کے ذہن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کردار اور روحانیت ہر دو کے حوالے سے اسی زوال سے عبارت رہی ہے جس کی طرف سینگو، اقبال, برنارڈ شاہ اور سی ای ایم جوڈ جیسے دانشور اپنے اپنے طور اشارہ کرتے رہے ہیں۔ضرب کلیم میں اقبال نے مغربی نظام ہی کو کنیز اہزن دوں نہاد و مردہ اور دیو بے زنجیر قرار دیا ہے۔اس نظام سے مرد عظیم ظاہر نہیں ہوسکتا تھا۔

**انسان کامل یا مرد مومن کے تصور کا اسلامی پس منظر**

''روزگار فقیر" کے مصنف فقیر سید وحیدالدین کہتے ہیں کہ قرآن کا یہ ارشاد کہ خود تمہارے وجود کے اندر اس کی نشانیاں ہیں علامہ اقبال کو اول اول خودی کی اہمیت کے حوالے سے متاثر کر گیا تھا اسی طرح حضرت علی کا قول

من عرف نفس فقد عرف ربه

(جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے خدا کو پہچان لیا)

کنت کنز مخفیات مخلقت الخلق

(میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ مجھے پہچانا جائے سو میں نے مخلوق کو وجود بخش دیا)

vahid S.A کا یہ کہنا ہے کہ خود قرآن شریف کی یہ آیۃ مبارکہ

(کسی کا بوجھ کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا)

عمل کے ناتے خودی ہی کی انفرادی ذمہ داری کی دلالت کرتا ہے خود یا ان کی انفرادی صورت ہی نہیں اللہ کی انائے کبیر کے ساتھ اس کا تعلق بھی اسلامی روایات سے مل جاتا ہے۔آنحضورؐ نے جب کفار کو کنکریاں ماریں تو اس حوالے سے اللہ تعالٰی نے ارشاد فرمایا **ما رمیت اذرمیت ولاکن الله رما** (القرآن)

جب کنکر تو نے مارے تو وہ تو نے نہیں مارے بلکہ اللہ نے مارے۔

اسی طرح بیعت رضوان کے وقت جب صحابہ نے آنحضور کے دست مبارک پر بیعت کی تو ارشاد فرمایا **يد الله فوق ايديهم** (ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

**نطشے کا فوق البشر**

نطشے کا فوق البشر قوت محض کا نمائندہ جذبہ اور جوش کی علامت اور مذہب و اخلاق سے بے نیاز توانائی ہے وہ خدا کا منکر تھا عیسائیت کو اس نے عروج انسانی کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔عیسائیت اور بدھ مت کو اس نے نفی حیات والے مذاہب کہا۔اس کا خیال ہے کہ تاریخی طور پر عیسائیت کمزور محکوموں اور غلاموں کی اپنے فاتحوں اور طاقتور مالکوں کے خلاف سازش تھی کہ اس کے ذریعے انہوں نے اپنے ہاں موجود غلاموں

والے اخلاق کو بلند اخلاقیات کر غازی کو نعمت عاجزی کو خدا کے ہاں پسندیہ صفت اور صبر وخوبی قرار دے لیا۔ وہ کہتا ہے اس ہتھیار سے کمزور یہودیوں نے طاقتور اہل روم کو شکست دی۔ وہ غلاموں کے اخلاق کو آقاؤں کے اخلاق سے جدا کر کے دیکھتا ہے وہ کہتا ہے حوصلہ جرات عمل پسندی اور عمل کی سود وزیاں سے بلندی اور ماورائیت آقاؤں کے اخلاق ہیں اور عاجزی برداشت انتظار نرمی وغیرہ غلاموں کی اخلاقیات میں شامل ہیں۔ اخلاق کو تقسیم کرنے والا نطشے خیر اور شر کو منقسم اور الگ الگ نہیں جانتا۔ وہ کہتا ہے کہ اچھائی اور خیر شروع میں قوت کو کہا جاتا ہے اچھا آدمی طاقتور آدمی ہوا کرتا تھا، یہی ہونا چاہیے وہ اس چیز یا عصر کو شر کہتا ہے جو کمزوری کی طرف لے جائے۔ کمزور کو بچانے کا عمل اس کی نگاہ میں عروج آدم کی دشمنی میں گنا جائے گا۔ وہ کہتا ہے بعض رسم ورواج کی پابندی کو لوگوں نے نیکی کہنا شروع کر دیا اور لوگ اس لئے نیک ہوتے ہیں کہ اس میں سہولت رہتی ہے یا یہ ان کی عادت کی مجبوری ہوتی ہے۔ اور ثواب کو بھی اسی پیمانے سے جانچتا ہے وہ کہتا ہے کہ فوق البشر کے تسلسل میں آنے والے زمانے نیکی اور بدی کے بجائے حکمت کو معیار بنائیں گے۔ تہذیب ظلم سے پھوٹی اعلیٰ تہذیب اس کے تجزیے کے مطابق وہاں ابھری جہاں مجبوراً محنت کرنے والا طبقہ بھی تھا اور اپنے اختیار سے محنت کرنے والا بھی وہ جمہوریت اور اشتراکیت ہر دو کو رد کرتا ہے انسانی مساوات اسے کسی طرح برداشت نہیں۔ وہ کہتا ہے ارتقا میں صرف اعلیٰ افراد اٹھیں گے سب نہیں۔ زندگی اس کی نگاہ میں تنازع اللبقا میں بقائے عام کا قائل ہے کہتا ہے کہ ہر کوئی اپنے آپ کو بچانے کے لیے دوسروں سے تصادم اور مسلسل تصادم میں مصروف ہے۔ وہی نسلیں آج تک باقی رہیں جو ماحول، موسم، آب وہوا اور زمانہ کی تختیوں کے دباؤ کو سہہ سکیں۔ زیادہ قومی فرد جو فوق البشر ہے وہی باقی بچے گا بلکہ اس کو باقی رہنا چاہیے اسے ان آزاد مردوں کا انتظار ہے جو توانائیوں نفع وضرر پر صداقت کو اہم سمجھیں۔ خیر وشر کے چکر میں نہ آئیں جو صرف اسے قبول کریں جو حیات بخش ہو۔ وہ فوق البشر کی عظمت کے آگے کسی تصور قدر معیار شخصیت کو کچھ نہیں سمجھتا۔ برتر انسان کی تلاش نطشے، رومی، عبدالکریم جبلی اور اقبال کے ہاں مشترک عنصر ہے اگرچہ برتر انسان کا تصور نطشے کا سب سے مختلف ہے۔ محل کے مقابلے پر معرفت سکھانے والا جذبہ یا عشق رومی، نطشے، اقبال تینوں میں موجود ہے۔ نطشے اور رومی استدلال اور منطقیت کے بجائے موسیقی کو اہم کہتے ہیں۔ اقبال شاعری کو فلسفے سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ تینوں جدوجہد کو زندگی کہتے ہیں۔ خودی کا استقرار نطشے، رومی، اقبال تینوں کے ہاں موجود ہے۔ انسان کا عروج غیر محدود ہے۔ یہ عصر بھی تینوں کے ہاں موجود ہے۔ تاہم رومی اور اقبال کے اشتراکات بے شمار ہیں۔ دونوں تقدیر کو غیر معین کہہ کر اسے آئین حیات کہتے ہیں۔ دونوں کا خیال ہے کہ موجودات ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف سفر کر رہے ہیں قرآن کے آدم کو دونوں عظیم کہتے ہیں۔

فلسفے کی دنیا میں نطشے کا تصور فوق البشر ایک بڑے آدمی (بلکہ ایک طاقتور آدمی) کے تصور تک محدود رہتا ہے جسے '' Superman کہتا ہے۔ اس شخصیت کے تین عناصر ترکیبی ہیں Resurrection,

Dionysusاور Superman یونان کی پرانی دیو مالا یا صنمیات میں جو دیوی دیوتاؤں کے قصے بتائے گئے ہیں ان میں Dionysus تکاثر عشرت اور شراب کا دیوتا ہے۔ وحشت اور ظلم کی رسوم اس کی شخصیت کے ساتھ گندھی ہوئی ملتی ہیں۔ وہ عیش فراواں اور لامحدود طاقت کی علامت بنتا ہے۔ یہ لامحدود لاقانونیت اقبال کے تصورات ہی کے برعکس ہے۔

نطشے کے اس تصور فوق البشر کا دوسرا حوالہ Eternal Resurrectin ہے جو تخلیقی سفر کے بجائے وائرے کے اندر کی دائمی حرکت ہے۔ اقبال اس حرکت کو تقدیر پرستی کہتے ہوئے رد کرتے ہیں۔ نطشے کے تصور کا تیسرا عنصر خود فوق البشر کی ذات ہے۔ یہ توانا شخص ہر value (قدر) کے تصور سے بے خبر اور محروم ہے قوت اور اندھی قوت کی علامت ہے۔ وہ سخت کوش بھی ہے مسلسل حرکت میں بھی ہے مگر ہر اخلاقی حس ہر مذہبی قید سے ماورا ہے۔ اقبال اس تصور کو بھی قبول نہیں کر سکتے ان کا مرد مومن تو بہت کی ذمہ داریاں ساتھ لے کے چلتا اور بہت ہی پابندیوں میں سفر کرتا ہوا اپنی شخصیت کو تہذیب دیتا ہے۔

**رومی اور اقبال کا تصور مرد مومن**

اسلامی فکر وجود انسانی کا اثبات کرتی ہے۔ اسی باعث سید عبدالواحد نے اقبال کے تصور خود میں مولانا روم کے تصور خودی کے تین اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

1۔ مرد مومن کا مقام

2۔ مرد مومن کی عرفانیت اور روحانیت

3۔ لامحدود خودی (اللہ) اور خودی (انسان) کا ربط

اقبال نے خود کو مرید ہندی کہہ کر مرشد رومی کی رہنمائی قبول بھی کی ہے۔ رومی کے ہاں بڑے انسان کی آرزو بھی ملتی ہے اور اس کی ضرورت کا احساس بھی۔ رومی نے کہا تھا

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردش
شہر کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

(کل شیخ ہاتھ میں دیا لئے شہر بھر میں گھومتا رہا یہ کہتے ہوئے کہ میں کیڑوں مکوڑوں اور جانوروں جیسے انسانوں سے بیزار ہو گیا ہوں آدمی کو ڈھونڈتا ہوں) اس ساری غزل میں رومی نے بڑی عمدگی سے مرد مومن کی رونمائی کی ہے۔ ویسے بھی رومی کی شعری فضا مشق کی جس مستی سے لبریز ہے۔ اس کے ڈانڈے بھی اقبال کے تصور عشق سے ملتے ہیں کہ رومی کے ہاں بھی عشق بھی جذب و عمل کی سرخوشی سے عبارت ہے۔ شیخ اکبر محی الدین العربی کے بھی ذات مطلق کے ظہور کے مدارج کے ساتھ انسانی کردار کے ارتقاء کے تصورات ملتے ہیں اسی طرح فلسفی عبدالکریم جیلی کے ہاں بھی انسانی کردار کی ارتقائی صورت کی آرزو ملتی ہے۔ اقبال مرد مومن کی علامت کے طور پر

لالہ کے پھول کو کوئی جگہ سامنے لاتے ہیں۔

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

لالہ کے پھول سینے میں داغ مرد مومن کے دل داغ داغ کی علامت ہے صاف ماحول میں کھلا ہوا لالہ مرد مومن کے اہل صفا ہونے سے عبارت ہے۔

تاہم شاہین کی علامت مرد مومن کے لیے زیادہ استعمال ہوتی ہے اور یہ علامت تکرار اور مباحث میں بھی بہت آئی۔ شاہین کی صفات حیرت انگیز طور پر بلندی کردار کا ایک استعارہ بنتی ہیں وہ دور بین ہے بہت بڑے فاصلے سے شکار کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کے بازو سب پرندوں سے زیادہ توانا ہوتے ہیں وہ سیدھا نوے درجے کے عمودی زاویے پر بھی اڑان لے سکتا ہے اس کی ذہانت ایسی ہے کہ اپنے سے کئی درجہ بڑے جاندار کو چونچ مار کے اندھا اور اپنی مرضی کے مطابق چلا کر لے آتا ہے۔ شاہین کے رعب کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جس درخت پر آ بیٹھے وہیں کوئی دوسرا پرندہ بیٹھنے کا تصور نہیں کر سکتا اور اگر وہاں بیٹھا ہو تو دہشت سے مر جاتا ہے۔ وہ حرام خوری اور مردار خوری سے بچتا ہے دوسرے کا چھوڑا ہوا نہیں کھاتا۔ خود شکار کرتا ہے دوسرے دن کیلئے چھپا بچا کر نہیں رکھتا وہ صاحب ترک دنیا بھی ہے کہ خود گھونسلہ نہیں بناتا کھلے موسموں میں جی لیتا ہے۔

یہ ساری صفات اقبال کو مرد مومن والی صفات لگتی ہیں۔

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی راہبانہ
جھپٹنا' پلٹنا' پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

ترقی پسند اہل قلم نے اگرچہ خود طاقت کے فلسفے کو رد نہیں کیا تاہم شاہین کے جھپٹے ملنے کو دوسرے پرندوں کی جان کے ضیاع کی قیمت پر قبول نہیں کیا اور بعض ایک نے اسے خون آشانی کہا۔ نظریاتی طور پر کتنے ہی لطیف مباحث اس بابت کئے جائیں مگر حقیقت وہی ہے جو اقبال نے بتائی کہ

فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ

زندگی کی بہار میں نرم دلی کی روش کئی بار سخت مقامات کے مقابل آنے پر مجبور ہے۔ جن دانشوروں نے شاہین کے جھپٹنے پلٹنے پر اعتراضات کئے انہوں نے عموماً غیر معمولی نازک مزاجی کی وکالت کی۔ جب کہ زندگی کا سوال یہ ہے کہ طاقت کو قانون اور قاعدہ کا پابند کیا جائے نہ یہ کہ طاقت حاصل کرنے سے بھی انکار کر دیں۔

## 7.4 آپ نے کیا سیکھا

۱۔اقبال کے مطابق عشق کی حقیقت کا علم ہوا۔

۲۔مغربی تصور کے مطابق کامل انسان اور اقبال کے مطابق مردمومن کا صحیح اندازہ حاصل ہوا۔

۳۔عقل اور عشق کی حقیقت سے آگاہی حاصل ہوئی۔

## 7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ مردمومن کے بارے میں مشرق کے کون کون سے تصورات فکر اقبال کو راغب کر سکتے ہیں؟

2۔ انسان کامل کے بارے میں مغربی دنیا کے تصورات کیا رہے ہیں؟

3۔ نطشے کے تصور فوق البشر یا Superman کی وضاحت کیجیے

4. اقبال کے تصور عقل وعشق کے مآخذ پر ایک تعارفی نوٹ لکھیں۔

5. اقبال کے تمام افکار کی کلید قرآن وحدیث ہے۔اقبال کے تصور عقل وعشق کو پیش نظر رکھ کر وضاحت کریں

## 7.6 سوالات کے جوابات

1. ''روزگار فقیر" کے مصنف فقیر سید وحید الدین کہتے ہیں کہ قرآن کا یہ ارشاد کہ خود تمہارے وجود کے اندر اس کی نشانیاں ہیں علامہ اقبال کو اول اول خودی کی اہمیت کے حوالے سے متاثر کر گیا تھا اسی طرح حضرت علی کا یہ قول

من عرف نفس فقد عرف ربه

(جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے خدا کو پہچان لیا)

كنت كنز مخفيات مخلقت الخلق

(میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ مجھے پہچانا جائے سو میں نے مخلوق کو وجود بخش دیا)

vahid S.A کا یہ کہنا ہے کہ خود قرآن شریف کی یہ آیتِ مبارکہ

(کسی کا بوجھ کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا)

عمل کے ناتے خودی ہی کی انفرادی ذمہ داری کی دلالت کرتا ہے خود یا ان کی انفرادی صورت ہی نہیں اللہ کی انائے کبیر کے ساتھ اس کا تعلق بھی اسلامی روایات سے مل جاتا ہے۔آنحضور نے جب کفار کو کنکریاں ماریں تو اس حوالے سے اللہ تعالٰی نے ارشاد فرمایا وما رميت اذ رميت ولٰكن الله رما (القرآن)

جب کنکر تو نے مارے تو وہ تو نے نہیں مارے بلکہ اللہ نے مارے۔

اسی طرح بیعت رضوان کے وقت جب صحابہ نے آنحضور کے دست مبارک پر بیعت کی تو ارشاد فرمایا يد الله فوق ايديهم (ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے)

۲۔ یہ تجربہ کہ انسان دوسرے جانداروں سے برتر ہے انسان کے اس یقین کا باعث ہوا کہ انسان کی ذمہ داریاں دوسرے جانداروں کے مقابل کہیں زیادہ ارفع اور اعلیٰ ہیں۔ سو عظیم انسان کے بارے میں عہد قدیم کے یونان فلاسفہ بھی بات کرتے رہے ہیں۔ vahid S.A نے ارسطو کی فکر میں بھی ایسے عناصر کی دریافت کی ہے جو بعد میں اقبال کے تصور مرد مومن میں بھی شامل ہوئے مثلاً ارسطو کہتا ہے۔

"He is of a dispositive to do men service he is ashaned to have a service done to him"

الحذر از منت غیر الحذر "(اقبال)

اسی طرح ارسطو کہتا ہے۔

"His carriage is sedate his voice deep him speech measused"

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو (اقبال) یعنی مرد مومن اپنے عمل میں سرگرم اور رویہ میں مہربان ہوتا ہے مگر دراصل یہ عناصر ارسطو اور اقبال میں مشترک ہونے کے ساتھ ارسطو کی فکر اور قرآنی ارشادات میں مشترک ہیں دراصل یہ اقبال اور قرآن کے اشتراکات میں سے ہیں۔ عظیم انسان کے بارے میں مشہور برطانوی شاعر William Shakespeare نے بھی کہا تھا کہ اس کی شخصیت انتہا پسندی سے پاک ہوگی۔

And elements so combined that nature might stand up and say to have is the man

فطری عناصر میں اعتدال اور توازن وہ جوہر ہے جو ہر کہیں زمانے میں ہر حوالے سے بڑائی کا معیار رہا ہے۔ مگر خود عظیم انسان کے بارے میں مغربی فکر جلدی زوال آشنا ہوگئی۔ نشاۃ ثانیہ ہی سے ان کے ہاں عناصر قدرت کی عظمت اور پاکیزگی کے تصور نے انسانی عظمت و رفعت کی جگہ لے لی۔ یورپی فکر میں تصور خدا کے متاثر ہونے نے تصور انسان کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ اقبال نے 8-1907 ہی میں یورپی تہذیب کے اس خلاء کو محسوس کر کے اس کی زوال یا تنگی کی پیش گوئی کر دی تھی جب کہا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

یا

کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

بیسویں صدی مغربیوں کے ذہن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کردار اور روحانیت ہر دو کے حوالے سے اسی زوال سے عبارت رہی ہے جس کی طرف سینگو اقبال برنارڈ شاہ اور سی ای ایم جوڈ جیسے دانشور اپنے اپنے طور اشارہ کرتے رہے ہیں۔ ضرب کلیم میں اقبال نے مغربی نظام ہی کو کنیز اہرمن دوں نہاد و مردہ اور دیو بے زنجیر قرار دیا ہے۔ اس نظام سے مرد عظیم ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔

3۔نطشے کا فوق البشر قوت محض کا نمائندہ جذبہ اور جوش کی علامت اور مذہب و اخلاق سے بے نیاز توانائی ہے وہ خدا کا منکر تھا عیسائیت کو اس نے عروج انسانی کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ عیسائیت اور بدھ مت کو اس نے نفی حیات والے مذاہب کہا۔ اس کا خیال ہے کہ تاریخی طور پر عیسائیت کمزور محکوموں اور غلاموں کی اپنے فاتحوں اور طاقتور مالکوں کے خلاف سازش تھی کہ اس کے ذریعے انہوں نے اپنے ہاں موجود غلاموں والے اخلاق کو بلند اخلاقیات کر غزی کو نعمت عاجزی کو خدا کے ہاں پسندیہ صفت اور صبر و خوبی قرار دے لیا۔ وہ کہتا ہے اس ہتھیار سے کمزور یہودیوں نے طاقتور اہل روم کو شکست دی۔ وہ غلاموں کے اخلاق کو آقاو?ں کے اخلاق سے جدا کر کے دیکھتا ہے وہ کہتا ہے حوصلہ جرات عمل پسندی اور عمل کی سود و زیاں سے بلندی اور ماورائیت آقاوؤں کے اخلاق ہیں اور عاجزی برداشت انتظار نرمی وغیرہ غلاموں کی اخلاقیات میں شامل ہیں۔ اخلاق کو تقسیم کرنے والا نطشے خیر اور شر کو منقسم اور الگ الگ نہیں جانتا۔ وہ کہتا ہے کہ اچھائی اور خیر شروع میں قوت کو کہا جاتا ہے.

**عقل:**

یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں اچھے برے میں تمیز یعنی فرق کرنے کی صلاحیت اور اس میں سے اچھے کا انتخاب کرنا ادراک، فہم سمجھ بوجھ وغیرہ الفاظ بھی عقل کے لیے استعمال کیئے جاتے ہیں۔ دنیا میں رنگ رنگ کے کام اور راستے ہیں انسان اپنی عقل سے کام لے کر اپنے لیے بہترین راستے کا انتخاب کرتا ہے اور عقل کی مدد سے ہی اس راستے کی اونچ نیچ کو سمجھتا ہے اور اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ انسانوں کو حیوانوں سے جو چیزیں ممتاز کرتی ہیں انسانی عقل بھی ان میں سے ایک ہے حیوان بھی محدود سمجھ بوجھ رکھتے ہیں لیکن انہیں عقل کا وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا جو حضرت انسان کے حصے میں آیا ہے۔

**عشق :**

یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے کسی شخص کام خیال یا مظہر سے انتہا درجے کی دوستی کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ آخری سلام یا اس سلام کو بھی عشق کہتے ہیں جو پہلوان اکھاڑے میں اتر کر کرتے ہیں اردو میں عشق پیچہ ایک بیل کا نام بھی ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جس درمحبت سے چمٹ جائے اسے سکھا دیتی ہے۔ مشق ہے" کے معنی آفرین اور شاباش کے ہیں عام طور سے عشق حقیقی اور عشق مجازی کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں حقیقی عشق سے مراد خالق کائنات سے غیر معمولی تعلق اور شیفتگی ہے جب کہ مجازی سے مراد انسانوں سے ایسا ہی تعلق لیا جاتا ہے۔

**کلام اقبال میں عقل کا تذکرہ:**

علامہ اقبال کے اردو کلام کا پہلا مجموعہ بانگ درا ہے اس اولین مجموعے میں ایک نظم عقل و دل'' کے نام

سے شامل ہے جس میں علامہ اقبال نے عقل اور دل کے موازنے میں دراصل عقل اور عشق ہی کا موازنہ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ بانگ درا کی متعدد دوسری نظموں فلسفہ غم جواب شکوہ وغیرہ میں بھی عقل سے متعلق علامہ کے خیالات کا اظہار ہوا۔

ع آہ یہ عقل زیاں اندیشہ کیا چالاک ہے فلسفۂ غم

ع عقل انسانی ہے خانی، زندہ جاوید عشق فلسفۂ غم

ع عقل ہے تیری سپیر اعشق ہے شمشیر مری جوابِ شکوہ

دوسرے مجموعہ کلام بال جبریل میں بھی عقل اور دل کا موازنہ جاری رہا ان کے خیالات کا جھکاؤ اس مجموعے میں بھی عقل کے خلاف اور دل یا مشق کے حق میں رہا۔مختلف غزلوں میں بہ کثرت ایسے خیالات ظاہر ہوئے۔

عقل گو آستاں دور نہیں

۵۔علامہ اقبال کے تصور عقل وعشق کے سلسلے میں ضروری ہے کہ بانگ درا کی نظم عقل و دل پر ایک نظر ڈالی جائے جس میں ان کا نظریہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے اور یہ اس موضوع پر ملنے والی ان کی پہلی مکمل نظم ہے لیکن اس میں پیش کیے گئے خیالات ان کے آخری عمر کے خیالات سے بھی مختلف نہیں ہیں بلکہ خلیفہ عبدالحکیم نے تو اس نظم کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''اقبال نے عقل وعشق کے موازنہ اور مقابلہ میں سینکڑوں اشعار لکھ ڈالے اور دل نواز نکتے پیدا کیے لیکن ان سب کا لب لباب درحقیت وہی ہے جو اس سادہ سی نظم میں آ گیا ہے''۔

اب نظم ملاحظہ فرمائیں

## عقل و دل

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا بھولے بھٹکے کی رہ نما ہوں میں
ہوں زمین پر گزر فلک پہ میرا دیکھ تو کس قدر رہا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا مثل خضر خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسر کتاب ہستی کی مظہر شان کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن غیرت لعل بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
راز ہستی کو تو سمجھتی ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے اور باطن سے آشنا ہوں میں

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے　　تو خدا جو خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی　　اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی　　حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا　　طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا　　عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

اس نظم کے پہلے پانچ اشعار میں عقل کا موقف یا بہ الفاظ دگر عقل کی صفات پیش کی گئی ہیں کہ عقل انسان کو زندگی کے راستوں سے آشنا کرتی ہے اور کتاب حیات کی تشریح وتفسیر کا فریضہ انجام دیتی ہے اور زمین پر اللہ تعالی کی عظمت وشان کے ایک مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔

## 7.6 فرہنگ

| الفاظ | معنی |
|---|---|
| فریضہ | فرض، ذمہ داری |
| مظہر | ظاہر ہونا |
| لب لباب | مقصد |
| آستاں | در، چوکھٹ |
| خرد | عقل |
| فوق البشر | ایک ایسا سنہری حیوان جو صرف طاقت کی پرستش کرتا ہے۔(بقول نطشے) |
| رجوع | راغب ہونا، قریب جانا |
| تشکیل | شکل دینا، تیار کرنا |
| عمیق | گہرا |

## 7.7 کتب برائے مطالعہ


1۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ بزم اقبال لاہور 1958
2۔ کلیات اقبال، اردو شیخ غلام علی اینڈ سنز 1974
3۔ کلیات اقبال (فارسی)۔۔۔ ایضا۔۔۔
4۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور
5۔ رسالہ اردو۔ اقبال نمبر 1938
6۔ عزیز احمد، اقبال نئی تشکیل

5۔ خلیفہ عبدالحلیم، فکر اقبال بزم ثقافت اسلامیہ لاہور

8۔ احسان اکبر، اقبال فکر و فلسفہ المسطر راولپنڈی 1990

9۔ ڈاکٹر طاہر فاروقی، سیرت اقبال

10۔ ڈاکٹر وزیر آغا، تصورات عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان 1987

11۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال لاہور بزم اقبال 1988 (دسواں اور گیارہواں باب)

12۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان، روح اقبال۔ لاہور آئینہ ادب 1969 (پہلے باب میں عشق اور عقل)

13۔ ڈاکٹر میر ولی الدین، رموز اقبال لاہور کتاب منزل 1950ء (اقبال کا نظریہ عشق و عقل)

14۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، اطراف اقبال، لاہور مکتبہ میری لائبریری 1976 (عشق)

15۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، عقل اور عشق اقبال کی شاعری میں (مضمون) رسالہ جو ہر شمارہ خاص بیاد اقبال۔ دہلی مکتبہ جامعہ 1940

**بنیادی مآخذ کے طور پر علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے مجموعوں اور ان کے مکاتیب کا مطالعہ کیا جائے انگریزی میں علامہ کے مشہور خطبات Reconstructin of Religious Thought in Islam سے رجوع بھی مفید اور ضروری ہے۔**

## بلاک 3 :

# اقبال کی شعری خدمات (نظم)

اکائی 8- حضور رسالت مآب صلی علیہ وسلم اور خضرِ راہ کا خصوصی مطالعہ (بانگ درا)

اکائی 9- مسجدِ قرطبہ اور لینن خدا کے حضور میں کا تنقیدی مطالعہ (بال جبریل)

اکائی 10- شعاعِ امید کا تنقیدی تجزیہ (ضرب کلیم)

اکائی 11- ابلیس کی مجلس شوریٰ کا تجزیاتی مطالعہ (ارمغان حجاز)

## بلاک 3 کا تعارف

اکائی 8 ''حضور رسالت ماب صلی علیہ وسلم اور خضر راہ کا خصوصی مطالعہ (بانگ درا)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ جس میں اقبال کی شاعری میں رسول اللہ محمد صلی علیہ وسلم کا ذکر ان سے عقیدت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اقبال کی نظم ''خضر راہ'' کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔۔

اکائی 9 ''مسجد قرطبہ اور ''لینن خدا کے حضور میں'' کا تنقیدی مطالعہ (بال جبریل)'' پر مبنی ہے۔ اس میں اقبال کی نظموں ''مسجد قرطبہ'' اور ''لینن خدا کے حضور میں'' کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 10 ''شعاع امید'' کا تنقیدی تجزیہ (ضرب کلیم) کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ اس میں اقبال کی نظم ''شعاع امید'' کے فن پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 11 ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کا تجزیاتی مطالعہ (ارمغان حجاز)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ اس میں اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے فن پر گفتگو اور اس کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

# اکائی 8: 'حضور رسالت مآبؐ میں' اور 'خضرِ راہ' کا خصوصی مطالعہ

ساخت


8.1: اغراض ومقاصد

8.2: تمہید

8.3: 'حضور رسالت مآبؐ میں' کا متن

8.4: 'حضور رسالت مآبؐ میں' کا خصوصی مطالعہ

8.5: 'خضرِ راہ' کا متن

8.6: 'خضرِ راہ' کا تعارف

8.7: 'خضرِ راہ' کا خصوصی مطالعہ

8.8: آپ نے کیا سیکھا

8.9: اپنا امتحان خود لیجئے

8.10: سوالات کے جوابات

8.11: فرہنگ

8.12: کتب برائے مطالعہ


## 8.1: اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- اقبالؔ کی فکر سے آگاہ ہوں گے۔
- نظم فہمی کا شعور پیدا ہوگا۔
- شاعر کے تخیل اور قوتِ پرواز سے واقف ہوں گے۔
- شاعر کے خیالات، 'خضر راہ'، 'صحرا نوردی'، 'زندگی'، 'سلطنت'، 'سرمایہ ومحنت' اور 'دنیائے اسلام' جیسے موضوعات کا مطالعہ کریں گے۔

## 8.2: تمہید

علامہ اقبال برصغیر کے نامور اور مقبول شاعر ہیں۔ انھیں مفکر ملت اور حکیم الامت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری میں شاعرانہ افکار کے علاوہ سماجی، سیاسی، مذہبی متصوفانہ، فلسفیانہ اور عمرانی افکار پائے جاتے ہیں۔ موجودہ دونوں نظموں یعنی 'حضور رسالت مآبؐ میں' اور 'خضرِ راہ' دونوں نظموں میں اقبالؔ کی فکر کا مرکز سیاسی اتھل پتھل ہے۔ 'خضرِ راہ' 1922ء کی نظم ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں کی سلطنت کا قلع قمع ہو رہا تھا اور یوروپی سامراج ایشیاء میں جڑیں پکڑ رہا تھا۔ ہندوستان پہلے ہی ان کا غلام تھا۔ اب ہندوستان کی طرح ترکی حکومت کا خاتمہ ہونے جا رہا تھا۔ ایسی صورت میں یہ دونوں نظمیں چشم کشا رہنمائی کرتی ہیں۔

کلامِ اقبالؔ اور قرآن کے تعلق سے اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی جو خود علامہ اقبالؔ نے ''اسرار خودی'' میں بہ عنوان 'بہ حضور رحمۃ للعالمینؐ' کہی ہے:

گر دلم آئینہ بے جوہر است　　در بحر فم غیر قرآں مضمر است
روزِ محشر خوار و رُسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

(اگر میرا دل آئینۂ بے جوہر ہے اور میرے کلام میں قرآن کے سوا کچھ اور مضمر ہے تو قیامت کے دن مجھے ذلیل و خوار کرنا اور پابوسی کی نعمت سے محروم کر دینا)

دراصل ہمارا مطالعہ یک طرفہ ہے، Comparative Study کا شوق آج کل رخصت ہو گیا ہے۔ کثیر اللسان ہونے کا شوق بھی ہمارے یہاں سے اُٹھ چکا ہے، اسی لئے مطالعۂ قرآن بھی اب بہت کم کم ہے۔ اہلِ نظر بتاتے ہیں کہ اقبالؔ کے کلام کا محور قرآن ہی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم اس کو قرآن نہ سمجھ سکیں۔ ان کے والد نے بچپن میں نصیحت کی تھی کہ قرآن کو ایسے پڑھا کرو جیسے خدا تم سے ہم کلام ہے۔ ایک دن میرے ایک دوست نے بتایا کہ:

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو　　نیک جو راہ ہے اس رہ پہ چلانا مجھ کو

یہ سورۂ فاتحہ (**اھدنا الصراط المستقیم** .....) کا ترجمہ ہے۔

اسی طرح ایک فلسفیانہ نکتے کا شعر جس میں حیات و موت کی تفہیم ہے۔ یعنی موت کیا چیز ہے؟ اس سوال کو سمجھنے سے شاید آج بھی دنیا قاصر ہے، مگر اقبالؔ نے اس سوال کا جواب فلسفے کی رو سے دیا تھا:

اے برادرِ من ترا از زندگی دا دم نشان　　خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خواب گراں

(اے بھائی میں تجھے زندگی کا پتہ دیتا ہوں۔ نیند کو ہلکی موت سمجھو اور موت کو گہری نیند جانو) اس شعر کا مصرعۂ ثانی ایک قرآنی آیت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے، افسوس کہ اس وقت وہ آیت یاد نہیں۔

شاعری میں قرآنی آیات اور قرآنی افکار ایک طویل موضوع ہے جس پر اچھا خاصا اظہارِ خیال کیا جا چکا

ہےاورمزید کیا بھی جاسکتا ہے۔کلامِ اقبالؔ میں قرآنی تلمیحات،قرآنی اشارے،قرآنی قصےاورقرآنی احکام وغیرہ بہت سے موضوعات مل جائیں گےجن پر خامہ فرسائی کی جاسکتی ہے،لیکن ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اقبالؔ شاعری کےعلاوہ روزانہ معمولات کی زندگی میں بھی قرآن فہمی اورقرآنی تعلیم کوعام کرنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ ایک بار کچھ لوگوں کی موجودگی میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ قرآن کے پاروں کا ایک ایسا ایڈیشن شائع کیا جائے،جس میں لفظاً لفظاً معانی درج کیے گئے ہوں تاکہ بچے قرآن کوآسانی سے سمجھ سکیں اوراس تحریک سے قرآن کےسی پاروں کاایک ایڈیشن چاندنی چوک دہلی سے شائع بھی ہواتھا۔

اقبالؔ کےقرآن سے شغف کا یہ عالم تھا کہ ایک محفل میں انھوں نے بیان کیا کہ میرے اندرقرآن کے مطالعے سےایسی بصیرت پیداہوگئی ہے کہ دنیا کے ہرسوال کا جواب قرآن کی روسے دےسکتاہوں۔

آل احمدسرورؔ کے نام اپنے خط مورخہ 12/مارچ 1937ء میں انھوں نےلکھا تھا:

''میرےنزدیک فاشسزم،کمیونزم یازمانۂ حال کےاورازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔میرے عقیدہ کی روسےصرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ہرنقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہوسکتی ہے۔

میرے کلام پر ناقدانہ نظرڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔اگرآپ پورےغوراورتوجہ سے یہ مطالعہ کریں تو ممکن ہے کہ ان ہی نتائج تک پہنچیں جن تک میں پہنچا ہوں۔اس صورت میں غالباً آپ کےشکوک تمام کےتمام رفع ہوجائیں گے۔''

اپنے خط میں اقبالؔ نےقرآن کی اہمیت اورضرورت پر ہرنقطے سےروشنی ڈالی ہے۔ان کےخطوط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اقبالؔ قرآن کوصرف ایک مذہبی کتاب یعنی عبادات تک ہی محدودنہیں سمجھتے تھے بلکہ دنیا کے ہرشعبے میں اس کی ضرورت اوراحتیاج کومحسوس کرتے تھے۔زندگی گزارنے کے لئے جن کارگراصولوں کی ضرورت ہے،ان کا استنباط قرآنی آیات سے کیا جانا نہ صرف امت مسلمہ بلکہ بنی نوع انسان کے لئے سودمند ثابت ہوگا۔ایک خط میں جوصوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام لکھا گیا ہے،معاملاتِ حیات سےمتعلق قرآن کی روسے احکامات وضوابط پراقبالؔ بالتفصیل روشنی کےخواہاں ہیں۔انھوں نےلکھا ہے:

''مجھ کوان خیالات سے کسی حدتک پہلے بھی آگاہی ہے۔کیااچھا ہوکہ شریعت محمدیہ پرایک مبسوط کتاب تحریرفرمائیں جن میں عبادات ومعاملات کےمتعلق صرف قرآن سےاستدلال کیا گیا ہو،'معاملات' کےمتعلق خاص طور پراس قسم کی کتاب کی آج کل شدیدضرورت ہے۔'' (کلیاتِ مکاتیبِ اقبال،جلددوم،صفحہ:600)

اقبالؔ چاہتے تھے کہ زندگی گزارنے کے لئے جوقوانین وضوابط قرآن میں ملتے ہیں،ان کا بڑی باریکی

سے مطالعہ کیا جائے اور دنیا کو بتایا جانا چاہئے کہ کون سا، زندگی کی کس ضرورت کے لئے مکفی ہے۔ اقبالؔ ہی کیا، ایک زمانے سے ہم بھی آج تک یہی سنتے چلے آ رہے ہیں کہ قرآن میں دنیا کی ہر چیز ہے لیکن اس کی بالتفصیل تشریح کی ضرورت ہے کہ کون سی چیز کہاں ہے؟ اور کیوں ہے؟ اقبالؔ بھی اس زمانے میں اسی خیال پر روشنی ڈال رہے تھے۔ انھوں نے غلام مصطفیٰ تبسم کے نام اسی خط میں آگے اظہار خیال فرمایا ہے:

''ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ 'بلاغ' امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ 'اشاعت القرآن' کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخرالذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتی۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔'' (کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد دوم، صفحہ:601)

اقبالؔ امورِ دنیوی کی تعمیل کے لئے قرآنی احکامات اور آیات کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے، پھر ان علمائے دین، صوفیا اور دانش وروں کی آرا اور نشان دہی کی روشنی میں عہد حاضر کے سیاسی، سماجی امراض کا مداوا قرآن کی روشنی میں تلاش کرتے تھے، اسی کا نام تشکیل جدید رکھا گیا۔ اسلام کے متعلق اس قسم کے لکچر کی تیاری میں علامہ اقبالؔ نے سلیمان ندوی، انور شاہ کشمیری اور دیگر علماء کو خطوط لکھے۔ انور شاہ کشمیری کے نام اقبالؔ کے ان خطوط کا ابھی تک کچھ سراغ نہیں ملا لیکن سلیمان ندوی کے اقبالؔ کے وہ خطوط اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ اقبالؔ علمائے کرام سے جس قسم کے سوالات کرتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اچھے اچھے مفتیانِ دین بھی چکرا جاتے ہوں گے۔ قرآن وحدیث، فقہ اور تاریخِ اسلامی پر مکمل عبور رکھنے والے علمائے دین ہی ان سوالوں کے جوابات دے سکتے تھے۔ مثال کے طور پر سلیمان ندوی سے اقبالؔ نے پوچھا:

''حضورؐ نے اذان کے متعلق صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت میں آئے گا یا امامت کے تحت؟

فقہا کے نزدیک خاوند کو جو حق اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ہے، وہ بیوی کو یا اس کے کسی خویش یا

کسی آدمی کے حوالے کیا جاسکتا ہے، اس مسئلہ کی بناء کوئی آیتِ قرآنی ہے یا حدیث؟
امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دوسال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہوتو قیاس اس بچہ کے ولدالحرام ہونے پر نہیں کیا جاسکتا۔ اس مسئلہ کی اساس کیا ہے؟ کیا یہ اصول محض ایک قاعدۂ شہادت ہے یا جزوِ قانون ہے۔ اس سوال کے پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ مروجہ ایکٹ شہادت کی رو سے تمام وہ قواعد شہادت جو اس ایکٹ کے نفاذ سے پہلے ملک میں مروج تھے، منسوخ کیے گئے۔ ہندوستان کی عدالتوں نے مذکورہ بالا اصول کو قاعدۂ شہادت قرار دے کر منسوخ کر دیا۔ نتیجہ اس کا بعض مقدمات میں یہ ہوتا ہے کہ ایک بچہ جو فقہ اسلامی کی رو سے ولدالحلال ہے ایک شہادت کی رو سے ولدالحرام قرار دیا جاتا ہے۔ ایکٹ شہادت میں اور بھی باتیں ہیں جن کا ذکر اس مضمون میں کرنے کا ارادہ ہے جو میں حافظ ابن قیم کے فلسفۂ شہادت پر لکھوں گا۔'' (کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد دوم، صفحہ:636)

اقبالؔ چوں کہ وکالت بھی کرتے تھے اور مقدمات میں اس قسم کے مسائل درپیش آتے تھے، اس لئے ان کی نگاہ شریعت کے قانون اور اصل الاصول قرآن کے ضوابط کی طرف جاتی تھی، جس کے بغیر امت مسلمہ کے مسائل کا عدلیہ حل ممکن نہ تھا۔ عدالتوں میں مسلمانوں کے حقوق کا شرعی دفاع کیا جاسکے، اس کے لئے بھی اقبالؔ فکر مند رہتے تھے اور صحیح معنوں میں اسلامی اصول کی تہہ تک پہنچنا مقصود تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ اقبالؔ تصوف کی ایک خاص شاخ وحدت الوجود کے مخالف تھے اور ان کا مشاہدہ یہ تھا کہ امت مسلمہ کو تصوف کی اس شاخ نے بے عمل بنا دیا ہے جس کی وجہ سے وہ دین اور دنیا میں مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ''مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے قرآن اور سنت کو چھوڑ دیا ہے۔'' اور سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں تو صاف صاف لکھا تھا: ''اسلام میں تصوفِ وجودی ایک اجنبی پودا ہے۔''

ظاہر ہے ان خیالات سے اس بزدلی اور بے عملی کا علاج منظور تھا، جس نے مسلمانوں کو پوری دنیا میں غلام بنا دیا تھا۔ اقبالؔ کے دل و دماغ میں یہ خیال یوروپ جانے کے بعد ہی نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ گمان یہ ہے کہ اقبالؔ یوروپ جانے سے قبل بھی اسی قسم کے خیالات کے حامل تھے اور مسلمانوں کی ہر ذلت اور خواری کا سبب قرآن کی رو سے تلاش کرتے تھے:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر　　اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

لندن جا کر اقبالؔ نے ابھی اپنا ریسرچ کا کام شروع کیا ہی تھا کہ ان کے دماغ میں یہی مابعد الطبیعیاتی افکار اپھننے لگے تھے، یہ بات اس زمانے میں کہنی مشکل تھی، کیوں کہ عالم اسلام خصوصاً ہندوستان میں تصوف کا بول

بالا تھا۔ دنیا کی خانقاہیں، مدارس، مقبرے اور درگاہیں اسی قسم کے صوفیا کے قبضے میں تھیں اور صوفیا کے ان متصوفانہ خیالات کو ثابت کرنے کے لئے اقبالؔ کو قرآنی اساس درکار تھی جس کی بنیاد پر اقبالؔ عامۃ المسلمین کی یا اگر وہ غلط ہیں تو خود اپنی اصلاح کر سکیں۔ صوفیا کا ایک حلقہ اقبالؔ سے بڑا ناراض بھی ہوا۔ اس زمانے میں صوفیوں کے سربراہ خواجہ حسن نظامی نے تو اقبالؔ کے خلاف محاذ ہی کھول دیا تھا اور ''اسرار خودی'' کی اشاعت پر انھوں نے اعتراضات درج کیے تھے۔ لیکن ذرا غور کریں اور ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھیں تو اقبالؔ نے لندن جاتے ہی ایک خط خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا اور اس میں یہی دریافت کیا تھا کہ تصوف کے متعلق قرآن میں جو حکم ہے، اس کی نشان دہی کریں اور واضح طور پر بتائیں کہ قرآن میں تصوف کے متعلق کس سورت اور کس آیت میں صاف صاف کیا حکم دیا گیا ہے۔ دستیاب ریکارڈ کے مطابق خواجہ حسن نظامی اقبالؔ کے ان سوالات کا جواب نہ دے سکے اور ہمیں ایسی کوئی تحریر نہیں ملی جس میں حسن نظامی نے اقبالؔ کو اطمینان بخش جواب لکھ بھیجا ہو۔ اقبالؔ نے جو خط خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا، اس کا کچھ حصہ ملاحظہ کریں:

> ''اس خط کے جواب کا انتظار ہے اور بڑی شدت کے ساتھ۔ اب ایک اور تکلیف دیتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں، ان کا پتہ دیجئے۔ سپارہ اور رکوع کا پتہ لکھئے۔ اس بارے میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور سے مشورہ کر کے مجھے بہت جلد مفصل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت ہے اور یہ گویا آپ کا کام ہے۔
>
> قاری شاہ سلیمان صاحب کی خدمت میں میرا یہی خط بھیج دیجیے اور بعد التماسِ دعا عرض کیجئے کہ میرے لئے یہ زحمت گوارہ کریں اور مہربانی کر کے مطلوبہ قرآنی آیات کا پتہ دیویں۔ اگر قاری صاحب موصوف کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مسئلہ وحدت الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں؟ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے تعلق ہے؟ کیا حضرت علی مرتضیٰؓ کو کوئی خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟ غرضیکہ اس امر کا جواب معقول اور منقول اور تاریخی طور پر مفصل چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ ذخیرہ اس امر کے متعلق موجود ہے مگر آپ سے اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے۔ آپ اپنے کسی اور صوفی دوست سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں مگر جواب جلد آئے۔ باقی خیریت ہے۔ اقبالؔ''
>
> (کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد دوم، صفحہ:108)

شاید صوفی صاحب بھی خاموش ہو کر بیٹھ رہے اور اطمینان بخش جواب نہ دے سکے۔ محسوس ہوتا ہے کہ

قرآنی استغراق میں اس عہد کے تمام صوفیا اور علما بھی اقبالؔ کے سامنے بچے لگتے تھے۔اس لئے اقبالؔ نے ان حضرات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔خواہ دنیاوی علوم ہوں یا دینی، اقبالؔ کی نظر میں قرآن کا حکم ہی حرفِ آخر تھا۔

اقبالؔ کا مقصد اور منشا تصوف کو قرآن سے ہم آہنگ یا غیر ہم آہنگ ثابت کرنے کا تھا۔ان کا نظریہ بالکل صاف تھا۔سیدھی سیدھی بات تھی کہ اگر قرآن میں ان متصوفانہ نظریات کا حکم ہے تو عینِ اسلام ورنہ غیر اسلام۔لیکن خط کچھ اس انداز سے لکھا گیا ہے کہ خواجہ حسن نظامی کو ناگوار نہ ہو، وہ کچھ مواد اپنے پاس ہونے کے ساتھ اور زیادہ جمع کرنا چاہتے ہیں۔اقبالؔ کی گہری نظر نے حقیقت کا پردہ فاش کر دیا تھا کہ مقبروں، درگاہوں اور خانقاہوں میں جو تصوف اسلام کے نام پر اختیار کیا جا رہا ہے، اس کا قرآن یعنی اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔اقبال تصوف کو ایک فلسفہ سمجھتے تھے مذہب نہیں۔تصوف کی طرح انھوں نے دوسرے فلسفیانہ مباحث پر بھی غور کیا ہے۔اقبالؔ کے فلسفیانہ افکار میں ایک فلسفہ کی ایک قسم ''مکان'' ہے۔یہ ایک ادق ترین مسئلہ ہے، حکمائے مغرب نے اس مسئلہ پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے لیکن اقبالؔ کی تحقیق کے مطابق مغربی مفکرین و فلسفی سب کے سب مشرقی حکما سے متاثر ہیں۔اقبالؔ نے مغربی مفکرین کے علاوہ ایک مشرقی حکیم کا ذکر کیا۔اپنے مضمون ''حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت'' میں لکھتے ہیں:

> ''لیکن ریاضیاتِ جدیدہ کے اہم ترین تصورات میں سے ایک تصور کا یہ مختصر حوالہ میرے ذہن میں عراقی کے مسئلہ **غایۃ الامکان فی درایۃ الامکان** کی طرف منتقل کر دیتا ہے کہ ''دہر'' (وقت) جو مشہور حدیث **لا تبسوا الدھر فان الدھر ھو اللہ** میں وارد ہوا ہے۔یہ فرض کرتے ہوئے کہ مصنف کتاب فخر الدین عراقی ہی ہے، یہ بات بہت اہم اور معنی خیز ہوگی کہ عراقی نصیر الدین طوسی کا معاصر ہے۔طوسی کی تصنیف علم اقلیدس پر رومہ میں 1594ء میں طبع ہوئی اور جان والس نے اس کا تعارف جامعہ آکسفورڈ میں سترہویں صدی کے کم و بیش وسط میں کرایا۔طوسی ہی کے سر اس کارنامے کا سہرا ہے کہ اس نے اقلیدس کے مفروضۂ متوازید کو مزید ترقی دی، جس کی بابت یقین کیا جا سکتا ہے کہ اسی نے یوروپ کے محافل علمی میں مسئلۂ 'مکان' کے افتتاح کے لئے اساس بہم پہنچایا اور جس نے آخر کار گاس اور ریمانا کے نظریوں کی رہنمائی کی لیکن عراقی کوئی ماہر ریاضی نہ تھا، اگر مکان و زمان کے متعلق اس کا تصور مجھ کو طوسی کی فکر رسائی سے کئی صدیاں پیش قدم نظر آتا ہے۔یہی شئے اس بات کو ایک فرض عین بناتی ہے کہ اسلام میں ریاضیاتی افکار کی نشو ونما کے بارے میں ایک نہایت ہی محتاط اور غائر طریقِ تحقیق اختیار کیا جائے تا کہ یہ مسئلہ منقح ہو سکے کہ آیا خالص ریاضیاتی شاہراہ کے وسیلہ سے عراقی کے کشف کردہ حقائق تک کبھی بھی رسائی ہو سکی؟

اب میں عراقی کی بحث زمان و مکان کی تلخیص عموماً اس کے الفاظ میں کرنا شروع کروں گا۔ زمان و مکان کا راز عظیم ترین اسرار عالم سے ہے، اس کا حل کر لینا وجود واجب الوجود کی معرفت اور صفاتِ الٰہی کی بصیرت سے عبارت ہے۔ ذاتِ احدیت مآب کے سلسلے میں کسی نہ کسی قسم کے مکان کا وجود قرآن حکیم کی منقولہ ذیل آیات سے عیاں ہوتا ہے: (ترجمہ) کیا تو نہیں دیکھتا کہ خدا ارض وسماوات کی تمام چیزوں کو جانتا ہے کوئی تین آدمی خلوت میں باہم کلام نہیں ہوتے بدون اس کے کہ ان کا چوتھا شریک صحبت وہ بھی ہو اور نہ پانچ اس طرح کہ ان کی تعداد کا چھٹا فرد وہ نہ ہو، ان کا یہ شمار خواہ اس سے کم ہو خواہ زیادہ لیکن وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے خدا ان کے ساتھ ہوگا۔''

(اقبال کے نثری افکار، صفحہ:248-151)

مندرجۂ بالا اقتباس کو نقل کرنے کا منشا یہ ہے کہ چاہے مسئلہ کتنا ہی بڑا اور اہم کیوں نہ ہو، اقبالؔ اس مسئلہ کی حقیقت کو قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں سمجھتے اور سمجھاتے تھے اور یہ عجیب اور بڑی حقیقت ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات جو بھی اقبالؔ کرتے ہیں، اس کے رشتے قرآن حکیم سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ فلسفہ، سائنس، تہذیب، تاریخ، تعلیم، معاشرت، سیاست کون سی چیز ایسی ہے، جس کا نتیجہ اقبالؔ نے قرآن کی رو سے اخذ نہ کیا ہو۔ 'اسرارِ خودی' کے بعد اقبالؔ نے دوسری فارسی کتاب 'رموزِ بے خودی' تصنیف کی۔ 'اسرارِ خودی' کے معارف اپنی جگہ لیکن 'رموزِ بے خودی' پر نظر ڈالیں تو پوری کی پوری کتاب قرآنی مضامین سے مملو نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کتاب کے بہت سے عنوانات بھی اقبالؔ نے قرآن حکیم کی آیات سے مستعار لئے ہیں اور انھیں کے مفاہیم و معانی کی روشنی میں اپنے نظریۂ بے خودی کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ اس لئے ہمیں اقبالؔ کو پڑھتے وقت قرآنی مفاہیم کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیوں کہ بغیر قرآن فہمی کے اقبالؔ کا مطالعہ ناقص رہے گا۔ اقبالؔ کا بہت سا کلام جسے ہم شاعری اور مغربی افکار سمجھتے ہیں، قرآن حکیم کی آیاتِ مقدسہ کے مفاہیم سے ماخوذ ہیں۔

زندگی کے آخری ایام میں مولانا حسین احمد مدنی سے لفظ ''قوم'' کے معانی و مفاہیم پر معرکہ چھیڑ گیا، کہا گیا کہ مولانا کے مطابق مسلمان و ہندو تمام کے تمام ایک قوم ہیں۔ جو مضمون اقبالؔ نے اپنے انتقال سے ایک مہینہ بارہ دن قبل لکھا تھا، اس کی اساس بھی قرآن پر رکھی اور مولانا کی ہر بات کا جواب قرآن کے حوالے سے دیا:

''مولانا نے یہ فرض کر کے کہ مجھے قوم اور ملت کے معنی میں فرق معلوم نہیں اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ (کی) وہاں قاموس کی ورق گردانی بھی نہ کر سکا۔ مجھے عربی زبان سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے، یہ طعنہ سر آنکھوں پر

لیکن کیا اچھا ہوتا اگر میری خاطر نہیں تو عامتہ المسلمین کی خاطر قاموس سے درگزر کر قرآن حکیم کی طرف مولانا رجوع کر لیتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریے کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیش تر خدائے پاک کی نازل کردہ وحی سے بھی اشتہاد فرماتے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں عالم دین نہیں، نہ عربی زبان کا ادیب ہوں:

قلندر جز حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا فقیر شہر قاروں ہے لعنت ہائے حجازی کا

لیکن آپ کو کون سی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف قاموس پر اکتفا کی۔ کیا قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ لفظ قوم استعمال نہیں ہوا؟ کیا قرآن میں ملت کا لفظ متعدد بار نہیں آیا؟ آیا قرآن میں قوم وملت سے کیا مراد ہے اور کیا جماعت محمدیہؐ کے لئے ان الفاظ کے علاوہ لفظ امت بھی آیا ہے یا نہیں؟ کیا ان الفاظ کے معنی میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک ہی قوم اس اختلافِ معنی پر ایسی مختلف حیثیتیں رکھے کہ دینی یا شرعی اعتبار سے تو وہ قوانینِ الٰہیہ کی پابند ہو اور ملکی اور وطنی اعتبار سے کسی ایسے دستور العمل کی پابند ہو جو ملی دستور العمل سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا قرآن سے اشتہاد کرتے تو اس مسئلہ کا حل خود بہ خود ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔''

(اقبال کے نثری افکار، صفحہ:90-189)

اقبالؔ کے قرآنی عقائد کے متعلق اگر غور کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؔ کے نزدیک قرآن تکوینِ کائنات کا خلاصہ اور زندگی کا لائحۂ عمل ہے۔ اگرچہ بزرگان دین نے قرآن کے موضوع پر بڑی محنت کی ہے اور اس میں طرح طرح کے علوم دریافت کیے ہیں۔ اس کو خیر و برکت کی کتاب کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ دفعِ بلیات، رفع آسیب، عارضۂ جسمانی و روحانی کے لئے اس میں بڑی باریکی کے ساتھ نفع بخش پہلو اور اوراد وظائف، تعویذ، گنڈے، نقوش اور جھاڑ پھونک دریافت کیے گئے جو مختلف امراض کے علاج کے لئے ایجاد ہوئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں بعض بعض تیر بہ ہدف بھی ثابت ہوئے لیکن اکثر وبیش تر کسب معاش کی خاطر نافذ ہوئے اور بعض علماء و عاملین کی روزی روٹی کا ذریعہ بنے۔ اس کا تاریک تر پہلو یہ ہے کہ اس قسم کے عملیات میں قرآن کے مفاہیم و معانی کو فراموش کر دیا گیا اور بغیر سوچے سمجھے چیزوں کو حصول مقصد کے لئے استعمال کیا گیا۔ اگر کچھ پڑھ کر پھونک دینے یا دم کر دینے یا دعا کر دینے سے شفا مل جاتی ہے اور مقصد میں کامیابی بھی مل جاتی ہے تو یہ بھی اس آسمانی کتاب کا معجزہ ہی کہا جائے گا، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی میں پیش آنے والی دشواریوں، مصائب اور آلام و مسائل کا سدباب کیسے ہو، اس کے لئے وقتاً فوقتاً نزولِ کتاب ہوتا رہا اور اللہ کی وحدانیت، قدرت کاملہ اور رسالت کے اتباع کو بار بار دہرایا جاتا رہا اور سب سے اہم یہ کہ ان کو یاد دلایا جاتا رہا کہ

تمھیں ایک مقصد کے تحت پیدا کیا گیا ہے اور تم اپنی خلقت کی حقیقت کو مت بھولو کہ تمھیں پھر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اس کی تیاری کرلو، دنیا تو کچھ ہی مدت کے لئے بنائی گئی ہے اور تمھیں اس میں کچھ اختیارات کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ اگر تم خدا کے احکام پر عمل کرو گے تو اجر عظیم پاؤ گے ورنہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ یعنی طرح طرح سے انسان کو دنیا میں خدا کے احکام کی پابندی کے لئے اکسایا اور یاد دلایا گیا ہے۔ اقبالؔ نے لکھا ہے:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے　　تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

یعنی قرآن کو ہر لحظہ پیش نظر رکھنا ہے۔ دنیا اور آخرت کی کامیابی اسی میں ہے۔ اسی کے مطابق عمل کرنے میں دل کی مراد پوری ہوگی۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

انھوں نے تو یہاں تک بتا دیا کہ مسلمان کی زندگی قرآن کی وجہ سے ہے۔ قرآن کے بغیر زندگی باطل اور موت کے برابر ہے:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

(اے مسلمان، گر تو زندہ رہنا چاہتا ہے تو قرآن کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں) اسی وجہ اقبالؔ نے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے دیباچہ کی پہلی سطر میں لکھا تھا:

"The Quran is a book which emphasises 'deed' rather than idea"

قرآن وہ کتاب ہے جو خیال و تصور کی بہ نسبت عمل پر زیادہ زور دیتی ہے)

اقبالؔ کی تقریروں اور تحریروں کے قرآنی موضوعات کا احاطہ ایک مضمون میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک نہایت وسیع و بسیط موضوع ہے اور الگ ایک کتاب تحریر کئے جانے کا متقاضی ہے۔ ضرورت ہے کہ اقبالؔ کے قرآنی شغف اور مطالعے کا باقاعدہ جائزہ لیا جائے۔

## 8.3: 'حضور رسالت مآبؐ میں' کا متن

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا　　جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا

قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی، لیکن　　نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا

فرشتے بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو

حضور آیۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھ کو

کہا حضورؐ نے اے عندلیبِ باغِ بہار　　کلی کلی ہے تری گرمیِ نوا سے گداز

ہمیشہ سرخوش جامِ ولا ہے دل تیرا　　فتادگی ہے تری غیرتِ سجود نیاز

اڑا جو پستیِ دنیا سے تو سوئے گردوں　　سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی　　تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ وگل ہیں ریاضِ ہستی میں　　وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں　　جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

## 8.4: نظم 'حضور رسالت مآبؐ میں' کا خصوصی مطالعہ

یہ نظم ترکی کے شہر طرابلس کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ 1911ء میں اٹلی نے اس بھرے پُرے چہل پہل والے شہر پر حملہ کیا اور طرابلس کے معصوم بے گناہوں کا قتل عام کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس ظلم کے خلاف دنیا کے ہر دردمند انسان کا دل بھر آیا۔ اقبالؔ بھی اس ستم ظریفی کے مقابل چپ نہ رہ سکے اور انھوں نے اپنے الگ انداز میں ایک نظم لکھی جس کا عنوان 'حضور رسالت مآبؐ میں' رکھا۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ زمانہ کے اس ہنگامہ سے گراں بار ہو کر میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس دنیا کو چھوڑ دینا چاہئے اور یہ خیال کر کے جہانِ فانی سے روانہ ہونے لگا۔ میں نے شام وسحر کی قید میں بسر تو کی لیکن کہنہ عالم کے نظام سے واقف نہ ہو سکا۔ اس حالت میں فرشتے مجھ کو بزم رسالتؐ میں لے گئے اور اس ہستی کے سامنے پیش کیا جو سراپا رحمت ہے۔ جس نے دنیا میں ظلم واستبداد کا خاتمہ کیا تھا۔ جب اس غریب پرور نے دیکھا تو مجھ سے کہا اے اقبال تو باغِ حجاز کا بلبل ہے۔ تیری شاعری، تیری آواز سے اس گلشن کی کلی کلی کا دل پگھلا ہوا ہے۔ تیرا دل ہمیشہ عشقِ رسولؐ میں مست ہے اور تیری عاجزی، خاکساری والے سجدے کے لئے قابل رشک ہے۔ تو جو زمین سے اُڑ کر آسمانوں کی طرف آیا ہے تو یہ پرواز کی بلندی اور شاعرانہ خیال کی بلندی تجھے فرشتوں نے سکھائی ہے اور تو دنیا کے باغ سے ایک خوشبو کی طرح نکل کر آیا ہے۔ تو بتا تو ہمارے لئے کیا تحفہ لے کر آیا ہے؟ حضور رسالت مآبؐ کے اس سوال کو سن کر اقبال نے جواب دیا کہ حضور اس دنیا میں سکون وآرام نہیں ملتا۔ چین وسکون ناپید ہے۔ میں جس زندگی کی تلاش میں ہوں، وہ مجھے نہیں ملتی۔ اس گلشن ہستی میں ہزاروں قسم کے پھول ہیں یعنی اس عالم فانی میں ہر طرح کے انسان ہیں لیکن جس انسان میں وفا کی بو ہو، جس شخص میں وفا شعاری کا سرمایہ ہو، وہ اس دنیا میں نہیں ملتا۔ لیکن میں پھر بھی آپ کی خدمت میں ایک پیالہ لے کے آیا ہوں اور اس پیالہ میں تیری امت کی آبرو چھلکتی ہے اور اس میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو ہے۔ یہ نظم علامہ اقبالؔ نے لاہور کی مسجد میں نمازِ جمعہ کے

بعد پڑھ کر سنائی تھی۔طرابلس کا تعزیتی جلسہ تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ مسجد کے صحن، آنگن اور باہر موجود تھے۔ گرمی کا برا حال تھا۔ جب اقبالؔ نے آخری شعر پڑھا تو چیخ و پکار کا یہ عالم ہوگیا کہ لوگوں نے چھتریاں اچھال دیں۔ کپڑے پھاڑ دیے۔عمامے اچھال دیے۔غرض وہ جلسہ ہی ختم ہوگیا۔

یہ نظم جبر و استبداد اور ظلم کے خلاف زبردست آواز ہے اور خود شناسی اور خود آگاہی کا درس دیتی ہے۔ اصل میں اقبالؔ کا پیغام انقلاب ہے اور انھوں نے سب سے پہلے شاعری میں انقلابی خیالات پیش کیے اور انقلاب کا نعرہ بھی علامہ اقبالؔ ہی نے دیا۔

کس نداند جلوۂ آب از سراب　　انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق 1927ء)

## 8.5: 'خضرِ راہ' کا متن

### شاعر

ساحلِ دریا پہ میں اِک رات تھا محوِ نظر　　گوشۂ دل میں چھپائے اِک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر　　تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار　　موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر　　انجم کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر　　جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل　　چشم دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار　　جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
''کشتیِ مسکین''، و''جانِ پاک''، و''دیوارِ یتیم''　　علمِ موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد　　زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟　　اور یہ سرمایہ و محنت میں کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک　　نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی　　فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرم نا و نوش

بیچتا ہے ہاشمی، ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

# جوابِ خضر

## صحرانوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے؟ یہ تگا پوئے دما دم زندگی کی ہے دلیل
اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں نہیں دیکھا نہیں گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام وہ خضر بے برگ وساماں، وہ سفر بے سنگ ومیل
وہ نمودِ اختر سیماب پا ہنگام صبح! یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیلؑ
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

## زندگی

بر تر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے سِرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے گرچہ اِک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

ہوصداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
یا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

## سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی ِ از برہمن کافر تری

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو اِستبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمی گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اِک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

## سرمایہ ومحنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام گیا، ہے پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ساحرِ اَلْمُؤطنے تجھ کو دیا برگِ حشیش! اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ ''خواجگی'' نے خوب چن چن کر بنائے مُسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول غنچۂ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
نغمۂ بیداریِ جمہور ہے سامانِ عیش قصۂ خواب آور اِسکندر و جم کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا آسماں؛ ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک
باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار زخمِ گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو!

## دنیائے اِسلام

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ! جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز
لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستاں سے پارس وہ مئے سرکش، حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در نگر
مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست مورِ بے پر! حاجتے پیش سلیمائے مبر
ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اِک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ وخوں مٹ جائے گا ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر
تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

اے کہ نشانسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حرّیت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں آنے والے دور کی دھندلی سی اِک تصویر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اِک اور بھی گرووں کے پاس سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ المِیْعَاد دار

## 8.6: 'خضرِ راہ' کا تعارف

'خضرِ راہ' بھی اقبالؔ کی سب سے زیادہ مشہور نظموں میں سے ایک ہے۔ 1922ء میں ترکی پر برطانیہ کی یلغار اور سلطنت عثمانیہ پر غاصبانہ تسلط کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ برطانیہ نے ایشیا کی سب سے بڑی سلطنت عثمانیہ پر قبضہ کر کے اس سے چالیس سے زائد ٹکڑے کر کے نئے ملک بنا دیے۔ بڑا حصہ روس کے قبضہ میں چلا گیا، کچھ حصہ چین کے پاس بھی چلا گیا۔ اس طرح سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا۔ اقبالؔ نے یہ سارا منظر بچشم خود ملاحظہ کیا۔ چناں چہ اس نظم میں اس سیاسی انقلاب کی گونج سنائی دیتی ہے۔ نظم میں دو کردار تراشے گئے ہیں، ایک شاعر اور دوسرا ''خضر'' اور ان دونوں کے سوال و جواب میں دنیا کے ہنگاموں، اضطراب و انقلاب کو سمجھایا گیا ہے۔

## 8.7: 'خضرِ راہ' کا خصوصی مطالعہ

عالم خیال میں ہوا یوں کہ ایک رات کو دریا کے ساحل پر شاعر اس نظارے کو دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ فضا بالکل خاموش تھی کہ اچانک شاعر کے سامنے حضرت خضر علیہ السلام آ گئے اور اس طرح گویا

ہوئے کہ اے جویائے اسرار ازل اگر دل کی آنکھ کھلی ہو تو دنیا کی تقدیر سامنے آ جاتی ہے۔ اس پر شاعر نے حضرت خضر علیہ السلام سے کچھ سوالات کیے کہ تو آبادی کو چھوڑ کر جنگلوں میں کیوں گھومتا پھرتا ہے اور تیری زندگی عجیب زندگی ہے جس میں نہ صبح ہے، نہ شام ہے۔ آج ہے، نہ کل ہے۔ مجھے بتایئے کہ زندگی کا کیا راز ہے؟ اور سلطنت کیا چیز ہے؟ اور یہ سرمایہ اور محنت میں کیسی جنگ چل رہی ہے۔ اہل ہاشم دین مصطفیٰ کے ناموس کو بیچ رہے ہیں اور بے چارہ سخت کوش ترک خاک وخون میں مل رہا ہے۔ آج پھر آگ ہے اور اولادِ ابراہیمؑ ہے۔ یہ بتا کیا پھر کوئی نیا امتحان لیا جا رہا ہے۔

شاعر کے یہ سوالات سن کر حضرت خضرؑ نے ان کا جواب دیا اور پھر ایک ایک موضوع پر گفتگو کی۔ سب سے پہلے صحرانوردی کو سمجھایا کہ

**صحرانوردی:** اے اقبال تجھے صحرانوردی پر تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ یہ تگ ودو زندگی کی دلیل ہے۔ کیوں کہ مسلسل حرکت وعمل سے زندگی مضبوط ہوتی ہے اور زندگی کے نہ ختم ہونے کا راز اسی میں ہے۔

**زندگی:** خضرؑ نے بتایا کہ زندگی نفع ونقصان سے آگے کی چیز ہے۔ تو اسے رات دن اور صبح وشام کے پیمانہ سے مت ناپ۔ کیوں کہ زندگی جاوداں ہمیشہ رہنے والی، ہر دم چلتے رہنے والی اور ہر دم جواں ہے اور تو اپنی دنیا آپ پیدا کر۔ دوسروں کا دست نگر بن کر نہ رہ جا۔ اور اس طرح اپنے زندہ رہنے کا ثبوت دے۔ زندہ انسان کی علامت یہ ہے کہ وہ اس مستعار دنیا کو آگ لگا دے اور پھر اس کی راکھ سے اِک نیا جہاں پیدا کرے اور اے شاعر یہ گھڑی محشر کی گھڑی ہے تو محشر کے زمانہ میں ہے۔ اس لئے اے غافل تیرے پاس کوئی عمل کا نمونہ ہو تو پیش کر۔

**سلطنت:** خضرؑ نے بتایا کہ اے شاعر میں تجھے آیتِ پاک انالملوک یعنی جب بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ کر دیتے ہیں، کا مطلب بتاؤں۔ جب غلام ذرا بیدار ہوتے ہیں تو ان کو حکمراں پھر سلا دیتے ہیں۔ سروری تو محض اُس ذاتِ بے ہمتا کو زیب دیتی ہے، وہی اِک حکمراں ہے، باقی سب بتانِ آزری ہیں۔ یہ بڑی بڑی محفلیں، کانفرنسیں، قانون ساز اسمبلیاں، اصلاح معاشرہ اور 'ہیومن رائٹ' سب انگریزی شوکر کوٹیڈ گولیاں ہیں جن کے مزے تو میٹھے میٹھے ہیں لیکن اثر گہری نیند میں سلا دیتا ہے۔

**سرمایہ ومحنت:** پھر خضرؑ نے کہا کہ بندۂ مزدور کو جا کر میرا پیغام سنا دے، کیوں کہ خضرؑ کا پیغام پیامِ کائنات ہے۔ تجھ کو سرمایہ دار بہانے بہانے سے کھا گیا اور ان ہاتھوں کو جو دولت کمانے والے ہاتھ تھے، انھیں مزدوری اس طرح دی جاتی ہے جیسے دولت مند غریبوں کو زکات دیتے ہیں۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب اور رنگ یہ سب سرمایہ دارانہ نظام خواجگی نے چن چن کر نشہ آور گولیاں تیار کی ہیں۔ اے مزدور تو اٹھ جا کہ اب بزم جہاں کا انداز دوسرا ہے۔ اُٹھ کہ اب مشرق ومغرب میں

تیرے دور کا آغاز ہے۔

**دنیائے اسلام:** یہ سوال پوچھنے پر کہ عالم اسلام ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ عرب خواب غفلت میں سوئے ہیں اور ترکوں کو غارت کر کے ختم کیا جا رہا ہے۔ خضرؑ جواب دیتے ہیں کہ مجھے ترک و عرب کی داستان کیا سناتا ہے۔ مجھ سے اہلِ اسلام کا سوز و ساز، کوئی راز چھپا ہوا نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی میراث خدا، عیسیٰؑ اور مریم کے ماننے والے لے گئے اور مقدس سرزمین ان کے کلیسا کی بنیاد بن گئی ہے اور یہ جو مسلمانوں کا لہو پانی کی طرح بہہ رہا ہے تو شاید حقیقت سے واقف نہیں ہے۔ مولانا روم نے کہا ہے کہ جب کسی پرانی عمارت کو از سر نو تعمیر کیا جاتا ہے تو اس کی بنیاد کو ویران کیا جاتا ہے یعنی اہل اسلام کا قتل عام کسی نئی امت، نئی قوم کی خبر دے رہا ہے۔ ایسے دور میں سارے مسلمان اتحاد پیدا کریں۔ وہ نیل سے لے کر کاشغر تک متحد ہو جائیں اور سن لے خلافت کی بنیاد کو مضبوط کرنے کے لئے اپنے اندر سلف صالحین کا دل و جگر پیدا کر۔ تو مسلمان ہے۔ اپنے سینے کو آرزو سے آباد کر لے اور یاد رکھ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

## 8.8: آپ نے کیا سیکھا؟

انسان کو اپنے تمام غموں کا مداوا اپنے آقا کے سامنے رکھنا چاہئے۔ کامیابی کی کنجی مسلسل جدوجہد میں ہے۔ زندگی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ سلطنت جبر و استبداد کا نام ہے۔ سرمایہ دار غریبوں کا لہو چوستے ہیں۔ اسلام کی تفرقہ بازی نے ملت کو کمزور کر دیا ہے۔ تجھے شیعہ، سنّی کے خول سے باہر نکلنا چاہئے۔

## 8.9: اپنا امتحان خود لیجئے

۱۔ فرشتے شاعر کو کہاں لے گئے؟

۲۔ شاعر نے حضرت رسالت مآبؐ کو کیا جواب دیا؟

۳۔ زندگی کی دلیل کیا ہے؟

۴۔ زندگی کیا چیز ہے؟

۵۔ سرمایہ و محنت برسرِ پیکار کیوں ہیں؟

۶۔ دنیائے اسلام کیوں تباہ و برباد ہے؟

## 8.10: سوالات کے جواب

۱۔ فرشتے شاعر کو آسمان میں رسالت مآبؐ کے حضور لے گئے۔

۲۔ شاعر نے حضرت رسالت مآبؐ کو جنگ طرابلس کے شہیدوں کے خون کا پیالہ دیا۔

۳۔ جہد مسلسل، تگائے پوئے، دمادم حضرت خضرؑ کی طرح مستقل سفر زندگی کی دلیل ہے۔

۴۔ زندگی نفع نقصان کے تصور سے پرے ہے۔اس کو روز وشب اور شام وسحر سے نہیں ناپا جا سکتا۔

۵۔ دولت مند، غریبوں، نہتوں اور ناداروں پر ظلم کرتے ہیں۔اس لئے آپس میں نبرد آزما ہیں۔

۶۔ دنیائے اسلام کی تباہی کا سبب آپسی نااتفاقی ہے۔

## 8.11: فرہنگ

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| آیۂ رحمت | رحمت کی نشانی | باغِ حجاز | مراد چمن اسلام، مکہ مدینہ |
| ملائک | جمع ملک کی، فرشتے | ریاضِ ہستی | زندگی |
| آبگینہ | شیشے کا پیالہ | خضرِ راہ | راستہ دکھانے والا (فرشتہ) |
| جہان اضطراب | بے چینی کی دنیا | کشتی مسکین | ایک واقعہ کی طرف اشارہ جب حضرت خضرؑ نے ایک مسکین کی کشتی توڑ دی تھی |
| خروش | شعور، ٹکراؤ | صحرانورد | جنگلوں اور ریگستانوں میں گھومنے والا |
| فطرت اسکندر | سکندر کا سا مزاج | ہاشمی | مراد عرب حکمراں |
| برگ حشیش | بھنگ کا پتّہ | مسکرات | نشہ لانے والی چیزیں |
| ملّتِ بیضاء | روشن قوم | جہانِ پیر | بوڑھی دنیا |
| آئینۂ گفتار | باتوں کا آئینہ، سے بھری باتیں | مراد بصیرت آزمودہ | آزمایا ہوا |
| گردوں | آسمان، تقدیر | تدبیر | انسانی کوشش |

(ماخوذ از عبدالحمید یزدانی)

## 8.12: کتب برائے مطالعہ

۱۔ 'بانگِ درا'، از علامہ اقبال

۲۔ 'شرح بانگِ درا'، از یوسف سلیم چشتی

۳۔ 'کلیاتِ اقبال'، از عبدالحمید یزدانی

۴۔ 'جہانِ اقبال'، از توقیر احمد خاں

۵۔ 'میرے اقبال'، از توقیر احمد خاں

# اکائی9: 'مسجد قرطبہ' اور 'لینن خدا کے حضور میں' کا تنقیدی مطالعہ

ساخت


9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 علامہ اقبالؔ کا مختصر تعارف

9.4 نظم 'مسجد قرطبہ' کا متن

9.5 'مسجد قرطبہ' کا تعارف

9.6 'مسجد قرطبہ' کا تنقیدی مطالعہ

9.7 نظم 'لینن خدا کے حضور میں' کا متن

9.8 'لینن خدا کے حضور میں' کا تنقیدی مطالعہ

9.9 آپ نے کیا سیکھا؟

9.10 اپنا امتحان خود لیجئے

9.11 سوالات کے جوابات

9.12 فرہنگ 'مسجد قرطبہ'

9.13 فرہنگ 'لینن خدا کے حضور میں'

9.14 کتب برائے مطالعہ


## 9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- اقبالؔ کی نظم نگاری کو سمجھ سکیں گے۔
- قومی اور وطنی شاعری کا ادراک کر سکیں گے۔
- طویل نظموں کا اندازہ لگا سکیں گے۔
- اقبالؔ کی نظموں کا مطالعہ کر سکیں گے۔

## 9.2 تمہید

اقبالؔ کی شاعری میں غزلوں کی تعداد بہت کم ہے مگر ساری شاعری منظومات سے پُر ہے۔ نظمیں بیش تر طویل ہیں اور ان کی تکمیل میں مختلف ہیئتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ غزل ایک صنفِ سخن ہے جو قصیدے سے کٹ کر نکلی ہے۔ اس کا ہر شعر الگ مطلب رکھتا ہے۔ لیکن اقبالؔ نے صنفِ غزل کی ہیئت میں نظمیں بھی کہی ہیں۔ اس لئے اسی ہیئت اور غزل کی فورم میں متعدد نظمیں ہیں جن میں خیالات مسلسل ہیں اور ایک شعر دوسرے سے ملحق ہے اور اسی لئے لگا تار مضمون بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ موجودہ اکائی کی دو نظموں میں ترکیب بند کی روش اختیار کی گئی ہے یعنی پہلے غزل کی ہیئت میں ایک بند ہوتا ہے اور پھر اس کے آخر میں اسی بحر و وزن میں ایک ٹیپ کا شعر ہوتا ہے جو الگ ردیف اور قافیہ میں ہوتا ہے اور بذاتِ خود مطلع ہوتا ہے۔ 'مسجد قرطبہ' اور 'لینن خدا کے حضور میں' میں ترکیب بند کی ہیئت استعمال کی گئی ہے۔

اقبالؔ کے شاعرانہ نظام سے قطع نظر ''بالِ جبریل'' کے خیالات، فکر اور فلسفے میں اسلامی تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ خانقاہی سلسلہ، کٹھ ملائیت، صوفی، درویش، قلندر، فقر اور فقہ وغیرہ ''بالِ جبریل'' کے خاص موضوعات رہے ہیں۔ ان موضوعات پر صحیح مذہبی نظر اور صالح انسانی فکر کو بیدار کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ منازل سلوک کا تذکرہ اور متصوفانہ مقامات کا ذکر ''بالِ جبریل'' میں بار بار آتا ہے۔ بعض اشعار میں تو اغراق کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے جو سالک کو عالم استغراق میں حاصل ہوتی ہے:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات　　تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

کائنات پر غلبہ ''بالِ جبریل'' کا ایک خاص پیغام ہے۔ اس میں مردہ اور بے بس غلاموں کی زندگی گزارنے کے بجائے باہمت اور سربلند زندگی کا پیغام ہے۔ ظاہر ہے خود مختار اور خود اعتماد زندگی ہی قوموں کی بقا کی ضامن ہوسکتی ہے۔ اس لئے محکومی اور بندگی میں سرفرازی میسر ہونے کے بجائے ذلت اور خواری نصیب ہوگی۔ ''بالِ جبریل'' میں آزادانہ زندگی گزارنے اور محکومیت سے نبرد آزما رہنے کی آرزو اور اُمنگیں دکھائی دیتی ہیں کہ محکوم قوم غلامی کی زنجیر کو توڑ پھینکے اور خدا کی بسیط فضا میں خود مختار زندگی کا آزادانہ سانس لے۔

ایک نظم خوش حال خاں خٹک میں خوش حال خاں افغانیوں سے کہتا ہے:

کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات　　وہ مدفن ہے خوش حال خاں کو پسند
اُڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ　　مغل شہ سواروں کی گرد سمند

''بالِ جبریل'' وہ کتاب ہے جس میں اقبالؔ تصور وطن کی حدود کو پار کر گئے ہیں۔ اس میں کہیں بھی وطن، ملک یا سیاست کا ذکر اس طرح نہیں ہے جیسا کہ ''بانگِ درا'' میں ملتا ہے۔ یہاں آکر سیاست بھی بین الاقوامی سیاست بن گئی ہے۔ اس کی حدیں ملک و وطن کی سیاست سے نکل کر عالمی سیاست سے مل گئی ہیں۔ آزادی،

خودی،شوق اورعمل وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جوتمام عالمِ انسانیت کے سامنے ایک کارگرنسخہ کی شکل میں پیش کیے ہیں۔

''بالِ جبریل'' کے موضوعات کسی خاص ملک ملت یا مذہب کے حصار سے باہر ہیں۔اس میں جوفکراور پیغام درج کیا گیا ہے، وہ آفاقی حیثیت کا حامل ہے۔ان میں ایک عنصرعمل کا بھی شامل ہے۔''بالِ جبریل'' میں عمل کی اہمت پر بہت زیادہ اصرار ملتا ہے۔عمل اقبالؔ کا مخصوص پیغام ہے، جو''بالِ جبریل'' سے قبل بھی اردواور فارسی دونوں زبانوں کے ذریعہ پہنچایا گیا ہے۔یقیناً عمل اور جدوجہد کامیابی کی کنجی ہے۔زندگی میں عمل اورسخت کوشی کو بے حداہمیت حاصل ہے۔محنت یا جہدوعمل ہمیں نئی تازگی اور نیا حوصلہ عطا کرتا ہے۔خوداعتمادی کا جذبہ انسان میں محنت ہی کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔محنتی اورمشکل پسندانسان کوطوفانوں سے کھیلنا آسان ہوجاتا ہے۔دنیا کی سخت ترین آزمائشیں اورزبردست معرکے اس کے لئے سہل ہو جاتے ہیں۔حصول آرام کی خاطر نئے نئے راستے تلاش کرتے ہوئے محنت کے ذریعہ نئی آرام دہ سہولیات اوراشیاء کی دریافت ہوتی ہے۔زندگی میں آرام محنت ہی کے سہارے پیدا ہوتا ہے۔محنت سے ذہن ودماغ حرکت میں آتے ہیں اور نئے تخلیقی خیالات وجود میں آتے ہیں۔اسی سے زندگی میں ترقی کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔''بالِ جبریل'' میں عمل اورمحنت کی سخت ترین تلقین پائی جاتی ہے۔اقبالؔ کواحساس ہے کہ عمل اورمحنت ہی سے قوم کا سر بلنداورکھوئے ہوئے وقار کی بازیافت ممکن ہے۔زندگی کی تلخیاں اورسختیاں صرف سخت محنت ہی سے آسانی میں تبدیل ہوسکتی ہیں۔'نصیحت' نام کی نظم میں عقاب اپنے بچے سے کہتا ہے:

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام　　سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر　　وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

''بالِ جبریل'' میں اقبالؔ پہلی بار بے حجابانہ مغربی خیالات کے روبہ رونظر آتے ہیں۔وہ مغرب پرستی کو عالمِ مشرق کے لئے زہرناک تصورکرتے ہیں اوراس کی ظاہری چمک دمک پرفریفتہ ہوکر برباد ہونے سے باخبر کرتے ہیں۔اقبالؔ کے خیال میں مغربی حسن وجمال ناپائیدار ہےاوردنیا کے سامنے ایک کھلا ہوادھوکہ ہے:

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے　　کہ بجلی کے چراغوں سے ہےاس جوہر کی براقی

اصل میں فرنگی تہذیب نے ظاہر بہ ظاہر دلکشی اختیار کرکے اہلِ مشرق کی تہذیب کوتباہ وبرباد کردیا ہے۔ افرنگ کی یہ ظاہرداری ایثاراورخلوص پرمبنی نہیں بلکہ اس کے پس پردہ ایک بہت بڑادھوکہ ہے جوخودغرضی اورفریب کاری پرٹکا ہوا ہےاور چکا چوند کردینے والی یہ روشنی ظلمت کدہ کے مترادف ہے۔''بالِ جبریل'' کی نظم 'لینن' میں اس طلسم کوتوڑنے کی کوشش کی گئی ہے:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت　　پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے　　آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

اقبالؔ یورپ جا کر اس تہذیب کو بہ چشم خود دیکھ چکے تھے۔ مشرقی افکار و علوم سے جب انھوں نے مغربی دنیا کا مقابلہ کیا تو اس میں بے روح جسم کے علاوہ کچھ نہ پایا۔ لیکن دُور سے دیکھنے والے اس کی ظاہری خوب صورتی پر مر مٹتے ہیں اور اپنی تہذیب اور اپنے کلچر کو بھول جاتے ہیں۔ ''بالِ جبریل'' میں مغرب بیزاری کا یہ جذبہ عام ہے:

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا　　افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

لیکن یہ تمام دکھاوٹ اور بناوٹ مادہ کی طرح فانی اور چند روزہ ہے۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام　　وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام

''بالِ جبریل'' میں مشرق و مغرب کے اس موازنہ کو اقبالؔ نے گہرے فلسفیانہ انداز کے علاوہ منطقی طور پر بھی سلجھانے کی سعی کی ہے اور ہر لحاظ سے مشرق کو مغرب پر فوقیت دی ہے۔ پیر و مرید میں ایک سوال اور اس کا جواب ملاحظہ کیجئے:

مریدِ ہندی: ہے نگاہ خاوراں مسحور غرب　　حور جنت سے ہے خوش تر حور غرب

پیرِ رومی: ظاہر نقرہ گرا سپید ست و نو　　دست و جامہ ہم سیہ گردو ازو

گویا یہ محض ایک خیال یا گمان نہیں بلکہ اقبالؔ نے استدلالی انداز اور فلسفیانہ تعمیق کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ عالم مغرب ایک طلسم کی مانند ہے۔

اقبالؔ کو یقین ہے کہ عالم کائنات میں انسان بہترین شاہکار ہے۔ لیکن جب اقبالؔ نظام کائنات اور اختیارات کی روشنی میں اس کی حیثیت کو جانچتے ہیں تو وہ اس کو باوجود بعض امور پر قدرت رکھنے کے مجبور محض پاتے ہیں۔ خدا کی سلطنت میں انسان کو جو کچھ دیا گیا، اس میں ایک شے مجبوری اور لاچاری بھی اس کی قسمت میں لکھی گئی۔ چنانچہ اقبالؔ کو بار بار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ قادر مطلق نے اس خلیفۃ الارض کو مزید قدرت عطا کی ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ کیوں کہ احکام خداوندی کی تکمیل کے جوش میں یہ بے بسی انسان کے آڑے آتی ہیں۔ جب وہ مدت مزید میں ان کاموں کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر پاتا ہے تو اتنے ہی اُس کی زندگی جواب دے دیتی ہے اور اُس کا بلاوا آجاتا ہے۔ غرض اس کے مجوزہ کام ادھورے رہ جاتے ہیں اور معاشرہ ایک ایسے نظام کی تشکیل سے محروم رہ جاتا ہے، جس کی آرزو اس شخص کے سینے میں مچلتی رہ گئی۔ ''بالِ جبریل'' کی غزلوں میں اس طرح کے خیالات کے اشارے ملتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں انسان کی اسی بے کسی کا بیان کیا گیا ہے:

کر پہلے مجھ کو زندگیِ جاوداں عطا　　پھر ذوق و شوق دیکھ دل بے قرار کا

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں　　کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے نہ قفس نہ آشیانہ

'بالِ جبریل'' کی زبان غزل کی زبان ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرق کی دنیا میں غزل کا بول بالا تھا اور اسی کی زبان میں شاعری کا لطف محسوس کیا جاتا تھا اور بلاشبہ آج بھی غزل کی زبان اردو ادب وشاعری کی جان ہے اور اس میں سحر آگیں وجد اور شعری اثر پنہاں ہے۔''بالِ جبریل'' میں غزلوں کے علاوہ نظموں کی زبان بھی رنگ تغزل میں ڈوبی ہوئی ہے۔'ذوق وشوق'، 'مسجد قرطبہ'، 'ساقی نامہ'۔'جبریل وابلیس' اور 'لینن خدا کے حضور میں' وہ نظمیں ہیں جو اردو شاعری کا شاہکار مانی جاتی ہیں۔'مسجد قرطبہ' اور 'ساقی نامہ' تو شاید دنیا کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان نظموں کی زبان غزل کی زبان ہے، جس نے ان میں سحر آفریں دل کشی پیدا کر دی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ ''برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائیست، زبان کا لطف ایک طرف رہا۔ غزلیہ زبان کے علاوہ ''بالِ جبریل'' میں بہت سے اشعار سوزِ تغزل کے نہایت عمدہ نمونے ہیں:

حصۂ غزل:-

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد
کبھی حیرت کبھی مستی آہِ سحر گاہی بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا درد مہجوری
مرے جنوں نے زمانے کو خوب پہچانا وہ پیرہن مجھے بخشا کہ پارہ پارہ نہیں
کمالِ جوش جنوں میں رہا میں گرم طواف خدا کا شکر کہ باقی رہا حرم کا غلاف
تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ وہ ادب گہ محبت وہ نگہ کا تازیانہ

مرے ہم صفیر اسے بھی اثر بہار سمجھے
انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

حصۂ نظم:-

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی　　نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق　　وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذت طلب
نہ تھا اگر تو شریک محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا　　مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

وغیرہ بہت سے ایسے اشعار ہیں، جن کی زبان خالصتاً غزل کی زبان ہے۔''بالِ جبریل'' کی پوری شاعری پر یہی رنگ غالب ہے۔ رشید احمد صدیقی مرحوم نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ حسن و عشق کی باتوں میں کشش ہے۔ عشق و محبت کی زبان میں اپنی بات کو سمجھانا زیادہ موثر اور کارگر ہے۔ محبت وہ مشترک جذبہ ہے جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔

''بالِ جبریل'' میں انسان دوستی کا بے مثال نمونہ ملتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب غالباً اردو ادب میں انسان دوستی کا یہ سیاسی تصور پیدا بھی نہیں تھا۔''بالِ جبریل'' کی غزلوں اور نظموں دونوں میں آمریت، ملوکیت اور انسانی استحصال کے خلاف احتجاج کی صدا بے حد بُلند اور جولاں ہے۔ دولت کے پجاری مفلس و نادار پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے بھولی بھالی انسانیت کا خون چوستے ہیں۔ اقبالؔ نے ان پُر فریب ترکیبوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ خیالات اردو زبان و ادب میں رواج پا گئے اور اپنی نئی نئی صورتوں میں نمودار ہونے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ اقبالؔ سے قبل اس نوع کے خیالات کی ابتداء دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اقبالؔ کو احساس تھا کہ دولت کا ذخیرہ خود غرضی کی علامت ہے جو عام انسانوں کی تباہی کا باعث ہے، جب کہ خالقِ کائنات نے ہر انسان کو بنیادی حقوق دے کر جینے کا مساوی حق عطا کیا ہے مگر معاشرہ کے شاطر، عیار اور مکار لوگ طرح طرح کے بھیس بدل کر غریب اور معصوم انسانوں کو دام تزویر میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ سماجی ناانصافی کے اس غم نے اقبالؔ کے کلیجہ کو چھلنی کر دیا ہے۔ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ پیران کلیسا و حرم اے وائے مجبوری　　صلہ ان کی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری
کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا　　اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز
جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو　　جدا ہو دیں سیاست تو رہ جاتی ہے چنگیزی
زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا　　طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

حصۂ نظم میں تو اقبالؔ کی یہ لے اور بھی زیادہ کرخت ہوگئی ہے۔ انسان دوستی کے اس تصور کو لینن کی زبان میں انتہائی آتش ناک طریقے سے ادا کیا گیا ہے:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

فرشتے رونا روتے ہیں:

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

خدا کا فرمان ہوتا ہے:

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشک فرو ما یہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے ہٹا دو

تہذیبِ نوی کار گہہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

یہ تصور اردو ادب میں نادر اور نایاب نمونہ ہے۔ دنیا میں انسان صدیوں سے پریشان ہے۔ آج پھر وہ نئے نئے مسائل سے جوجھ رہا ہے۔ بھوک، افلاس، بے چینی، جبر و ستم، قتل و غارت گری، ناانصافی اور انسانی تباہی وہ عالمی مسائل ہیں جنھوں نے ساری دنیا کو اسیر کر رکھا ہے۔ ملک و سیاست کے جھگڑوں نے اس ارضِ مقدس کو جنگاہ بنا دیا ہے۔ طاغوتی قوتیں برسرِ پیکار ہیں، درپئے آزار ہیں۔ غریب اور نہتی اقوام انسانی حقوق کی دہائی دے رہی ہیں۔ غرض کہ باشرف زندگی کا تصور ناپید ہے۔ دنیا ہر پہلو سے غور کر رہی ہے مگر تلاش حل میں ناکام ہے۔ پوری انسانیت کو اس نوع کے مسائل نے عالمِ اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اقبالؔ نے ''بالِ جبریل'' میں اس طرح کے لاینحل اور پریشان کن مسائل کا حل پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایسے تباہ کن عالم میں بھی انسانیت کی نجات ممکن ہے۔ مایوسی و ناامیدی سے کام چلنے والا نہیں ہے بلکہ ہمت، استقلال اور عمل پیہم کی ضرورت ہے۔ ذرا خودی

بیدار ہوئی اور یقین کی دولت ہاتھ آئی بس انسان نے کامیابی کی راہ پائی:

تری زندگی اسے سے، تری آبرو اسی سے　　جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پر تیغ خودی　　ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ
ہر اِک مقام سے آگے مقام ہے تیرا　　حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں
گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ　　گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں
حادثہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے　　عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے
نہ ستارے میں نہ گردش افلاک میں ہے
تیری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے

''بالِ جبریل'' میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام مسائل کا حل مولانا رومؔی کے افکار میں پنہاں ہے۔ عالمِ مشرق کی نجات انھیں کے نقشِ قدم پر چلنے میں ممکن ہے:

علاج آتشِ رومؔی کے سوز میں ہے تیرا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

حصۂ نظم میں ایک نظم ہے 'یورپ سے ایک خط'، اس میں یہی پوچھا گیا ہے کہ:

اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام　　کہتے ہیں چراغ، رہ اسرارِ ہے رومی

اقبالؔ رومؔی کے اشعار سے اس کا جواب دیتے ہیں:

کہ نباید خورد و جو ہمچو خراں　　آہوانہ درختن چر ارغواں
ہر کہ کاہ و جو خورد قرباں شود　　ہر کہ نورِ حق خورد قرآں شود

'پیر و مرشد' نام کی پوری نظم اس طرح کے مسائل کے لئے وقف کردی گئی ہے۔ اس میں مرید ہندی سوال کرتا ہے اور پیر رومؔی ان مسائل کا جواب دیتے ہیں۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

مرید ہندی:　کس طرح قابو میں آئے آب وگل　　کس طرح بیدار ہو سینے میں دل
پیر رومی:　بندہ باش و بر زمیں رو چون سمند　　چوں جنازہ نے کہ بر گردن برند
مرید ہندی:　تجھ پہ روشن ہے ضمیر کائنات　　کس طرح محکم ہو ملّت کی حیات
پیر رومی:　دانہ باشی مرغکانت بر چنند　　غنچہ باشی کود کانت برکنند
دانہ پنہاں کن سراپا دام شو　　غنچہ پنہاں کن گیاہ بام شو

''بالِ جبریل'' شکست خوردہ انسانیت کے لئے زندگی کا پیغام ہے۔اس میں فریب خوردہ انسان کو راہِ فلاح پر ڈالا گیا ہے۔اپنے دل دوز خیالات کی بناء پر ''بالِ جبریل'' کائناتِ عالم کے لئے صحیفہ کائنات کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہرمن ہیس نے کہا تھا: ''اقبالؔ تین اقلیموں کا فرمان روا ہے۔ایک ہندوستانی فکر کا، دوسرے یورپی فکر کا اور پھر اسلامی فکر کا۔'' ذرا سوچئے اب دنیا میں کیا بچا۔آل احمد سرور صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''پوری اردو شاعری میں ''میرؔ کے منتخب اشعار''، ''دیوانِ غالبؔ'' اور انیسؔ کے کچھ مرثیوں کے علاوہ یہی ایک کتاب ہے جسے ہم اردو شاعری کی عالمی ادب کو دین کہہ سکتے ہیں۔''

سرور صاحب اس عہد کے بڑے مقتدر اقبال شناس ہیں۔ان کے اقبالی عشق میں شاید ''بالِ جبریل'' کا کردار سب سے زیادہ نمایاں ہے۔''بالِ جبریل'' کے سلسلہ میں انھوں نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان انھوں نے ''صرف ایک کتاب'' رکھا ہے۔اس مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''بالِ جبریل'' 1935ء میں شائع ہوئی۔اس وقت انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد علی گڑھ میں انگریزی کے شعبۂ انگریزی میں لکچرر تھا۔شیکسپیئر اور شارومانی شعرأ روسی ناولوں کے ترجمے فاؤسٹ، ڈکنس اور ہارڈی وغیرہ بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔میرؔ، غالبؔ، نظیرؔ، انیسؔ سے بھی آشنا تھا۔''بانگِ درا'' کی بیش تر نظمیں زبانی یاد تھیں۔باقیات فانی اختر شیرانی سے بھی خاصی جان پہچان تھی۔اقبالؔ پسند تھے مگر اقبالؔ سے عشق اس وقت شروع ہوا جب میں ''بالِ جبریل'' پڑھی۔''

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ''بالِ جبریل'' میں کائنات اور جوہر کائنات سبھی کچھ مل جاتا ہے۔اس کا رنگ اور اس کا دم اتنا پختہ ہے کہ ہر رنگ پر غالب ہے۔اقبال ماورائے کائنات جو باتیں کرتے ہیں، اس کا تعلق نظام کائنات سے ٹوٹتے نہیں پاتا بلکہ یہ شاعری مکاں اور لامکاں دونوں کے رشتوں کو استوار کرتی ہے اور صحیفۂ کائنات کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

## 9.3: علامہ اقبالؔ کا مختصر تعارف

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ دنیا کے عظیم شاعر ہیں۔ان کے کلام کی شہرت ہندوستان اور ایشیا سے نکل کر یوروپ تک جا پہنچی۔ان کے کلام میں قوم و وطن کا درد پنہاں ہے، وہ ایک فلسفی اور مفکر شاعر ہیں، اس لئے کائنات کی ہر چیز پر غور کرتے ہیں۔اقبالؔ کی شاعری جوش اور ولولہ سے بھری ہوتی ہے۔اس لئے ہمت اور حوصلہ پیدا کرتی ہے، غور و فکر پر مجبور کرتی ہے۔اس اکائی کی نظموں میں اقبالؔ کے کلام کا مختصر نمونہ ملتا ہے۔

## 9.4: نظم 'مسجد قرطبہ' کا متن

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات — سلسلۂ روز و شب، اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلۂ روز و شب، صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر ہوں کم عیار — موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا — ایک زمانے کی رَو، جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر — کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کُہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا!

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام — جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اُس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو — عشق خود اِک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیلؑ، عشق دلِ مصطفیٰؐ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر، سِل کو بناتا ہے دِل — خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز — تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود
عرشِ معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں — گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہر کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا — اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ میرا ذوق و شوق　　دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق مری لَے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہُو میرے رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل　　وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائیدار، تیرے ستوں بے شمار　　شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور　　تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں، کہ ہے　　اس کی اذانوں سے فاش سِرِّ کلیمؑ و خلیلؑ
اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور　　اس کے سمندر کی موج، دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب　　عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیٔ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق　　بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

مردِ سپاہی ہے، وہ اس کی زرہ لَا اِلٰـــــــہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لَا اِلٰـــــــہ

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز　　اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقامِ بلند، اس کا خیالِ عظیم　　اس کا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات　　ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں　　اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

کعبۂ اربابِ فن؛ سطوتِ دینِ مبین　　تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر　　قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار　　حاملِ ''خلقِ عظیم''، صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب　　سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے، شاہی نہیں

جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی خوش دل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملّت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب راز خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُر سوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت کشتیِ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

## 9.5: 'مسجد قرطبہ' کا تعارف

یہ عظیم الشان نظم علامہ اقبالؔ نے ہسپانیہ میں قیام کے دوران شہر قرطبہ کی جامع مسجد کی زیارت کے بعد

لکھی جو صدیوں سے بند پڑی ہے اور اپنی شان کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ فاتحین نے اسے مسمار کر کے ایک حصے میں گرجا بنا دیا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اس مسجد کی شان و شوکت اور اس کے معماروں کی ہنرمندی کی داد دی ہے۔ اس نظم میں آٹھ بند ہیں اور ہر ایک بند ایک خاص موضوع اور خاص خیال پیش کرتا ہے۔

## 9.6: 'مسجد قرطبہ' کا تنقیدی مطالعہ

پہلے بند میں اقبالؔ نے وقت یعنی زمانے کی حقیقت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ ہر شئے کی اصل زمانہ ہے، یہی نئے واقعات اور حالات کو پیدا کرتا ہے۔ یہ صرّاف کی طرح کھرے کھوٹے کو پرکھتا ہے اور جو کھوٹا ہوتا ہے، اسے ختم کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ اصل حیات و ممات ہے۔ اس میں نہ دن ہے، نہ رات ہے۔ نہ ماضی، نہ حال، نہ مستقبل، بلکہ یہ ایک وحدت ہے۔ اس کے ساتھ اقبالؔ نے دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا کے تمام معجزے آنی و فانی ہیں۔ کارِ جہاں بے ثبات ہے۔ دوسرے بند میں اقبالؔ نے بتایا ہے کہ اس کے باوجود وہ چیز غیر فانی ہو جاتی ہے جس کو کسی مردِ خدا یا عاشقِ رسولؐ نے ہاتھ لگایا ہو۔ عشق ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر موت حرام ہے۔ عشق کے ہزاروں مقامات ہیں۔ مٹی کے پتلے میں بھی تابناکی اسی عشق کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔

اے مسجد قرطبہ تجھ کو بھی عشق والوں نے تعمیر کیا ہے۔ اس لئے تیرے اندر بھی رنگِ دوام پیدا ہو گیا ہے۔ تو اللہ والوں کے فن کا معجزہ ہے، جس میں ان کا خونِ جگر صرف ہوا ہے۔ معجزۂ فن خونِ جگر سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جگر سوزی اور دل گدازی فرشتوں کو بھی میسر نہیں ہے۔ میں کافر ہندی ہوں مگر میرا دل عشقِ رسول سے لبریز ہے۔ میرے دل اور لب پر ہر لمحہ صلوٰۃ و درود رہتا ہے۔

اے حرمِ قرطبہ تیرا جلال و جمال مردانِ خدا کے جلال و جمال کا مظہر ہے۔ تیری خوب صورتی اور شان نرالی ہے۔ تیرے بے شمار ستون ہیں جو صحرائے شام میں کھجوروں کے درخت معلوم ہوتے ہیں۔ تیرا منار بلند جبرئیلؑ کے اترنے کی جگہ معلوم ہوتا ہے۔ اے حرمِ قرطبہ مسلمان کبھی بھی مٹ نہیں سکتا کیوں کہ اس کی زندگی میں حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ، حضرت خلیل اللہؑ کا راز پوشیدہ ہے۔ وہ ایک مرد سپاہی ہے اور اس کی تلوار اور اس کی زرہ بکتر لا الٰہ الا اللہ ہے۔

اے قرطبہ کی جامع مسجد تجھ سے بندۂ مومن کا راز فاش ہوا ہے۔ اس کا مقامِ بلند اور خیالِ عظیم ظاہر ہوا ہے۔ بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ خاکی ضرور ہے مگر نوری و مولائے کائنات کی صفات کا حامل ہے۔ وہ گرم عمل اور نرم گفتگو ہے۔ رزم و بزم میں پاک و پاکباز رہتا ہے۔

اے حرم قرطبہ اندلس کی سرزمین تیری وجہ سے حرم کعبہ کی طرح مقدس ہو گئی ہے۔ تیرے حسن کی نظیر اگر کہیں ہے تو صرف مسلمان کے دل میں ہے۔ وہ مردانِ حق اور حاملِ خلقِ عظیم تھے۔ ان کی حکومت نے ثابت کر دیا

کہ اہلِ فقر کی حکومت فقیری ہے، شہنشاہی نہیں ہے۔ ان پاکباز شہسواروں کی بدولت آج بھی اندلس کے لوگ خوش اخلاق اور گرم جوش ہیں۔ ان کے اندر آج بھی حجازی رنگ موجود ہے۔

گزشتہ دو بندوں کے ساتھ اس ساتویں بند میں بھی اقبالؔ مسجد قرطبہ کا حال بیان کرتے ہیں کہ اس تقدس کے باوجود تیری فضا صدیوں سے بے اذان پڑی ہوئی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ میں بھی پھر وہی انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ مسلمان کی روح میں پھر وہی اضطراب پیدا ہو چلا ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہوتا ہے۔

آخری بند میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے آب روانی کبیر تیرے کنارے یعنی مسجد قرطبہ میں کھڑا ہوا کوئی شخص بھی یعنی خود اقبالؔ کسی آنے والے نئے زمانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ میں اس راز کو فاش کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ اگر وہ افکار بیان کروں تو مغرب اس کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ جس زندگی میں انقلاب نہ ہو وہ موت ہے۔ دل میں عشق اور تڑپ پیدا کر۔ مسلمانوں کو مشکلات سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ عشق کے بغیر سب ارادے ناکام ہیں۔

## 9.7: نظم 'لینن خدا کے حضور میں' کا متن

اے انفس و آفاق میں پیدا تری آیات — حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے کہ یا کہ نہیں ہے — ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے — بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت — میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے — تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات!
اِک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں! — حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے — کانٹے کی طرح دِل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا — جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ — وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی — مغرب کے خداوند درخشندہ فِلّزات!
یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات!

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت! — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر — تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
مے خانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل! — بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام — یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے، مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تیری منتظرِ روزِ مکافات!

## 9.8: 'لینن خدا کے حضور میں' کا تنقیدی مطالعہ

''لینن'' (خدا کے حضور میں) علامہ اقبالؔ کی مقبول و معروف کتاب ''بالِ جبریل'' کی معرکتہ الآرا نظم ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبالؔ نے مشرق و مغرب کے سیاسی افکار کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا میں رائج آمریت کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے یہ سوال بھی لینن کی زبان سے اٹھایا ہے کہ اس دنیا میں کون سا انسان ہے جو تیری عبادت کرتا ہے؟ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ لینن جو کارل مارکس کا پیروکار تھا اور خدا کی ذات میں یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کی کوششوں سے زار روس کا تختہ پلٹا گیا تھا، جو روس کا شہنشاہ تھا۔ ایک ایسا شخص جو خدا کو نہیں مانتا لیکن مرنے کے بعد خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور خدا کے سامنے جا کر کہتا ہے کہ اے خدا اس میں کوئی شک نہیں کہ تو زندہ اور پائندہ ہے، تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، دنیا کی ہر شئے سے تیری نشانیاں ظاہر ہیں۔ اے خدا میں مجبور تھا کہ دنیا میں طرح طرح کے خیالات آتے رہتے تھے تو میں کیسے سمجھ لیتا کہ تو ہے یا نہیں ہے۔ دنیا کے دانش ور اور سائنس داں کوئی بھی سرودِ ازل کی فطرت سے واقف نہیں تھا۔ لیکن آج اپنی آنکھ سے دیکھا تو ثابت ہو گیا کہ مذہبی خیالات محض خرافات نہ تھے۔ ہاں جو تیری ذات و صفات کے بارے میں کہا جاتا تھا، وہ آج پوری طرح واضح ہو گیا ہے۔ لیکن اے خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات میں تجھ سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں، اگر تو اجازت دے تو عرض کروں اور بات ایسی ہے جس کو دنیا کے حکیم اور عقلمند لوگ حل نہ کر سکے۔ اے خالقِ کائنات مجھے یہ بتا دے کہ اس آسمان کے نیچے کون سا انسان ہے جو تجھ کو معبود مانتا ہے اور

صرف تیری عبادت کرتا ہے۔مشرق کے لوگوں نے مغرب کے سفید انسانوں کو اپنا خدا سمجھا ہوا ہے اور مغرب کے لوگوں نے زمین کے اندر سے نکلنے والی قیمتی چمک دار دھاتوں کو اپنا خدا سمجھا ہوا ہے اور یہ یورپ، یہ مغرب، یہ فرنگی دنیا ظاہر میں چمک دار ہے لیکن حقیقت میں تنگ و تاریک ہے۔ یہاں عمارتیں اونچی اور دلکش ضرور ہیں لیکن وہ تیری عبادت گاہوں کی نہیں بنکوں کی عمارتیں ہیں، جہاں کھلے عام سود کا کاروبار ہوتا ہے۔اور یہ ظاہر میں تجارت نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں جوا ہے، ایک شخص کا سود لاکھوں کے لیے ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔مغربی دنیا کا یہ علم و حکمت، یہ تدبر اور حکومت بظاہر تو یک جہتی کی تعلیم دیتے ہیں لیکن حقیقت میں انسانوں کا لہو پیتے ہیں۔دنیا فرنگی تہذیب کو باعث فخر سمجھتی ہے لیکن وہاں بے روزگاری ہے، عریانیت ہے، بے حیائی ہے، شراب نوشی ہے اور غربت و افلاس ہے۔ یہ قوم فیضان سماوی سے محروم ہے۔اس کے کمالات کی حد سائنس، فلسفہ، تکنالوجی اور جدید آلات ہیں۔جبکہ مشینوں کی حکومت دل کے لئے موت ہے کیوں کہ آلات احساسِ مروّت کو کچل ڈالتے ہیں۔ بے جان مشینوں میں محبت و ہمدردی نہیں ہوتی۔لیکن اب دنیا میں انقلاب کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔لگتا ہے کہ تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے مات دے دی ہے۔اے خدائے وحدہٗ لاشریک تو قادر و عادل ہے مگر تیری دنیا میں غریب مزدوروں کے حالات واوقات بہت تلخ ہیں۔اے خدائے لم یزل یہ تو بتا دے کہ اس آمریت کا تختہ کب پلٹے گا۔ اس سرمایہ پرستی کا سفینہ کب غرق ہوگا کہ ساری دنیا تیرے بدلہ لینے والے دن روز مکافات کے انتظار میں ہے۔

## 9.9: آپ نے کیا سیکھا

اقبالؔ کا پیغام عشق ہے۔عشق کرنے والوں کے ہاتھ سے بڑے بڑے کارنامے سرزد ہوتے ہیں۔ اسپین کی مسجد قرطبہ اس کی مثال ہے۔اقبالؔ دنیا میں نئے انقلاب کے منتظر ہیں، جہاں ہر نقطۂ نگاہ سے بنی نوع انسان کی نجات ممکن ہو۔اسی طرح ''لینن خدا کے حضور میں'' میں بھی ظلم و زیادتیوں کے خاتمہ کی تمنا اور مظلوموں اور ناداروں کی امداد کی خواہش کی گئی ہے۔انقلاب زندگی کی علامت ہے۔جس زندگی میں انقلاب نہ ہو وہ موت کی مانند ہے۔

## 9.10: اپنا امتحان خود لیجئے

۱۔ لینن کون تھا؟

۲۔ مسجد قرطبہ کہاں پر واقع ہے؟

۳۔ مشرق والے کس کو خدا سمجھتے ہیں؟

۴۔ مغرب والوں نے کس کو اپنا خدا سمجھا ہوا ہے؟

## 9.11: سوالات کے جوابات

۱۔ لینن روس کا سیاسی رہنما تھا۔ اس نے 1917ء میں روس میں نظریۂ سوشلزم کے تحت انقلاب برپا کیا۔

۲۔ مسجد قرطبہ اسپین میں واقع ہے، جہاں سات سو سال مسلمانوں کی حکومت رہی۔ اب وہاں عیسائیوں کی حکومت ہے۔

۳۔ مشرق والے اہلِ مغرب کو اپنا خدا سمجھتے ہیں۔

۴۔ مغرب والوں نے زمین کی معدنیات یعنی قیمتی دھاتوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھا ہوا ہے۔

## 9.12: فرہنگ 'مسجد قرطبہ'

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| مسجد قرطبہ | ہسپانیہ (اسپین) کے خلیفہ عبدالرحمٰن نے اس مسجد کی بنیاد آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں رکھی تھی | حریر دورنگ | دورنگا ریشم |
| سیل | طوفان | صیرفی | صرّاف، کھوٹا کھرا پرکھنے والا |
| چنگ | باجا | معجزہ ہائے ہنر | فن کے غیر معمولی کارنامے |
| نو | نیا | منزل آخر | مراد انجام |
| صاحب فروغ | روشنی والا | اصل حیات | زندگی یعنی دائمی زندگی کی بنیاد |
| دجلہ و دنیوب و نیل | دجلہ ملک عراق کا بڑا دریا، دنیوب یوروپ کا اور نیل ملک مصر کا دریا، یہ وہ وقت تھا جب سلیمان اعظم کی حکومت تینوں ملکوں میں تھی | گنبد نیلوفری | مراد آسمان |
| تاب | طاقت | خونِ جگر | انتہائی جدوجہد اور محنت |
| سودائے خام | نیم دیوانگی | | |

(الفاظ و معانی ماخوذ از کلیاتِ اقبال از عبدالحمید یزدانی، شرح و مفاہیم ماخوذ از شرح بالِ جبریل از یوسف سلیم چشتی)

## 9.13: فرہنگ 'لینن خدا کے حضور میں'

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|

| | | | |
|---|---|---|---|
| انفس | جمع نفس کی مراد بنی نوع انسانی | آفاق | جمع افق کی مراد کائنات |
| آیات | نشانیاں، جمع آیت کی | زندہ و پائندہ | ہمیشہ قائم رہنے والا |
| متغیر | بدلتے رہنے والے | محرم | واقف |
| بینائے کواکب | مراد نجومی، سائنس داں | دانائے نباتات | پودوں وغیرہ کے علم کا ماہر |
| کلیسا | عیسائیوں کی عبادت گاہ، چرچ | متلاطم | طوفانی آدم |
| فِلِّزات | چمکتی ہوئی دھاتیں | ظلمات | تاریکیاں، سمندر |
| مرگِ مفاجات | اچانک موت | مساوات | برابری |
| مغرب | مراد یورپ | کرامات | جمع کرامت کی، غیر معمولی کارنامے |
| عادل | عدل و انصاف والا | سرمایہ پرستی | دولت کی عبادت |
| سفینہ | کشتی | روزِ مکافات | بدلے یا سزا کا دن |

(الفاظ و معانی ماخوذ از کلیاتِ اقبال از عبدالحمید یزدانی، شرح و مفاہیم ماخوذ از شرح بالِ جبریل از یوسف سلیم چشتی)

## 9.10: کتب برائے مطالعہ


۱۔ 'کلیاتِ اقبال' (صدی ایڈیشن)، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ 'کلیاتِ اقبال'، مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی، مکتبہ جمال، اُردو بازار، لاہور۔

۳۔ 'کلیاتِ باقیاتِ اقبال'، ڈاکٹر صابر کلوروی۔

۴۔ 'زندہ رود'، جاوید اقبال، اقبال اکیڈمی، لاہور۔

۵۔ 'بانگِ درا مع شرح'، از یوسف سلیم چشتی، پٹوان، دہلی۔

۶۔ 'بالِ جبریل مع شرح'، از یوسف سلیم چشتی، پٹوان، دہلی۔

۷۔ 'جہانِ اقبال'، از توقیر احمد خاں، عذرا بک ٹریڈرس، نئی دہلی۔

۸۔ 'اقبال اور ہندوستان'، از توقیر احمد خاں، عذرا بک ٹریڈرس، نئی دہلی۔

# اکائی10: 'شعاع امید' کا تنقیدی تجزیہ

ساخت

10.1: اغراض ومقاصد

10.2: تمہید

10.3: 'شعاع امید' کا متن

10.4: نظم کا پس منظر

10.5: نظم کا تعارف اور تجزیہ

10.6: آپ نے کیا سیکھا؟

10.7: اپنا امتحان خود لیجئے

10.8: سوالات کے جوابات

10.9: فرہنگ

10.10: کتب برائے مطالعہ

## 10.1: اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- اقبالؔ کی شاعری سے آگاہ ہوں گے۔
- شاعرانہ خوبیوں سے واقف ہوں گے۔
- نظم فہمی کا شعور پیدا کر سکیں گے۔
- شاعرانہ زبان کی خوبیوں سے باخبر ہو سکیں گے۔
- عہدِ اقبال کے سیاسی افکار سے واقف ہوں گے۔
- حبّ الوطنی کا جذبہ پیدا کر سکیں گے۔
- قوم اور ملک کی خدمت کے لئے ہر ممکنہ کوشش کرنا سیکھیں گے۔
- نامساعد حالات کا مقابلہ کرنا سیکھیں گے۔
- حالات سے تنگ آ کر نہ گھبرانا سیکھیں گے۔

- پریشانی کے دور میں بھی ثابت قدم رہنے کا درس حاصل کریں گے۔

## 10.2: تمہید

علامہ اقبال واحد ایسے شاعر کامل ہیں جو بیک وقت شاعر بھی ہیں، مفکر ملت بھی، حکیم الامت بھی، فلسفی بھی اور سیاست داں بھی۔ اقبالؔ کے زمانے میں یوروپ کا بہت چرچا تھا۔ عالمِ مشرق یعنی ایشیا میں یوروپی اقوام کی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ انھوں نے مشرقی دنیا میں مغربی افکار نافذ کر دیے تھے، جس سے عالمِ مشرق میں تاریکی اور اندھیرا چھا گیا یوروپ کی مشینوں نے مشرقی ممالک کو سیہ پوش کر دیا۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں نظر آتا رہا جہاں روشنی کی کوئی امید نہیں تھی۔ سورج کی کرنیں بھی اس تاریکی سے گھبرا اُٹھیں۔ مشرق کی روشن خیالی مفقود ہو چکی تھی۔ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔ سورج جو ہماری دنیا کو روشنی فراہم کرتا، وہ اپنی کرنوں سے گفتگو کرتا اور اس اندھیرے سے مایوس نظر آتا لیکن سورج اور کرنوں کے درمیان مکالمہ ہوتا رہا اور اس مکالمہ میں بڑے کام کی بات نکل کر سامنے آتی ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس تاریکی سے گھبرا کر بیٹھ جانے کو بہتر نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ نئے فکری رویوں اور صالح جذبات کی بنیاد پر اس دنیا کو اپنی چمک سے روشن کیا جائے اور چاروں طرف اُجالا پھیلایا جائے۔

یہ امر بدیہی اور مسلم ہے کہ اقبالؔ کی شاعری کی ابتدا جبر و تشدد کے خلاف ہوئی تو اس کی انتہا بھی امن و سلامتی پر ہوئی۔ اقبالؔ کی اوّلین نظموں میں 'نالۂ یتیم' وہ نظم ہے جو ایک بے بس اور بے یار و مددگار بچے کے احساسات کی سرگزشت ہے جو مصاف زندگانی میں ظالم دنیا سے نبرد آزما ہونے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ رنج والم، نا اُمیدی اور اضمحلال اس کے دل و دماغ پر سوار ہے:

آہ کیا کہیے کہ اب پہلو میں اپنے دل نہیں — بجھ گئی جب شمع روشن در خود محفل نہیں
اے مصافِ نظم ہستی میں ترے قابل نہیں — نا اُمیدی جس کو طے کر لے یہ وہ منزل نہیں

ہائے کس منہ سے شریک بزم مے خانہ ہوں میں
ٹکڑے ٹکڑے جس کے ہو جائیں وہ پیمانہ ہوں میں

اسی طرح ایک نظم 'یتیم کا خطاب ہلال عید سے' بھی ہے، جس کے نزدیک عید کا چاند دل دکھانے والا ہے، دنیا و مافیہا اس کے لئے اندوہناک ہے:

درد دل کا بھی کیا فسانہ ہے — خون رونے کا بھی اِک بہانہ ہے
قابل بحر زندگی نہ ہوا — ٹکڑے ٹکڑے میرا سفینہ ہوا
عید کا چاند آشکار ہوا — تیر غم کا جگر کے پار ہوا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند　　اس چمن کو نہیں بہار پسند
زندگی نام رکھ دیا کس نے
موت کا انتظار ہے دنیا

حقیقت میں اقبالؔ کی شاعری کی روح انسانی ہمدردی ہے جو ظلم وستم کے خلاف ہے۔''بانگِ درا'' کی پہلی نظم جس سے صحیح معنی میں اقبالؔ کی شاعری کی ابتداء تسلیم کی جاتی ہے۔اس میں ذی روح تو کیا غیر ذی روح بھی امن وسکون کا مظہر ہے، برگ گل دستِ گلچیں کی شقاوت سے محفوظ ہے۔کلیوں سے بوجھل شاخیں چین اور سکون کی نیند کے خمار میں جھومتی ہیں:

جنبش موج نسیم صبح گہوارہ بنی　　جھومتی ہے نشہ ہستی میں ہر گلچیں کی گلی
یوں زبان برگ سے گویا ہے اس کی خامشی　　دست گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

یہ ہی نہیں بلکہ اقبالؔ خواہش مند ہیں کہ اس دنیا میں گزرے ہوئے قدیم پُر امن زمانہ کا دور لوٹ کر آ جائے آج کی سفاک، دل خراش اور دل آزار دنیا میں گزشتہ زمانہ کی سیدھی سادی زندگی واپس آ جائے۔نظم 'ہمالہ' کا آخری بند یاد کیجئے:

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا　　مسکن آبائے انساں جب بنا دامن تیرا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا　　داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ان اشعار سے لطف وترحم کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔غیض وغضب اور بغض وعناد کے مقابل محبت وشفقت جھلکتی ہے۔اس اعتبار سے دل شکنی اور دل آزاری اقبالؔ کی دنیا میں حرام ہے۔وہ تو دلوں کو ملانے اور ٹوٹے ہوئے قلوب کو جوڑنے کی فکر میں رہتے ہیں جو خوب وزشت کے امتیاز سے بالاتر ہے۔متعدد اشعار احترام انسانیت کا مظہر ہیں۔مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کریں:

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں　　کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے　　آتے ہیں جو کام دوسروں کے
راتوں کے چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم　　امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
وصل کے اسباب پیدا ہوں تیری تحریر سے　　دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تیری تقریر سے
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے　　تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو　　جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے ذرا سے بیج سے پیدا شرار طور ہوتا ہے
جو تو سمجھے تو آزادی ہے، پوشیدہ محبت میں غلامی ہے اسیرِ امتیاز ما و تو رہنا
محبت ہی سے شفا پائی ہے بیمار قوموں نے کیا ہے اپنے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا
آ غیریت کے پردے اِک بار پھر اُٹھا دیں بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

شکتی بھی شانتی بھکتوں کے گیت میں ہیں
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

وغیرہ متعدد اشعار ایسے ہیں جو مفاد پرستی اور خودغرضی کے اثر سے پاک ہوکر محبت واخوت کا وہ پیغام دے رہے ہیں، جس کے ذریعے دھرتی کے باسیوں کی نجات ممکن ہے۔ یہاں یہ دکھانا مقصود ہے کہ اقبالؔ کی شاعری کا جوہر حزن وملال ہے، اس کا مزاج غم پرور ہے۔ مسرت اور نشاط انگیز نہیں:

موج پر رقص کرتا ہے حباب زندگی ہے الم کا سورہ بھی جزو کتاب زندگی

اس نوع کے اشعار سے اقبالؔ کا کلام بھرا پڑا ہے، لیکن شاید یہاں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ تو اقبالؔ کا ابتدائی کلام ہے۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ اقبالؔ کا کلام از اوّل تا آخر انسانی دردمندی سے پُر ہے۔ ان کے یہاں بنی نوع آدم کے لئے وہی شفقت اور پیار نظر آتا ہے جو شروع میں تھا اور بلاشبہ یہ پیغام ڈرانے، دھمکانے، خوف و ہراس پیدا کرنے اور ہر قسم کے جبر تشدد کی خو کے یکسر منافی ہے۔

غور فرمائیں تو تعجب ہوگا کہ عین عنفوان شباب کی شاعری میں اقبالؔ پوری طرح Surrender کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس دنیا کی کس کس چیز کو سدھارا جائے، آخر تنگ آ کر بے زاری و دست برداری کی کیفیت نمایاں ہوئی:

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے تیرے فسانے

انھیں انسانی حدود اور اختیارات کا بہ خوبی اندازہ ہے۔ یہ احساس محرومی جس کا تذکرہ سطور بالا میں بہ شکل ملال کیا جا چکا ہے، اس دور میں بھی باقی ہے:

کیا عشق ایک زندگی مستعار کا کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا
وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک اس میں مزہ نہیں ہے تپش و انتظار کا
میری بساط کیا ہے تب و تاب یک نفس شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا

تری دنیا میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تیری بادشاہی

خدا بادشاہ ہے۔ کائنات اسی کی ہے۔ وہی اس کو ٹھیک کرنے والا بھی ہے۔ یہ انسانی بے بسی ''بالِ جبریل'' کی غزلوں میں شروع ہی سے نظر آتی ہے:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا　　مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اقبالؔ یہاں بھی کرخت مزاجی اور شقی القلبی کے روادار نہیں وہ تو دلوں کو درد و محبت سے معمور دیکھنا چاہتے ہیں۔ معاندانہ کینہ پروری اور بدلہ کی جھلستی ہوئی آگ سے یکسر پاک:

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر　　حریمِ کبریا سے آشنا کر

یہ تو ظاہر اور خارج کی دنیا ہے جس نے بغض و عناد کی آگ کو بھڑکا رکھا ہے ورنہ عالم باطن یعنی دل کی دنیا میں کسی طرح کا امتیاز نہیں ہے۔ وہ دنیا کی آلائشوں سے آزاد ایک طرح مسرور اور مگن دنیا ہے جو نہایت دل پذیر ہے۔ وہاں کسی زبردست کی حکومت نہیں چلتی اور نہ اس میں امتیاز من وتو کا بکھیڑا، وہ دنیا پاک صاف اور امن و سکون والی دنیا ہے، خارجی دنیا کو اسی کی اتباع کرنی چاہیے:

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج　　من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

یہاں تو مردانِ غازی کا حسن لحاظ و مروت سے معمور ہے اور یہی وہ خوبی اور یہی وہ کمال ہے، جس کی بنا پر مردانِ غازی عالمگیر صفات کے حامل بنے۔ ان کے عمل اور ان کے خمیر میں دل نوازی یعنی دوسروں کے دل کو موہ لینے کا انداز ہے۔ ''بالِ جبریل'' کی غزل میں لکھتے ہیں:

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا　　مروّت حسنِ عالم گیر ہے مردانِ غازی

درد و غم اور انس و محبت کا یہ مظاہرہ وہ شئے ہے، جس سے اقبالؔ کا کلام کبھی بھی خالی نہیں رہا۔ اواخر عمر کے کلام میں بھی اقبالؔ ظلم و زیادتی اور ستم کشی کے زبردست مخالف رہے ہیں۔ ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' میں خوں بہانے اور خون چوسنے کی حکمت عملی سے مغموم ہیں۔ وہ اس ریاکاری کا بھی شدید مقابلہ کرتے ہیں جو ظاہر بہ ظاہر امن و سکون اور بھائی چارہ کا پیغام دے لیکن حقیقت میں خون آشامی کے امور کو انجام دیتے ہیں۔ وہ پُر زور الفاظ میں کہتے ہیں:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت　　پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

اقبالؔ کو وہ علم و دانش بھی ناپسند ہے جو بے گناہوں کا لہو بہانے کا سبب بنتی ہے یا اس پر آمادہ کرتی ہے۔ بہ الفاظ دگر صداقت، انسانیت اور شرافت کا قتل کرتی ہے اور یہ گناہ ناقابل تلافی ہے۔ انتہا پسندی، دہشت گردی یا ستم شعاری چاہے کہیں بھی ہو، اقبالؔ کو ایک آنکھ پسند نہیں۔ خوں ریزی کا عمل کہیں بھی ہو نامحبوب اور ناپسندیدہ ہے، اقبالؔ اس قابلِ تفریق عمل کی سخت مذمت کرتے ہیں:

جہانِ مغرب کے بت کدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں　　ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہے عقل عیار کی نمائش

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے  طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

''ارمغانِ حجاز'' عمر عزیز کے آخری حصہ کی تصنیف ہے۔اس میں درویشی اور قلندری کا تذکرہ عام ہے۔ فغان سحر درویش کا سرمایہ امتیاز ہے جواَب نایاب ہو چکا ہے۔اقبالؔ اس کھوئی ہوئی فغانِ سحری کی بازیابی،نوائے غم آلود کی عزت اور دولت دلِ ناشاد کی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ متاعِ گراں مایہ جوش اور جذبہ سے عاری نہیں ہے لیکن یہ بالکل نمایاں ہے کہ جابرانہ عملِ ستم گری سے یکسر پاک ہے۔اقبالؔ کا مزاج ہی نرم اور غم آلود ہے۔اس نرم خوئی اور ناشادگی کی تلاش وجستجو کی تلقین ملاحظہ کریں:

بیدار ہوں دل جس فغانِ سحری سے  اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

مری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز  جہاں میں عام نہیں دولت دلِ ناشاد

اخوت،محبت، ہمدردی،غم خواری اور دل جوئی ہی اصل ایماں ہے۔قومی نظریوں میں وہ مصافات و مساوات کے قائل تھے۔قوموں کے تئیں اقبالؔ کے خلوص اور نرم دلی ان کی شاعری سے پورے طور پر آشکارا ہے۔ حالانکہ کہیں کہیں وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے اور قومیت کے احساس میں وہ ایسا نصیحت آمیز رویہ بھی اختیار کر گئے جو ایک سچے ناصح کا کردار ہوتا ہے۔

اچھے برتاؤ اور رحم دلی کا سب سے عمدہ نمونہ 'اسرارِخودی' کے یہ اشعار ہیں:

لطف قہر او سراپا رحمتے  آں بیاراں ایں باعداء رحمتے

آں کہ برا اعداء در رحمت کشاد  مکہ را پیغام لا تثریب داد

یہ اشعار اشارہ ہیں،اس وقت کی طرف جب رسولِ خداؐ پر قاتلانہ حملہ کر کے مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا اور وہ مکہ سے 550 کلومیٹر دور مقام یثرب میں جا کر پناہ گزین ہوئے تھے۔ چلتے وقت اپنا وطن مالوف چھوڑتے وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم (نے کہا تھا کہ اے مکہ تو ساری دنیا میں مجھے سب عزیز ہے، میں تجھے ہرگز نہ چھوڑتا مگر تیرے باشندوں نے اور ان مکینوں نے مجھے چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔اس کے بعد بھی جہلائے مکہ نے مدینہ جا جا کر رسول اللہؐ سے جنگیں کیں اور ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا،رسول اللہؐ کو ان جنگوں میں پے در پے کامیابی اور فتح نصیب ہوئی اور ایک دن وہ آیا کہ وہ مکہ میں بھی پھر فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔

صلح وآشتی کا پیغام اقبالؔ کے کلام میں جا بجا موجود ہے۔وہ اخلاص ومحبت، بھائی چارگی اور یکجہتی کے ہم نوا تھے۔ان کی آواز اقوام عالم کے لئے نئی راہیں متعین کرنے اور امن وسکون کے ماحول کو روشن اور ضیا بار کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔وہ عالم انسانیت کے شاعر تھے جس کی تعلیم ان کا اولین اور بنیادی فریضہ بن گیا تھا۔اقبالؔ کا پیغام جبر وتشدد، دہشت گردی اور قتل وغارت گری کے خلاف ہے۔ظلم وستم،ایذا رسانی اور معصوم

انسانوں کی جانوں سے کھیلنا کسی طرح جائز نہیں۔ وہ ہمیشہ صداقت کی پیروی کرتے رہے اور سچ کو سامنے رکھا۔

ان خیالات کو اقبالؔ کے نظریہء خودی، حرکت و عمل، جفاکشی اور فلسفۂ سخت کوشی سے بھی ملا کر دیکھنا چاہیے۔ معاشرت اور مدنیت کے اعتبار سے دونوں میں باریک رشتہ ہے۔

اقبالؔ کے ان خیالات کو جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے جن میں اپنی ذات کی حفاظت کی طرح دوسری جانوں کا تحفظ بھی ناگزیر ہے۔ اقبالؔ نے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔''

اس طرح کے خیالات کا اظہار انھوں نے ایک اور خط میں بھی کیا ہے:

''جوع الارض کی خاطر خوں بہانا قطعاً ناجائز اور حرام سمجھتا ہوں۔''

'اسرار خودی' جو جہد و عمل کی کتاب ہے، اس کے ایک باب کا عنوان ہی یہ ہے:

''درد بیاں ایں کی مقصد حیاتِ مسلم اعلائے کلمۃ اللہ است و جہاد اگر محرک او جوع الارض باشد در مذہب اسلام حرام است۔'' اقبال کا نظریہء وطنیت کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مختلف جگہوں پر 'وطن' کو ''دیوتا'' اور ''خدا'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔

ع ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جذبہء وطنیت انسانی وفاداریوں سے عبارت ہے۔ اس کا بنیادی مرکز اعلیٰ انسانی اقدار اور نیکی و خیر ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ وہی نظام مملکت عدل و انصاف قائم کر سکتا ہے جس کی جڑیں اخلاقیات اور روحانیت میں پیوست ہوں۔ جب تک انسانی تمدن کی نیو عالمگیر روحانی تصورات و فکریات، وحدت و اخوت اور امن و عافیت پر نہ رکھی جائے وطنیت کی صحیح شکل و صورت نظر نہیں آ سکتی۔ اتحاد و یکجہتی کی بنیاد مذہبی اور اخلاقی یگانگت پر قائم ہوتی ہے۔ اقبال نے انسان کو زیادہ اہمیت دی ہے اس کی روحانی اور مادی زندگی میں ان حقائق کو عمل دخل ہے جن کا تعلق جذبہء ہم آہنگی سے ہے۔ اقبال اس کے امین رہے اور پیغامبر بھی۔

## 10.3: نظم 'شعاع امید' کا متن

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام — دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں — بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام
نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت — نے مثل صبا طوف گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جاؤ — چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشہ سے اٹھتی ہیں شعائیں　　بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اِک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن　　افرنگ مشینوں کے دھویں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذّتِ نظارہ سے محروم　　لیکن صفتِ عالم لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے　　اے مہر جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

(۳)

اِک شوخ کرن، شوخ مثال نگہِ حور　　آرام سے فارغ صفت جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو　　جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اِک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو　　جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز　　اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اس خاک سے روشن　　یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی　　جن کے لئے ہر بحر پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں　　محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن　　تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر　　فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

## 10.4: نظم کا پس منظر

یہ نظم علامہ اقبالؔ کے شعری مجموعہ ''ضربِ کلیم'' میں شامل ہے، جس میں ایشیا کے حالات کا تذکرہ ہے۔ ایشیا ان دنوں جس قسم کے خلفشار سے گزر رہا تھا وہ نہایت اندوہناک تھے۔ اقبالؔ خود یوروپ رہ کر تعلیم حاصل کر کے آئے تھے، انھیں یوروپ کی چالوں کا پوری طرح علم تھا۔ 1857 میں ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ ہوا۔ اس سے قبل اسپین، ہنگری وغیرہ ممالک مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے اور دوسری جنگ عظیم 18-1914 کے بعد ایشیا کی سب سے بڑی حکومت سلطنت عثمانیہ پر زوال آیا اور وہ بھی یوروپینز کا شکار ہوئی۔ ایسی صورت میں ایشیا کے مسلمانوں اور خصوصاً ہندوستان کے عوام میں ایک مایوسی کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھوں سے اتنی بڑی بڑی حکومتیں نکل گئیں اور وہ یوروپ کے غلام بن کر رہ گئے۔ سلطنت عثمانیہ کو تو یوروپ نے چالیس ملکوں میں تقسیم کر دیا جن میں فلسطین (دو حصہ) سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، عمان، ابوظہبی، شام، یمن، اردن، عراق وغیرہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ ادھر تاشقند، سمرقند، بخارا اور بلغاریہ روس اور چین نے دبا لیے جو یوروپ کے

خلاف نبرد آزما تھے۔ ہندوستانیوں کے سامنے گھٹا ٹوپ اندھیرا ہی اندھیرا تھا، جس کی وجہ سے زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان قنوطی حالات میں بھی اقبالؔ کے عزائم اور خیالات رجائیانہ تھے۔ نظم ''شعاع امید'' جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ امید کی ایک کرن تھی جس کو اقبال نے اس نظم میں ظاہر کیا ہے۔

## 10.5: نظم کا تعارف اور تجزیہ

اس نظم کے تین بند یا تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں سورج نے جو دنیا میں روشنی پھیلاتا ہے، دنیا کے خراب حالات سے تنگ آ کر کہا کہ یہ دنیا عجب چیز ہے کبھی صبح یعنی خوشی کا مقام ہے اور کبھی شام یعنی غم کدہ ہے۔ ایک زمانہ ہو گیا کہ تم فضا کی وسعت میں آوارہ گھومتی پھرتی ہو لیکن دنیا میں روشنی یعنی اچھائیوں کے بجائے برائیاں پنپتی چلی جا رہی ہیں۔ انسانوں میں خوشی، اطمینان، ہمدردی اور دوسروں کے ساتھ اچھے اخلاقی برتاؤ کے بجائے بے مہری بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ نور آفتاب پھیلنے کے بجائے ظلمت شب نے قبضہ کر لیا ہے۔ انسانوں سے مہر و محبت اٹھ چکی ہے۔ تمہارے ریت کے ٹیلوں پر یا ریگستانوں میں چمکنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کسی قسم کا آرام نصیب نہیں ہو رہا ہے اور نہ باد صبا کی طرح گلستانوں اور گلزاروں میں پھولوں کا طواف کرنے میں آرام میسر آتا ہے۔ غرض ہماری تمام تر تگ و دو تمہاری تمام تر تمازت کسی کام کی نہیں ہے۔ تم اس دنیا کے چمن باغ، خیابان و بیابان کو چھوڑ دو اور واپس آ کر میرے روشن ضمیر میں پھر سے سما جاؤ۔

اس بند میں سورج نے نور افشانی کی اپنی تمام تر کوشش کے باوجود ظلمت و ضلالت سے پریشان ہو کر اپنی شعاعوں سے کوئی کام نہ لینے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ تم سب کی سب واپس میرے اندر آ جاؤ۔

دوسرے بند میں سورج کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے اس کی کرنوں نے جوق جوق دنیا کے گوشہ گوشہ سے آنا شروع کر دیا اور وہ اپنے بچھڑے ہوئے آفتاب سے جا کر ملنے لگی ہیں، بغل گیر ہوتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں کہ ہمیں ہمارے سورج نے واپس بلا لیا اور چاروں طرف ایک واویلا اور چیخ و پکار مچ گئی کہ سورج کی تمام تر کرنوں کی کوشش کے باوجود مغربی دنیا میں اجالا ممکن نہیں، یوروپ ایک ایسی جگہ ہے جہاں سورج بھی روشنی نہیں پھیلا سکتا۔ یوروپ کی جدید ترین تعلیمات نے اسے سیہ پوش کر دیا ہے، اس کو تاریکی میں دھکیل دیا ہے، وہ پوری طرح اندھیرے میں ڈھک چکا ہے کیوں کہ وہاں جدید آلات اور مشینوں کا دھواں اس قدر پھیل چکا ہے کہ پورا یوروپ اس میں ڈھکا ہوا ہے۔ مغرب کا اپنے علوم کے باعث یہ اندھا پن ہے لیکن مشرق یعنی ایشیا صاحبِ نظر ہونے کے باوجود بھی صفتِ لذّتِ نظارہ سے محروم ہے۔ وہ دیکھنے کی سکت اور آنکھ کا نور اور روشنی رکھنے کے بعد بھی دیکھنے کی خواہش نہیں رکھتا کہ ان سب چیزوں کو نظر میں رکھے۔ اس کے برعکس وہاں بھی عالم بالا کی خاموشی کی طرح خاموشی طاری ہے۔ کوئی کچھ کہنے اور کرنے کو تیار نہیں۔ اس لئے اے ہمارے آفتاب درخشاں اور ہمارے مہر عالم تاب دنیا کو چمکانے والے سورج ہمیں پھر واپس اپنے سینۂ تابندہ میں چھپا لے۔ ہمیں پھر اپنے روشن ضمیر اور چمکدار دل

میں چھپالے۔ہم دنیا کی ٹیڑھی روش سے نالاں ہیں۔تنگ آ گئے ہیں۔ ہمارے سورج ہمیں پھر سے روشنی کی جگہ بلالے۔سورج کی اس محفل میں جہاں تمام تر شعاعیں موجود ہیں اور اپنے سورج میں سما جانے کی خوشی منا رہی ہیں، وہیں حالات یک دم بدلتے ہیں۔

تیسرے بند میں اس محفل کی مایوسی اور بے عملی پر ایک کرن چونک کر اٹھتی ہے اور وہ کرن بڑی شوخ چنچل اور حور کی نظروں کی مانند شرارت پسند ہے۔اور وہ پارے کی بے چینی اور بے تابی کی طرح آرام سے ناواقف ہے۔ اس کی نظروں اور اس کی ساخت میں بے کلی اور بے قراری ہے۔کہتی ہے کہ اے میرے سورج مجھے نور پھیلانے کی اجازت عطا کی جائے۔ میں مشرق کے ہر ذرّہ کو روشن کرنا چاہتی ہوں۔ جب تک کہ یہاں کا ہر ذرہ چمک نہیں اٹھتا، میں ہندوستان کی تاریک فضا کو نہیں چھوڑوں گی۔ میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گی۔ میں اس وقت تک یہاں رہوں گی جب تک گہری نیند میں سوئے ہوئے جاگ نہ اٹھیں۔ میں چاہتی ہوں کہ یہاں کا ہر بے خبر شخص بیدار ہو جائے۔ کیوں کہ سورج کی تمام امیدوں یا خاور بمعنی مشرق کی تمام امیدوں کا مرکز یہی خاک ہے اور اقبالؔ کے اشکوں سے جو سرزمین سرسبز و شاداب ہے، وہ اسی ہندوستان کی خاک ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آسمان کے ستارے مہ و پروین کی آنکھیں بھی اسی خاک سے روشن ہیں۔اس مٹی کا ایک ایک ٹھیکرا بھی چمکتے ہوئے موتیوں کی طرح آبدار ہے۔آپ ذرا ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالیں۔اس سرزمین نے ایسے عظیم لوگ پیدا کیے، بحر علوم میں غوطے لگانے والے لوگ دیے کہ بڑا سے بڑا سمندر بھی ان کے سامنے بہت ہی اتھلے پانی کی طرح ہے جس سے ہو کر آسانی سے گزرا جا سکے۔افسوس ہے کہ اس مٹی میں جس ساز کے نغموں سے دلوں میں حرارت پیدا ہوتی تھی۔ آج محفل کا وہی ساز مضراب کی چوٹ سے ناواقف ہے یعنی دل کے تاروں کو جس نغمہ اور جس انگلی سے چھیڑا جائے وہ ان تاروں کو نہیں جانتے۔ یہاں بے عملی اور بے حسی کا یہ عالم ہے کہ ہندو مسلمان سب غفلت کی نیند میں سو رہے ہیں۔سب کے سب غافل پڑے ہوئے ہیں۔ ہندو تو مندر کے دروازہ پر سو رہا ہے اور مسلمان مسجد کی محراب کے نیچے بیٹھا اپنی تقدیر کا رونا رو رہا ہے۔یعنی اقبالؔ کی نگاہ میں دنیا کی تاریکی اور سیہ پوشی کا سبب بے عملی اور غفلت ہے۔اگر ایشیاء والے اس غفلت سے بیدار ہو جائیں تو یہ ہندوستان پھر سے چمک اٹھے گا۔اس لئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے مشرق کے باشندہ تو مشرق سے بیزار مت ہو اور نہ مغرب سے خوف زدہ ہو۔تیرے لئے تو فطرت کا اشارہ ہی کافی ہے۔فطرت تجھے راز دے رہی ہے کہ تو ہر اندھیری رات کو سحر میں تبدیل کر دے۔

## 10.6: آپ نے کیا سیکھا

اقبالؔ کی نظم ''شعاع امید'' اقبالؔ کے شعری مجموعہ ''ضرب کلیم'' کی ایک نظم ہے جس کا مطلب ہے امید کی کرن۔ایشیاء خصوصاً ہندوستان میں سیاسی حالات بہت خراب تھے۔ ہر طرف یوروپی ممالک کا قبضہ اور برطانیہ کی حکومت تھی۔ ہندوستانی عوام غفلت شعاری اور بے خبری کی نیند کے سبب ان کے غلام بنے ہوئے تھے۔ان

حالات میں سورج نے اپنی شعاعوں کو واپس بلا لیا۔ سب نے اس کا استقبال کیا اور خوش ہو کر سورج کے دامن میں سمانے لگیں لیکن ایک نہایت تیز طرار اور نگاہِ حور کی مانند شوخ و چنچل کرن نے کہا کہ مجھے نور پھیلانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ میں ہرگز ہند کی تاریک فضا کو نہیں چھوڑوں گی اور جب تک یہاں کے لوگ بیدار نہ ہو جائیں میں اس ظلمت کدہ میں رہوں گی اور ضیاء پاشی کرتی رہوں گی۔ اس نے دلیل دی کہ یہاں بڑے قابل اور لائق لوگ پیدا ہوئے جن کے سامنے ہر مشکل نہایت آسان تھی۔ جو مشکل کو مشکل نہیں سمجھتے تھے۔ اصل میں جس نغمہ سے دلوں میں حرارت پیدا ہوتی تھی وہ نغمہ یہاں نہیں گایا جاتا کیوں کہ اس نغمہ کے تاروں کو نہیں چھیڑا جاتا۔ یہاں ہر شخص بے عمل ہے۔ ہندو اپنے مندر کے دروازے پر سو رہے ہیں اور مسلمان مسجد کی محراب تلے اپنی تقدیر کو رو رہے ہیں اور کچھ کرنے کے لیے سرگرم عمل نہیں ہوتے۔ مشرق سے بیزار ہونے اور مغرب سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ فطرت کو دیکھو وہ اشارہ کر رہی ہے اور تمہاری مدد کرنا چاہتی ہے کہ ہر شب کو آخر سحر ہونا ہے۔ تم بھی ایسے کام کرو کہ شب کا اندھیرا دور ہو جائے اور صبح کی سفیدی پھیل جائے۔ تم غلامی کی زنجیروں سے نجات پا جاؤ اور تمہارا ملک تمہارے ہاتھوں میں آ جائے۔

## 10.7: اپنا امتحان خود لیجئے

۱۔ شعاعِ امید کا کیا مطلب ہے؟

۲۔ سورج نے اپنی کرنوں کو کیا پیغام دیا؟

۳۔ کرنوں نے جواب میں کیا کہا؟

۴۔ شوخ کرن مثلِ نگہِ حور کون ہے؟

۵۔ اس شوخ کرن نے کیا جواب دیا؟

## 10.8: سوالات کے جوابات

۱۔ شعاعِ امید کا مطلب ہے امید کی کرن۔

۲۔ سورج نے اپنی کرنوں سے کہا کہ تم سب واپس میرے پاس آ جاؤ۔

۳۔ کرنوں نے جواب دیا کہ اس دنیا میں ہر طرف تنگی و تاریکی ہے، افرنگ اپنی ایجادات کی بدولت سیہ پوش ہو گیا ہے اور مشرق والے ذوق نظارہ سے محروم ہیں۔ آنکھ کی روشنی کے باوجود خاموش ہیں۔ اس لئے ہم واپس تیری پناہ میں آتے ہیں۔

۴۔ سورج کی تمام کرنوں میں ایک شوخ کرن تھی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ ہندوستان کی فضا کو منور کرنے والی تھی۔

۵۔ اس شوخ کرن نے جواب دیا کہ میں ہندوستان کی فضا کو نہیں چھوڑوں گی جب تک یہاں

آزادی کا پرچم، روشنی کا پرچم نہ لہرا جائے۔ یہاں بڑے بڑے قابل علما پیدا ہوئے ہیں جن کی روشن فکر سے تمام فضا منور رہی ہے۔اس بے عملی، تاریکی سے باہر آ جاؤ، نہ مشرق کا شکوہ کرو اور نہ مغرب سے خوف کھاؤ۔

## 10.9: فرہنگ

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| شعاع | کرن | پنہائے فضا | فضا کا پھیلاؤ |
| بے مہریٔ ایام | زمانے کا ایسا سلوک جس میں ہمدردی نہ ہو | نَے | نہ،نہیں |
| راحت | آرام | طواف | کسی چیز کے گرد چکر لگانا |
| تجلّی کدہ | جلووں کا گھر | چمنستان | چمن کی جگہ |
| در و بام | دروازہ اور چھجّہ | آفاق | افق کی جمع آسمان کے کنارے |
| ہم آغوش | بغل گیر | سیہ پوش | کالا لباس پہنے ہوئے مراد اندھیر |
| محروم | بے نصیب | صفت | علامت،نشان، مانند |
| عالم لاہوت | عالم بالا | مہر جہاں تاب | دنیا کو روشن کرنے والا سورج |
| فراموش | بھولنا | شوخ | شریر |
| نگہ حور | حور کی نگاہ | فارغ | بے فکر، مطمئن |
| سیماب | پارہ | رخصتِ تنویر | روشنی پھیلانے کی اجازت |
| جہاں تاب | دنیا پر چمکنے والا | تاریک فضا | ایسی فضا جہاں جہالت اور غلامی ہو |
| گراں خواب | گہری نیند سونے والے | خاور | مشرق، پورب |
| خزف ریزہ | :ٹھیکری کا ٹکڑا | دُرناب | خالص موتی |
| غواص معانی | حقیقت کے سمندر میں غوطہ لگانے والے | پُرآشوب | طوفانی |
| پایاب | کم گہرا | مضراب | ستار بجانے کا آلہ (مراد عشق و جذبہ کو ابھارنے والی باتیں) |

محراب　　وہ جگہ جہاں امام کھڑے ہو کر نماز پڑھاتا ہے　　حذر　　ڈر

شب کو سحر کر　　مراد تاریکی کو روشنی میں بدل دے

(ماخوذ کلیاتِ اقبال مرتبہ عبدالحمید یزدانی)

## 10.10: کتب برائے مطالعہ

۱۔ 'کلیاتِ اقبال'　　خواجہ عبدالحمید یزدانی
۲۔ 'شرح ضربِ کلیم'　　یوسف سلیم چشتی
۳۔ 'ذکرِ اقبال'　　عبدالمجید سالک
۴۔ 'جہانِ اقبال'　　توقیر احمد خاں
۵۔ 'میرے اقبال'　　توقیر احمد خاں
۶۔ 'اقبال کی تیرہ نظمیں'　　اسلوب احمد انصاری

# اکائی 11: 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کا تجزیاتی مطالعہ (ارمغانِ حجاز)

ساخت


**11.1: اغراض ومقاصد**

**11.2: تمہید**

**11.3: نظم 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کا متن**

**11.4: 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کا تعارف اور پس منظر**

**11.5: 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کا تجزیہ**

**11.6: آپ نے کیا سیکھا؟**

**11.7: اپنا امتحان خود لیجئے**

**11.8: سوالات کے جوابات**

**11.9: فرہنگ**

**11.10: کتب برائے مطالعہ**


## 11.1: اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- فکرِ اقبالؔ سے واقف ہوں گے۔
- اس عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات سے آگاہ ہوں گے۔
- مشرقی افکار کا تعارف کر سکیں گے۔
- مغربی استعمار سے متنبہ ہوں گے۔
- یورپ کی چالوں سے باخبر ہوں گے۔
- یورپی نظریات سے واقف ہوں گے جو انسان کے لیے مضر ہیں، جو ہمدردی اور محبت سے عاری ہیں۔
- کو معلوم ہوگا کہ مغربی دنیا شیطان کی چالوں سے چل رہی ہے۔
- سیکھیں گے کہ دنیا کو اخوت اور محبت کی ضرورت ہے جس میں مشرق کا رول اہمیت کا حامل

ہے۔

## 11.2: تمہید

دنیا کی بنیاد دو طرح کے خیالات پر رکھی ہوئی ہے، ایک حق اور دوسرا باطل۔ حق وہ ہے جو سچائی پر مبنی ہے اور جس میں بنی نوع انسان کی نجات ممکن ہے اور دوسرا جھوٹ، فریب، مکاری اور تباہ کاری پر مبنی ہے اور ہر حال میں حقیقت پر چوٹ کرتا رہتا ہے۔ سچائی اور حقیقت خدا کا پیغام ہے اور جھوٹ اور فریب کی قیادت ابلیس کر رہا ہے۔ اس طرح سے پوری دنیا حق اور باطل کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ چاروں طرف حق اور باطل کی آویزش ہے۔ اہلِ حق دنیا کو بھلائی، نیکی اور سچائی کے راستے پر لے جانا چاہتے ہیں جبکہ طاغوتی طاقتیں انھیں ابلیسی نظام کی طرف کھینچتی ہے اور اس کے لئے انسانیت کا خون، قتل و غارت گری، ظلم و ستم کے ہنگامے برپا کرتے ہیں۔ 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' میں علامہ اقبالؔ نے اس الجھن میں گرفتار دنیا کا ایسا نقشہ دکھایا ہے۔ ابلیس حق ترستوں کی ثابت قدمی سے گھبرا کر ایک میٹنگ کرنے لگا اور اس نے اپنے تمام مشیروں کو جمع کر کے یہ رائے طلب کی کہ ہم کس طرح اس دنیا خصوصاً ایمان کو تہس نہس کریں؟ ہمیں کیا کرنا چاہئے کہ نظامِ الٰہی کا خاتمہ ہو؟ اور دنیا ہمارے پھندے میں پھنسی رہے۔ ابلیس اسی صراطِ مستقیم اور راہِ خداوندی سے پریشان ہے اور تمام احباب سے مشورہ طلب کرتا ہے، جس میں عجیب و غریب نتائج سامنے آتے ہیں۔

ایک بار ڈاکٹر سعید اللہ ایم اے، پی ایچ ڈی نے اقبالؔ سے پوچھا:

''تمدن (Civilization) اور تہذیب (Culture) آج کل اس طرح استعمال ہو رہے ہیں کہ گویا وہ ہم معنی ہیں، آپ ان میں کس طرح امتیاز کریں گے؟

فرمایا: ''Civilization کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے اور Culture کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔'' (ملفوظات اقبالؔ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، صفحہ 146)

اس کے نتیجہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمدن یا Civilization ہماری اجتماعی زندگی کا نمونہ ہے۔ ایک گاؤں ایک شہر ایک ملک کی ہم آہنگی جس میں رسوم و رواج اوڑھنا، پہننا، کھانا پینا، رہنا سہنا، بولنا اور اخلاق و عادات اختیار کرنا تمدن یا Civilization ہے۔ اسی طرح زندگی کا معاشرتی کردار Civilization ہے، تمدن یا مدنیت سے مراد شہریت ہے۔ مدینہ بھی اسی سے بنا ہے جس کے معنی شہر کے ہیں۔ ہماری شہریت کیا ہے؟ ہم کیسے شہری ہیں؟ یہ ہماری Civilization ہے اور ہماری مدنیت یا ہمارے تمدن میں شامل ہے اور انسان کی اپنی ذات سے جس چیز کا تعلق ہے، وہ اجتماعی زندگی میں کس چیز کو پسند کرتا ہے۔ کس زبان کس علم سے لگاؤ رکھتا ہے، کس

اخلاق کا پاسدار ہے، کس چیز میں ذاتی طور پر یقین رکھتا ہے اور کس چیز پر ایمان و یقین نہیں رکھتا، یہ اس کا Culture یا اس کی تہذیب ہے۔ یعنی اپنے آپ کو وہ کس طرح سجاتا سنوارتا ہے اور Cultivate کرتا ہے۔ کس طرح اپنی ذات کی کاشت و پرداخت کرتا ہے؟ معاشرہ کے لائق مہذّب یا Civilized بناتا ہے، یہ اس کی تہذیب ہے۔ وہ کیا ہنر سیکھتا ہے۔ کون سا علم حاصل کرتا ہے۔ کیسے چلتا اور بیٹھتا، لیٹتا، سوتا اور رہتا ہے، یہ اس کا Culture یا تہذیب ہے۔ یعنی اپنے آپ میں وہ کتنا سجا سنوارا اور مہذّب ہے، یہ اس کی ذات پر منحصر ہے۔ وہ جتنا مہذّب ہوگا، اپنے معاشرہ کے لئے متمدن بھی ہوگا۔ ذاتی اصول واطوار کے ساتھ اجتماعی قوانین اور طریقوں کا بھی پابند و پاسدار ہوگا۔

انگریزی لغت میں بھی Civilization کے معنی: Life & trainning of a citizen لکھے ہیں اور Civilize کے معنی: to enlighten & refine اور to reclaim from barbarism کے لکھے ہیں۔

اور Culture کے معنی: Art of practice of cultivating, tillage, making a persons powers better by practice or refra لکھے ہیں۔

Culture کے مترادفات یا Synonyms میں Tillage, Education, Improvement لکھے ہیں۔

اس طرح معلوم ہوا کہ مشق اور ریاض کے ذریعہ کسی شخص کی ذاتی قوتوں کو بہتر بنانا اس کو کاشت کی طرح پالنا یا جوتائی کرنا۔ تعلیم دینا اور بہتری یا ترقی دینا ہی تہذیب یا Culture ہے۔ بہتر صلاحیتیں حاصل کر کے تعلیم یافتہ ہو کر اپنی قوتوں کی کاشت کر کے اور انھیں ترقی دے کر ہی وہ بہتر شہری یا متمدن یا Civilized بن سکے گا جو کسی دیہہ، قریہ شہر یا ملک کا باشندہ ہوگا۔ اس طرح تہذیب اور تمدن الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ساتھ ہی ہیں اور دونوں مل کر مذہب، قوم اور ملک کی تعمیر کرتے ہیں۔

اقبالؔ کے کلام میں ہندوستانی تہذیب Culture اور تمدن Civilization دونوں کے نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں دونوں صورتوں کی عکاسی کی ہے۔ کیوں کہ انھیں ہندوستان کی دونوں حیثیتوں سے دلچسپی تھی اور وہ تہذیب اور تمدن پر ایک خصوصی توجہ دی۔

اقبالؔ کی شاعری میں ہندوستانی اور تمدن کا ذکر ابتدائے شعر گوئی سے ہی پایا جاتا ہے۔ اقبالؔ کو شاعر

مشرق کا خطاب دیا گیا لیکن عالم مشرق میں ہندوستان ہی ان کی توجہ کا مرکز رہا۔ ہندوستان کے باشندے، مذاہب، علوم اور رسوم سے ان کی رغبت خاص طور پر قائم رہی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود ہندوستان کے باشندے تھے اور ہندوستان کے پس ماندہ عوام سے ان کو خاص سروکار تھا، لیکن اسی کے ساتھ ان کا خود ہندی نژاد ہونا بھی توجہ کا باعث ہے۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن کے عناصر کی عکاسی اقبالؔ کی ابتدائی شاعری میں بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ چناں چہ جب ہم ''بانگِ درا'' کی شاعری بالخصوص نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بیشتر نظمیں ہندی تہذیب وتمدن میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ''بانگِ درا'' وغیرہ کے بعد کی شاعری میں اقبالؔ کی توجہ ہندوستانی تہذیب وتمدن سے منعطف ہوگئی تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کی تمام تر شاعری میں یہ عناصر کارفرما رہے ہیں۔ اگر زمانی اعتبار سے اقبالؔ کی شاعری پر نظر ڈالیں تو ہمیں خاص ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی جو تصویریں نظر آتی ہیں، ان میں 'تلک'، 'زنار'، 'مندر'، 'شوالہ'، 'تیرتھ'، 'پوجا'، 'گنگا'، 'ہری دوار'، 'نانک'، 'گوتم بدھ'، 'رام'، 'گایتری منتر'، 'وید'، 'ہندومت'، 'وشوامتر'، 'بھگتی' اور 'کیرتن' وغیرہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ موضوعات یا تو ہندی تہذیب اور تمدن کے نمائندہ نمونے ہیں یا ان کے محرکات، ہم نے دونوں کو اپنے مطالعہ کا حصہ بنایا ہے۔ اقبالؔ نے اپنی اردو شاعری کا بیشتر حصہ ترک کر دیا ہے۔ اگر متروک کلام کو بھی اس مطالعہ میں شامل کر لیا جائے تو اس کی تعداد اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ماتھے کا ٹیکہ یا تلک ہندوستانی پنڈتوں کی خاص پہچان ہے۔ تلک کے بغیر پوجا کا تصور ناممکن ہے۔ پوجا کے وقت جو ٹیکہ پیشانی پر لگایا جاتا ہے، وہ بعد میں تمام دن نشانی کے طور پر قائم رہتا ہے۔ اقبالؔ کی ابتدائی شاعری میں ٹیکہ کا عکس جلوہ گر ہے، وہ ایک قطعہ میں کہتے ہیں:

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے　　یاد ایام گزشتہ مجھے تڑپاتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکہ اقبالؔ　　کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

(کلیاتِ باقیاتِ اقبالؔ، صفحہ:318)

تلک دھارن، پوجا پاٹھ، جنیو پہن کر آرتی اُتارنا اور مورتی پر گنگا جل چڑھانے کی تصویریں اقبالؔ کی نظم 'نیا شوالہ' میں بڑی آن بان کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ اقبالؔ کی یہ نظم ہندوستانی عوامل کی نمائندہ نظم ہے۔ اس میں ہندوستانی تمدن کی شفاف تصویر جلوہ گر ہے۔ اس نظم کے آخری بند کے یہ اشعار بالخصوص قابل ذکر ہیں، جن میں تیرتھ یعنی مندر، اس کا کلس، صبح صبح بھجن گانے کی آوازیں اور پوجا کرنے والوں کی مستی کا عالم نظر آتا ہے:

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ　　دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے　　سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی، شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس نظم کا وہ حصہ جسے خود شاعر مشرق نے لائق اعتنا نہیں سمجھا، ہندوستانی اوپاسنا کی بہترین مثال ہے۔ اس میں مندر، مندر میں سونے کی مورتی، اس کے درشن، آتما اور پرماتما کا سامنا، جل چڑھانے کی ریت اور شنکھ بجانے کی آوازیں صاف صاف محسوس ہوتی ہیں:

پھر اِک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو　　اس ہردوار دل میں لاکر اسے بٹھا دیں
زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو　　یعنی صنم کدے میں شان حرم دکھا دیں
پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا　　ہر آتما میں گویا اِک آگ سی لگا دیں
آنکھوں کی ہے جوگنگا لے لے کے اس سے پانی　　اس دیوتا کے آگے اِک نہر سی چلا دیں
ہندوستان لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے　　بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو　　آوازۂ اذاں میں ناقوس کو بجا دیں

اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

ہندوستان کی معروف مہذب اور متمدن ہستیوں کا تذکرہ بھی اقبالؔ نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ ''بانگِ درا'' میں سوامی رام تیرتھ، گوتم اور رام چندر جی کے پیکر بہ تمام وکمال موجود ہیں۔

سوامی رام تیرتھ کے بارے میں مشہور ہے کہ اقبالؔ نے سنسکرت زبان کا درس انھیں سے لیا تھا۔ اقبالؔ نے لکھا ہے:

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے تاب تو　　پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہر نایاب تو
آہ! کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو　　میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیاز رنگ و بو
مٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا　　یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آزر بنا
نفیِ ہستی اِک کرشمہ ہے دل آگاہ کا　　لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الااللہ کا

گرونانک کا تذکرہ دو نظموں میں موجود ہے۔ ایک 'ہندوستانی بچوں کا گیت' اور دوسری ''بانگِ درا'' کے آخری حصہ کی نظم جس کا عنوان ہی 'نانک' ہے:

چشتی نے جس زمین میں پیغامِ حق سنایا　　نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اور 'نانک' نام کی نظم میں گوتم بدھ کے خیالات اور ان کی تہذیب وتمدن کا عکس بھی موجود ہے:

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی — قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر — غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا — ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی — بارشِ رحمت ہوئی، لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ! شودر کے لئے ہندوستاں غم خانہ ہے — دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں — شمعِ گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں
بت کدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا — نورِ ابراہیمؑ سے آزر کا گھر روشن ہوا

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اِک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

رام چندر جی پر اقبالؔ نے باقاعدہ ایک نظم لکھی ہے جو پہلے بھی بہت مشہور تھی لیکن 92-1991ء یعنی سقوطِ بغداد اور تاراجِ اجودھیا کے بعد پھر سے خاصی مشہور ہوئی۔ وزارت عظمیٰ کے عہدے تک پہنچنے والے بعض چوٹی کے سیاسی لیڈروں نے اس نظم کے ترجمے کیے۔

اقبالؔ نے ہندوستان کی اس عظیم بے مثال ہستی کا نقشہ بڑے ہی احترام اور انصاف کے ساتھ کھینچا ہے:

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند — سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر — رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت — مشہور جن کے دم سے ہے اس دنیا میں نامِ ہند
ہے جو رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی — روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

اس کے علاوہ گیان دھیان، جاپ اور سمادھی لگا کر بیٹھنے کے منظر بھی اقبالؔ کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے دھیان میں مگن ریاضت کا نمونہ ان اشعار میں ملاحظہ کیجئے:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

اسی طرح 'نغمہ ہندی' اور 'نے نوازی' کی تراکیب استعمال کرتے ہیں:

عجمی خم ہے تو کیا مَے حجازی ہے مری نغمۂ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری
کوئی دیکھے تو میری ''نے نوازی'' نفس ہندی مقام نغمۂ تازی

ہندوستانی تہذیب اور تمدن میں برہمن کا کردار کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اقبالؔ کی شاعری میں برہمن کا تہذیبی عکس جابجا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہندوستان کے اس بنیادی پیکر سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اپنی شاعری میں اس کا تذکرہ کثرت سے کرتے ہیں۔ اقبالؔ خود اپنے برہمن زاد ہونے کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں جیسے ان کے لئے باعث فخر ہو:

میں اصل کا سومناتی آبا مرے لاتی و مناتی
تو سیّد ہاشمی کی اولاد میری کفِ خاک برہمن زاد

اسی طرح فارسی کلام میں بھی اپنے علم و تدبر اور دانائی کا تذکرہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں ایسا برہمن زادہ کوئی دوسرا دیکھنے کو نہیں ملے گا:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

(زبورِعجم، صفحہ:405)

'اسرار خودی' کی ایک حکایت 'شیخ و برہمن' میں برہمن کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ برہمن کا کام بت تراشنا، مورتی کے سامنے سجدہ ریز ہونا، کان میں زنار پہننا، پوجا پاٹھ کرنا اور کرانا اور بعض اوقات آنکھیں بند کر کے دھیان لگانا، مراقبہ کرنا ہے۔ 'اسرار خودی' میں مذکورہ حکایت میں برہمن کو امانت دار تہذیبِ کہن کہا گیا ہے۔ اسے بت پرستی سے گریز کی تعلیم و نصیحت کے بجائے اپنے مذہب و مسلک میں پختہ تر ہونے کی تلقین کی گئی ہے:

من نہ گویم از بتاں بے زار شو کافری شائستہ زنار شو
اے امانت دار تہذیب کہن پشت پا بر مسلک آبا مزن
گر ز جمعیت حیاتِ ملت است کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

تو کہ ہم در کافری کامل نۂ
در خور ظرفِ حریم دل نۂ

(میں نہیں کہتا کہ تو بتوں سے بے زار ہو جا۔ اگر تو کافر ہے تو زنار کے لائق ہو جا۔ اے تہذیب کہن کے پاسدار، باپ دادا کے مسلک پر لات مت مار۔ اگر جمعیت سے ملت کے زندگی ہے تو کفر بھی سرمایہ جمعیت ہے۔ کیوں کہ تو کافری میں بھی کامل نہیں ہے، اس لئے حریم دل کے ظرف کے لائق نہیں ہے۔)

برہمن را نگویم ہیچ کارہ　　کند سنگ گراں را پارہ پارہ
نیاید جز بہ زور دست و بازو　　خدائے را تراشیدن زخارا

(میں برہمن کو بیکار نہیں کہتا۔ وہ تو بھاری پتھر کو کاٹ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہاتھ پاؤں کی محنت کے بغیر پتھر سے کسی خدا کو نہیں تراشا جا سکتا۔)

ہندوستانی تہذیب وتمدن سے متعلق اقبالؔ کا ایک انوکھا کارنامہ 'ترجمہ گایتری' ہے۔ یہ وید مقدس کی مشہور دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک بتائی جاتی ہے۔ برہمن اسی دعا کو بے حد احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بڑی عقیدت سے پڑھتے ہیں۔ یہ منتر اعلیٰ ذات کے لئے مخصوص ہے۔ صرف پنڈت جو برہم کے مکھ سے پیدا ہوئے ہیں، وہ اس کا پاٹھ کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ سر یا دماغ کے حصہ سے پیدا ہونے کی وجہ سے علم وآگہی انھیں کے حصہ میں آئی ہے۔ اس منتر کو پڑھتے وقت طہارت اور پاکی کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ یہ دعا ایک طرح سے پورے ویدوں کا مغز ہے جو تقریبات اور مذہبی مجالس میں خصوصاً پڑھی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ہندوستان کے ویدک دھرم کا قومی نغمہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اقبالؔ نے اس مخصوص دعا کے فوائد اور ضرورت کو محسوس کر کے اردو نظم کا جامہ پہنایا یہ نظم ''بانگِ درا'' میں 'آفتاب' کے عنوان سے موجود ہے:

اے آفتاب! روح وردانِ جہاں ہے تو　　شیرازہ بند دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا　　ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے　　ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے　　تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے　　دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے　　چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو　　یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستیِ ہر جاندار میں　　تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو  زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

نے ابتدا کوئی، نہ کوئی انتہا تری

آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیاء تری

اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کہ اقبالؔ کو اس منتر کے کن خواص نے متاثر کیا لیکن ہندو عرب کلچر کے مشترک نمائندہ ہونے کی بنیاد پر اس نظم میں بعض مشترک احساسات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اوّل تو یہ قادر مطلق اور رب کائنات کی ثنا کے مماثل ہے کہ اس میں ایسے آفتاب کی بڑائی ہے، جو ہر شئے کا پالنے والا ہے اور جس سے ہر چیز کسب ضیاء کرتی ہے یعنی زندگی حاصل کرتی ہے اور جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ایک طرح سے تجلی خدا وندی کا عکس ہے۔ اس کے علاوہ تعریف و توصیف میں بعض مشترک خیالات ہندو عرب تہذیب کے نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

| | | |
|---|---|---|
| سرور کشک | : | خیر الحافظین کے قریب ہے |
| جگت کا پران | : | مالک یوم الدین سے نزدیک ہے |
| دکھوں کا ہرنے والا | : | الرحمٰن الرحیم سے قریب معلوم ہوتا ہے |
| سکھوں کا دینے والا | : | نعم النصیر سے قریب معلوم ہوتا |
| سروویاپک | : | حاضر و ناظر، نور السمٰوٰتِ والارض |
| سروشریشٹھ | : | نعم المولیٰ، ارفع و اعلیٰ |
| اتم مارگ بتانے والا | : | ہادی، اِھدنا الصراط المستقیم سے قریب محسوس ہوتا ہے |
| سب کو اُتپن کرنے والا | : | رب العالمین سے قریب محسوس ہوتا ہے |

ترجمہ کے لئے اقبالؔ نے اس دعا کی صرفی و نحوی خوبیوں، اعلیٰ مطالب، بے جھول، در و بست اور دلکش نغمگی کے باعث اردو زبان کو قاصر محسوس کیا جس کے اظہار کے لئے اردو الفاظ ناکافی ہیں۔ اس لئے اس نظم کی اشاعت کے ساتھ ایک تعارفی نوٹ بہ طور مقدمہ کے لکھا۔ اس نوٹ میں انھوں نے ہندی اور ویدک تہذیب و تمدن سے متعلق اپنا موقف بھی ظاہر کیا۔ اس شذرۂ تمہیدی میں انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے:

''ذیل کے اشعار رِگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں، جس کو گایتری منتر کہتے ہیں۔ یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا ان تاثرات کا اظہار ہے، جنھوں نے

نظام عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدہ سے اوّل اوّل انسان ضعیف البیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔اس قسم کی تحریروں کا مطالعہ علم ملل والنحل کے عالموں کے لئے انتہا درجہ کا ضروری ہے کیوں کہ ان سے انسان کے روحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ محققین السنہ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں، ان کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونز کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں۔لیکن حق یہ ہے کہ سنسکرت زبان کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ ''سوتر'' استعمال کیا گیا ہے، جس کے لئے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ ''آفتاب'' رکھا ہے۔لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیاء کرتا ہے۔اکثر قدیم قوموں نے نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو نور سے تعبیر کیا ہے۔قرآن شرف میں آیا ہے ''اللہ نور السمٰوٰت والارض'' اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک نور ہے، جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔علیٰ ہذا القیاس افلاطون الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران قدیم کے انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں یہ دقت اور بھی بڑھ گئی کیوں کہ اصل الفاظ کی آواز کی موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو اِن کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے، اردو زبان میں منتقل نہیں ہوسکتا۔گایتری کے مصنف نے ملک الشعراء ٹینی سن مرحوم کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کے ہیں جن میں حروفِ علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے، جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمہ کی بنیاد اس سوکت (گفتارِ زیبا) پر رکھی ہے، جس کو سوریہ نارائن اپنیشد میں گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ترجمہ کرنے کو تو

میں نے کر دیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو چیپ مین نے پوپ کا ترجمہ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن گایتری نہیں ہے۔''

(''باقیاتِ اقبال'' از عبدالواحد معینی، صفحہ:61)

زایدگان نور سے متعلق نوٹ پر اقبالؔ نے لکھا ہے:

''سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوق تصور کرتے تھے، ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا جس کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیوں کہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے، اگر چہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح معلوم نہیں ہوتا۔''

(باقیاتِ اقبالؔ، صفحہ:43)

'جاوید نامہ' میں اقبالؔ مولانا رومؔ کی رہنمائی میں آسمانی سفر کرتے ہیں تو ان کی ملاقات فلک قمر پر ''عارف ہندی'' سے ہوئی۔ 'جاوید نامہ' کے اس باب کا نام:

''عارف ہندی کہ بہ یکے غار ہائے قمر خلوت گرفتہ اہل ہند اورا ''جہاں دوست می گویند'' رکھا ہے۔

(عارف ہندی جو قمر کے ایک غار میں رہتا ہے اور ہندوستان والے اسے جہاں دوست کہتے ہیں)

رومی کی معیت میں عالمانہ گفتگو ہوتی ہے اور اقبالؔ اس عارف ہندی کے نو اقوال حاصل کرتے ہیں۔ اقبالؔ نے اس عارف ہندی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

موئے بر سربستہ و عریاں بدن　　گرد او مارے سفیدے حلقہ زن
آدمے از آب و گل بالا ترے　　عالم از دیر خیالش پیکرے
وقت او را گردش ایام نیست　　کار او با چرخ نیلی فام نیست

گفت با رومی کہ ہمراہ تو کیست
در نگاہش آرزوئے زندگیست

(''کلیاتِ اقبال''، صفحہ:622)

''تلمیحاتِ اقبالؔ'' میں سید عابد نے عارف ہندی (جہاں دوست) کے بارے میں لکھا ہے:

''قیاس چاہتا ہے کہ اس سے مراد مشہور رشی وِشوامتر ہو، جس کی پرہیزگاری اتقا اور اخلاقی سر بلندی کی داستانیں اب تک مشہور ہیں۔ وِشوامتر کا زمانہ ایک ہزار قبل مسیح سے پہلے پڑنا چاہئے، یہ مورخوں کی رائے ہے لیکن روایات کا بیان یہ ہے کہ وِشوامتر کا زمانہ پانچ ہزار سال قبل مسیح ہے۔'' (''تلمیحاتِ ہند''، صفحہ:334)

ماہرینِ اقبالؔ کا یہی خیال ہے کہ ''جہاں دوست''، ''وِشوامتر'' کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس لئے اس ''عارف ہندی'' کو وِشوامتر تصور کرتے ہیں لیکن جگن ناتھ آزاد ''جہاں دوست'' کی دوسری تعبیر پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بیشتر ماہرینِ اقبال ''جہاں دوست'' کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔

اقبالؔ کے ذہن میں اس وقت پاروتی کے شوہر شیو جی مہاراج تھے، جن کے سر پر جوڑا بندھا ہوا ہے اور سفید سانپ ان کے گردن میں پڑا ہوا ہے۔ ان کے ماتھے پر ہلال کا نشان ہے۔ یہ وِشوامتر کی تصویر نہیں ہے بلکہ شیو جی مہاراج کی ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب "Iqbal, Mind and Art" میں لکھا ہے:

"This مارے سفیدے حلقہ زن (his neck encircled by a writing serpent white) reveals that there Iqbal has in his imaginations SHIVA JI MAHARAJ (Lord Shiva) the holy spouse of Parwati and not VISHVAMITRA. SHIVA JI carries the symbol of new moon (Hilal) on this forehead. Iqbal meets him in the sphere of moon. This was just by way of passing reference. What I actually mean to convey is that Iqbal holds SHIVAJI high esteem as spiritual force and a fountain head that of philosophical thought, guiding mankind. Iqbal in this part of "Javed Nama" has made SHIVAJI explain the subtleties of Hindu philosophy also known as the ancient India poetry & literature. Among Indian poets it is only Iqbal to whom goes the credit for his unique contribution to Persian literature and those claiming to be the defenders and protagonists of Indian culture could not even approach Iqbal in respect of contribution to literature on this score."

جگن ناتھ آزاد آگے لکھتے ہیں:

"VISHVAMITRA is the literal translation of "Jahan Dost" while Lord Shiva in Hindu mythology is this Deity of God in relation to the world so in this respect LORD SHIVA is VISHVAMITRA." (Page: 90)

یہ مسئلہ فلسفیانہ ہے اور ہندی فلسفیوں کے سلجھانے کا ہے۔ اس موقع پر ہمارے لئے دونوں اس لئے برابر ہیں کہ دونوں ہندوستانی تہذیب وتمدن کے نمائندے ہیں۔ اقبالؔ نے ہندوستانی معرفت کو اجاگر کرنے کے لئے ''جہاں دوست'' کا انتخاب کیا ہے۔

''جاوید نامہ'' ایسی کتاب ہے، جس میں ہندوستان کے بزرگوں، مذہبی پیشواؤں اور عالموں کو بڑے مقام پر فائز کیا گیا ہے اور انھیں بہت ہی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

عارف ہندی ''جہاں دوست'' کے بعد ''فلک قمر، پر وادیِ طویٰ سین ان میں سے ایک اسٹیشن کا نام گوتم بدھ کے نام پر طاسین گوتم رکھا گیا ہے۔ یہاں گوتم بدھ کے افکار سننے کو ملتے ہیں:

چشم مخمور و نگاہے غلط انداز و سرود — ہمہ خوب است ولے خوشتر ازاں چیزے ہست
حین رخسار دمے ہست و دمے دیگر نیست — حین کردار و خیالات خوشاں چیزے ہست

اور پھر رقاصہ عشوہ فروش توبہ کرتی ہے:

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بے قرار را — یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را
ذوق حضور دو جہاں رسم صنم گری نہاد — عشق فریب می دہد جان امیدوار را
تا بفراغ خاطرے نغمۂ تازۂ زنم — باز بہ مرغزار دہ طائر مرغزار را
طبع بلند دادۂ، بند نہ پائے من کشائے — تا بہ پلاس تو دہم خلعت شہریار را

تیشہ اگر بہ سنگ زد این چہ مقام گفتگوست
عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

(''کلیاتِ اقبالؔ فارسی''، صفحہ:636)

عارف ہندی اور گوتم بدھ کے علاوہ ''جاوید نامہ'' میں سب سے ارفع مقام ''آن سوئے افلاک'' ہے۔ اس مقام پر اقبالؔ کی ملاقات ''بھرتری ہری'' سے ہوتی ہے۔ اقبالؔ ہندوستان کے اس عظیم اخلاقی اور روحانی شاعر کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور ان سے بات چیت کرتے ہیں۔ کتاب ''اقبالؔ کا ایک ممدوح بھرتری ہری'' میں

ایک اردو ترجمہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ مطالعہ کے لئے ترجمہ نگار کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

حور یاں جلوہ وہ قصرہ خیام　　میرا نالہ دعوت سوز تمام
سر نکالے خیمہ سے باہر کوئی　　اور کسی کھڑکی سے جھانکے دوسری
میں نے جنت میں ہر اِک کو دل دیا　　اس جہاں کے درد و غم کا کچھ پتا
زیر لب ہنستے تھے پیر پاک زاد　　بولے اے ''جادوگر ہندی نژاد''
کر نوا پرداز ہندی پر نظر　　اِک نظر سے اس کی ہے شبنم گہر
نام ہے اس نکتہ ور کا بھرتری　　ہے جو فطرت میں صحاب آذری
وہ چمن سے غنچہ نورس چنے　　تیرا نغمہ اس کو ہم تک کھینچ لائے
بادشہ جس کی نوا سے ارجمند　　فقر میں بھی ہے مقام اس کا بلند
نقش آرا اس کی ہی فکر شگرف　　اِک جہان معنی اس کا حرف حرف
کارگاہ زیست کا محرم ہے وہ　　شعر اس کا جام جم ہے، جم ہے وہ

پھر کھڑے ہو کر اسے تعظیم دی
اور اس کے ساتھ محفل جم گئی

اقبالؔ بھرتری ہری سے سوال کرتے ہیں:

تو نے کھولے نکتہ ہائے دل نواز　　تجھ سے مشرق بن گیا دانائے راز
شعر میں اے نکتہ سنج خوش نوا　　سوز آتا ہے کہاں سے یہ بتا

مجھ پہ کھلتا کچھ نہیں یہ ماجرا
یعنی اصل اس کی خودی ہے یا خدا

بھرتری ہری جواب دیتے ہیں:

کون جانے ہے کہاں شاعر چھپا　　اس کا پردہ ہے بم وزیر نوا
تجھ کو حاصل ہے دل گرم و فگار　　پیش یزداں بھی نہیں جس کو قرار
جاں کو لذت بخشتی ہے جستجو　　سوز بخش شعر ہے بس آرزو
تو سخن کی مے سے ہے مست مدام　　اے تجھے آئے میسر یہ مقام

شعر اگر دو ایک لا سکتا ہے تو

حور کا دل بھی چرا سکتا ہے تو

اقبال:

کھا رہے ہیں اہلِ ہند اِک پیچ وتاب وقت ہے اب سر حق کر بے حجاب

اس کے بعد اقبالؔ نے بھرتری ہری کی ایک غزل کا ترجمہ پیش کیا ہے۔''جاوید نامہ'' 1932ء کی تصنیف ہے اور''بالِ جبریل'' 1935ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔اس کتاب کو اردو میں کتاب حوالہ کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔اردو کی اس اہم تصنیف کے آغاز میں اقبالؔ نے بھرتری ہری کے ایک اشلوک کا ترجمہ کیا ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

شاید اس سے مراد ہے کہ''بالِ جبریل'' اہلِ نظر کی کتاب ہے، ناداں لوگوں پر اثر انداز ہوگی۔اس''بالِ جبریل'' کی غزلوں میں ایک شعر ہے:

نظر نہ ہو تو مرے حلقہ سخن میں بیٹھ کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل

بھرتری ہری کا یہ خیال اس کی سنسکرت شاعری نیتی شتکم نامی کتاب سے لیا گیا ہے۔اقبالؔ نے اس نکتہ اور خیال کو''بالِ جبریل'' میں ترجیح دی ہے۔یوسف سلیم چشتی نے بھرتری ہری کے اس اشلوک کی نشان دہی کی ہے۔یہ شعر نیتی شتکم کے چھٹے اشلوک کا ترجمہ ہے:

(جو شخص بدخصل لوگوں کو شیریں کلام سے راہِ راست پر لانا چاہتا ہے، وہ کنول کے نازک ریشوں سے بدمست ہاتھی کو باندھنا چاہتا ہے۔سرس کے پھول کے اگلے حصے سے ہیرے کو بیدھنا چاہتا ہے اور شہد کے قطرے سے کھارے سمندر کو میٹھا کرنا چاہتا ہے۔)

اقبالؔ کے سنسکرت زبان سے مختلف تراجم اور فلسفیانہ مباحث کے علاوہ سنسکرت عالموں سے اقبالؔ کے عرفان وآگہی سے اس بات کے بین ثبوت فراہم ہوتے ہیں کہ اقبالؔ سنسکرت زبان سے واقف تھے۔اقبالؔ نے سرکشن پرشاد شاد کو لکھا:

''سرکار نے میرا ترجمہ''گایتری'' پسند فرمایا ہے۔میرے لئے یہ بات سرمایۂ فخر وامتیاز ہے۔ افسوس کہ سنسکرت الفاظ کی موزونیت اردو زبان میں منتقل نہیں ہوسکتی۔بہر حال غالباً اصل مفہوم اس میں آ گیا۔زمانے نے مساعدت کی تو''گیتا'' کا اردو ترجمہ کرنے کا قصد ہے۔ فیضی کا ترجمہ تو حضور کی نظر سے ضرور گزارہ ہوگا۔فیضی کے کمال میں کس کو شک ہوسکتا ہے مگر اس کے ترجمہ میں اس نے گیتا کے مضامین اور اس کے اندازِ بیان کے ساتھ بالکل انصاف

نہیں کیا بلکہ میرا تو یقین ہے کہ فیضی 'گیتا' کی روح سے نا آشنا رہا۔''

فیضی کے گیتا کے ترجمے کے متعلق اقبالؔ کا محاکمہ خود اقبالؔ کی سنسکرت سے گہری واقفیت کے بغیر ممکن نہیں اور یہ ان کی سنسکرت سے واقفیت کا داخلی ثبوت ہے۔ سنسکرت عالمی زبانوں میں اعلیٰ وارفع زبان ہے، جس کا ذخیرۂ الفاظ وسیع اور قواعدی ساخت تصریفی انداز لسانی اعتبار سے اسے عالمی زبانوں میں ممتاز درجہ پر فائز کرتا ہے۔ سنسکرت کی تشبیہات واستعارات شاعرانہ دروبست، معنی کی تہہ داری اور موسیقیت عالمی زبانوں میں بے مثال ہے۔ ان ساری خصوصیات کے ادراک کے بغیر ''گیتا'' کے ترجمے میں کامیابی حاصل کرنا ناممکن العمل ہے۔ اقبالؔ نے اس حقیقت حال کا اس خط میں اظہار کرتے ہوئے فیضی کے ترجمہ پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔

اقبالؔ کی سنسکرت ادب اور ہندوستانی فکر وفلسفہ سے گہری دلچسپی تھی، وہ صرف گیتا ہی کے ترجمہ کا قصد نہیں کرتے تھے بلکہ وہ رامائن کا اردو ترجمہ کرنے کے خواہش مند تھے تاکہ یہ عالمی ادبی وفلسفیانہ شاہکار اردو میں منتقل ہوکر اہل اردو کی فکر کو روشن وتابناک بنائے۔ 19/اپریل 1919ء میں مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میرا اِرادہ رامائن کو اردو میں لکھنے کا ہے۔ سرکار کو معلوم ہوگا مسیح جہانگیری نے رامائن کے قصے کو فارسی میں نظم کیا ہے۔ افسوس ہے وہ مثنوی کہیں دستیاب نہ ہوئی مگر سرکار کے کتب خانے میں ہو تو کیا چند روز کے لئے عاریتہً مل سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس کا تتبع کرنا بہتر ہوگا۔''

گایتری منتر کے ترجمہ کے شذرہ تمہیدی میں اقبالؔ نے سنسکرت زبان وادب اور قواعد سے جس طرح بحث کی ہے، وہ سنسکرت زبان سے ناواقف شخص کے قلم سے نکلنی ناممکن ہے۔ اقبالؔ کی سنسکرت زبان وادب میں دلچسپی بھی ہندوستان کی تہذیب وتمدن سے دلچسپی کے باعث تھی، انھیں ہندوستان کی تہذیب وتمدن اور اقوام سے بے حد لگاؤ تھا۔

اقبالؔ کو ہندوستانی تہذیب وتمدن، فکر وفلسفہ اور علم وآگہی سب سے بے پناہ محبت تھی۔ دیباچہ ''اسرار خودی'' میں لکھتے ہیں۔ ہندو قوم کے دل ودماغ میں عملیات ونظریات کی ایک عجیب طریق سے آمیزش ہوئی ہے۔ اس قوم کے موشگاف حکما نے قوت عمل پر نہایت دقیق بحث کی ہے

## 11.3: 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کا متن

### ابلیس

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دُنیائے دوں — ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز — جس نے اس کا نام رکھا تھا جہان کاف ونوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب — میں نے توڑا مسجد و دَیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کر دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد — جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

### پہلا مشیر

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام — پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود — ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں — ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون بھی — ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں، علمِ کلام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا — کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

کس کی نومیدی پہ حجّت ہے یہ فرمانِ جدید
''ہے جہاد اس دَور میں مردِ مسلماں پر حرام''

### دوسرا مشیر

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر!
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

### پہلا مشیر

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے — جو ملوکیت کا اِک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس — جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے　　یہ وجودِ میر و سلطاں، پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو　　ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

## تیسرا مشیر

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب　　ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیم بے تجلی؛ وہ مسیح بے صلیب　　نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز　　مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

## چوتھا مشیر

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب
کون بحرِ روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا
''گاہ بالد چوں صنوبر، گاہ نالد چوں رباب''

## تیسرا مشیر

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب

## پانچواں مشیر

(ابلیس کو مخاطب کر کے)

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار　　تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
آب و گل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز　　ابلہِ جنت تری تعلیم سے دانائے کار
تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں　　سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف　　تیری غیرت سے ابد تک سرنگون و شرمسار

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار

وہ یہودی فتنہ گر، وہ روحِ مزدک کا بُروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ
کتنی سُرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اِک مشتِ غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

## ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ، کیا آسمانِ تو بہ تو

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو

کیا اِمامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

کار گاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو!

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

## (۲)

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مردِ آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے زمیں!
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب　　یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

(۳)

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات　　ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟　　ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے　　یا مجدّد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم　　اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دَور میں　　یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے　　تابساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام　　چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر　　جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں　　ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

## 11.4: 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کا تعارف اور پس منظر

یہ نظم علامہ اقبالؔ کے چوتھے اور آخری مجموعہ کلام ''ارمغانِ حجاز'' سے ماخوذ ہے جو 1936ء میں شائع ہوا۔ اس نظم میں دنیا کے انتظامی اُمور اور کاروباری نظامِ حیات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے جو اقبالؔ کے سیاسی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عالم مشرق سے سیاسی طاقت چھین لی گئی ہے اور اسے پوری طرح یوروپ کا غلام بنا دیا گیا۔ اپنی اس فتح یابی پر ابلیس بہت خوش ہے اور فخر و ناز کے انداز میں سامنے آتا ہے۔ اسے خوشی ہے کہ اُس کا پھیلایا ہوا جعل کامیاب ہو گیا ہے اور یوروپ والے پوری طرح ابلیس کے مطیع و فرماں بردار بن گئے ہیں۔ انھیں کے سہارے وہ دنیا میں اپنی حکومت کا جھنڈا گاڑے ہوئے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اسے ایک فکر بھی کھا رہی ہے کہ اس دنیا میں کوئی نظام ہے جو ابلیسی نظام کو تہس نہس کر دے گا۔ مگر وہ کیا ہے اس غم میں اس نے ایک میٹنگ

کال کی اوراس میں اپنے تمام مشیروں اوروزیروں کوجمع کیا، پھرایک ایک کرکے سب سے سوال وجواب کرتا رہا۔

## 11.5: 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کا تجزیہ

سب سے پہلے اس نے خودتقریر کی اور کہا کہ دیکھو میں نے یوروپ کوملوکیت (Imperialism) کے خواب میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں نے مسجد، دیراور کلیسا یعنی مذہبی افکار کوختم کر دیا ہے۔غریبوں کوتن بہ تقدیر رہنے کا درس دیا ہے، وہ اپنی قسمت میں راضی پڑے ہوئے ہیں اور دولت مندوں کوسرمایہ داری کے جنوں میں مبتلا کر دیا ہے۔اب تم لوگ بتاؤ کیا یہ نظام ختم کیا جاسکتا ہے؟ ابلیس کے اس سوال کوسُن کراس کا پہلا مشیر کھڑا ہوااور کہنے لگا کہ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابلیسی نظام بہت مضبوط ہےاوراس کی بدولت غریب عوام غلامی کے عادی ہو گئے ہیں۔ان بے چاروں کوعبادت میں مشغول کر دیا گیا ہے وہ ایسی عبادت کرنے میں جوسجدے میں پڑے رہنے والی ہے، وہ نماز میں کھڑے ہونے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ان غلاموں کے دل میں کوئی آرزو پیدانہیں ہوتی اور یہ تمام تر ہماری مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے کہ صوفی اورملاّ بھی ملوکیت کے بندے بن گئے ہیں۔طواف وتسبیح یعنی صفاومروا کی دوڑ دھوپ محض نمائشی ہے۔اس کے اندر سے جدوجہد کا پیغام خارج ہوگیا ہےاوراب تو نیا فرمان یہ جاری ہوگیا ہے کہ ''ہے جہاداس دور میں مردمسلماں پرحرام''۔ یہ اُس دور میں بعض علماء نے فتوے جاری کیے تھے کہ یہ زمانہ تلوار کا نہیں قلم کا زمانہ ہے۔مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ جہادحرام ہے،اس لئے جہاد کی ضرورت نہیں رہی۔اس پر دوسرا مشیر بولا:

اے مشیراوّل تو دنیا کے تازہ فتنوں سے بےخبر ہے۔ایک اور نیا فتنہ پیدا ہورہا ہےاور وہ ہے جمہوری لباس میں سلطانی یعنی حکمراں آزادی کا خواب دکھا کر پھرخود اپنی بادشاہت قائم کرتے ہیں۔اس پر وہ پہلا مشیر بولا:

میں اے مشیر دوم میں سلطانی جمہور کے شوروغوغا سے باخبر ہوں، ہم نے تو خودشہنشاہیت کو جمہوریت کا لباس پہنایا ہے۔ یہ امیراور سلطاں پرمنحصرنہیں ہے۔شہریاری کی حقیقت تو یہ ہے کہ سلطان وشہنشاہ وہ ہے جوغیر کی کھیتی پرنظر رکھے۔ذرامغرب کے جمہوری نظام پرغور کرلے۔اس کا ظاہر دلکش اور پُرفریب ہےلیکن باطن چنگیز سے زیادہ غارت گر ہے۔ پہلے مشیر کی اس گفتگو کے بعد تیسرا مشیر بولا کہ:

یہ بات درست ہے کہ سلطانیت کی روح باقی رہے ہمارے لئے یہی کافی ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ اس یہودی کمیونسٹ کا کیا جواب ہے،جس نے غریبوں اورغلاموں کو بیدار کر دیا۔مزدوروں کومتحد کر دیااورنوبت یہ آ گئی کہ غلاموں نے آقاؤں کے خیموں کی رسیاں کاٹ ڈالیں اور سلطانی یعنی ایک آدمی کی حکومت کا تصور چکنا چور کر دیا۔

اس پر چوتھا مشیر بولا کہ بھئی اس کا توڑ رومۃ الکبریٰ یعنی اٹلی کے ایوانوں میں دیکھو ہم نے پھر جمہور عوام کو سلطنت یعنی آلِ سیزر کو سیزر بادشاہ کا خواب دکھایا ہے۔ وہاں پر مسولینی اب خود بڑی سلطنت کا آمر بن گیا ہے۔

اس پر تیسرا مشیر پھر گیا ہے۔ نہیں بھائی میں تو اس شخص کی عاقبت اندیشی کا قائل نہیں جس نے افرنگی سیاست کو اس طرح سے بے نقاب کر دیا۔ اس پر پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کرنے کے کہنے لگا کہ:

آقا ہم تیری فراست کے قائل ہیں۔ تو نے اس خاموش اور پُرسکون دنیا میں حرارت پیدا کر دی ہے اور یوروپ کے تمام تر ساحر تیرے مرید اور تیرے مطیع و فرماں بردار ہیں لیکن مجھے اب ان کی دانائی اور عقل مندی پر بھروسہ نہیں کیوں کہ وہ یہودی فتنہ گر جس کا نام کارل مارکس ہے، اس کے اندر مزدک کی روح حلول کر گئی ہے جو یہ کہتا تھا کہ عورت، دولت اور زمین پر سب کا برابر کا حق ہے۔ اب وہی بات یہ کارل مارکس بھی کہہ رہا ہے یعنی غلاموں میں بیداری پیدا کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارا نظام تباہ ہو جائے گا۔

اپنی کانفرنس کے پانچوں مشیروں کی باتیں سننے کے بعد ابلیس خود کھڑا ہوا اور اپنے مشیروں سے خطاب کر کے کہا کہ یہ پوری دنیا میرے تصرف میں ہے۔ جس وقت میں اقوامِ یوروپ کا لہو گرما دوں گا اس وقت ساری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی سارا عالم میرا ہی فرماں بردار ہے۔ مزدک کے خیالات ان پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔ مجھے ان اشتراکی کوچہ گردوں سے ذرا بھی ڈر نہیں ہے جو پریشاں حال ہیں، سوشلسٹ ہیں اور بال بکھیرے ہوئے سر پھرے گھوم رہے ہیں۔ مجھ کو جو خطرہ لاحق ہے، وہ اس امت سے ہے جس کی بجھی ہوئی راکھ میں آرزو کی چنگاری اب بھی موجود ہے۔ وہ کم بخت اب بھی دنیا میں اکّا دکّا نظر آتے ہیں جو صبح سویرے اٹھ کر اللہ کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے ہیں۔ تم کو معلوم ہے ان پر زمانہ کے حالات ظاہر ہیں اور اصل میں تم جس کو ''مزدکیت'' کہہ رہے ہو وہ اشتراکی فتنہ ''مارکسزم'' نہیں بلکہ ''اسلام'' ہے۔

دوسری بات یہ کہ مجھے معلوم ہے یہ قوم حاملِ قرآن نہیں ہے۔ پیرانِ حرم ید بیضا کی کرامت سے محروم ہیں۔ لیکن خوف اس بات کا ہے کہ ان لوگوں پر پیغمبر آخرالزماں کی شریعت آشکارا نہ ہو جائے۔ خطرہ اور ڈر اس قانون سے ہے جو نبی آخرالزماں نے دنیا کو دیا۔ (۱) انھوں نے عورتوں کی عزت کی حفاظت کرنا سکھایا ہے۔ مردوں کو پرکھنے والے مرد پیدا کیے۔ ہر غلامی کے لئے موت کا پیغام دیا، جس میں نہ کوئی بادشاہ، نہ کوئی فقیر۔ (۲) انھوں نے دولت کو ہر قسم کی گندگی سے پاک کر کے، دولت مندوں کو اس کا محافظ بنایا۔ (۳) زمین کے بارے میں بتایا کہ زمین صرف اللہ کی ہے۔ کسی زمین دار یا بادشاہ کی نہیں ہے۔ اسلام کا یہ قانون اگر دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہے تو بہتر ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ مردِ مومن خود یقین سے محروم ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ وہ الٰہیات یعنی اللہ کی ذات سے متعلق فلسفیانہ موشگافیوں میں گھرا رہے۔ اللہ کی کتاب کے بارے میں نئی نئی تاویلات گھڑتا رہے اور اصل مطلب کے بجائے دوسرے غلط مطالب نکالتا رہے۔

اور وہ خدا اندیش مومن ایسی فروعی تاویلوں اور بے سود مباحث میں اُلجھا رہے کہ ابن مریم مر گیا یا زندہ ہے؟ صفات ذات حق عین حق ہیں یا حق سے الگ؟ آنے والا مسیح حضرت مجدد ہے جس میں حضرت عیسیٰ کی خصوصیات ہوں یا نصاریٰ کا مسیح؟ قرآن کریم کے الفاظ حادث ہیں یا قدیم؟ امت مرحوم کی نجات کس عقیدے میں ممکن ہے؟ یہ علم الٰہیات کے لات ومنات، تاویلاتی بت مسلمان کے لئے کافی نہیں ہیں تا کہ وہ قرآنی پیغام اور پیغمبری کردار سے بے خبر رہے؟ اے مشیرو! خیر اسی میں ہے کہ تم اسے اسلامی تعلیمات سے بے گانہ رکھو تا کہ مومن اس دنیا کو اوروں کے لئے چھوڑ کر قیامت تک غلام بنا رہے۔ اس کے حق میں وہی شعر وتصوف بہتر ہے جو اس کی نگاہوں سے زندگی کا منظر چھپا دے۔ اس مرد مومن کو ذکر وفکرِ صبح گاہی میں ہی مست کر دو اور مومن خانقاہی نظام میں دنیا و مافیہا سے بے خبر خلوت اور گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر ذکرِ الٰہی کرتا رہے۔

## 11.6: آپ نے کیا سیکھا؟

'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' علامہ اقبالؔ کی زندگی کے آخری ایام کی نظم ہے۔ عہدِ حاضر میں دینِ حق کے مذہبی اقدار مٹ جانے سے ابلیس بہت خوش ہے اور مغرب میں اپنے ابلیسی نظام کے قیام سے مطمئن ہے کہ اب اس نظام کو درہم برہم کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کو ایک فکر بھی لاحق ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا نظام پارہ پارہ ہو جائے اور اس دنیا میں خدائی نظام پھر سے قائم ہو جائے۔ اس لئے اس نے اپنے تمام دوستوں کو جمع کیا اور اس میٹنگ میں اپنی تشویش رکھی کہ کیا کوئی میری مکاری کو ختم کر سکتا ہے۔ اس پر کسی نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ کسی نے کہا کہ کارل مارکس کا چیلنج زبردست ہے۔ اس نے آمریت کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے اور غریبوں، ناداروں اور غلاموں کو جگا دیا ہے۔ کسی نے کہا کہ نہیں اب وہی غلام خود آقا بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ کسی نے کہا کہ مارکس کا نظام مزدکیت پر مبنی ہے۔ اس نے مزدکیت کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے یعنی عورت، دولت اور زمین پر سب کا برابر کا حق ہے۔ اس پر آخر میں ابلیس نے کہا کہ نہیں مارکسیت، مزدکیت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہمیں تو اس نظام سے ڈر ہے جو آخری رسول نے قرآن کے ذریعہ دیا ہے یعنی شریعت محمدی ہی ہمارے لئے اصل خطرہ ہے۔ انھوں نے عورتوں کے حقوق کی بحالی کی ہے۔ ان کو عزت اور وقار بخشا۔ ان کو ان کا مرتبہ عطا کیا۔ انھوں نے دولت کو سود اور ناجائز طریقوں کی کمائی سے پاک صاف کیا اور منعم کو اس کا مالک نہیں محافظ بنایا۔ اس طرح انھوں نے زمین کو کسی کی جائیداد نہیں قرار دیا۔ انھوں نے بتایا کہ زمین تو صرف اللہ کی ہے۔ اور وہی اس پر قابض ہے اور رہے گا۔ اس لئے ان لوگوں کی نگاہوں سے یعنی مسلمانوں کے علم سے یہ باتیں چھپا کر رکھو کہ دنیا میں بھی تمہارا حق ہے۔ انھیں تو قرآن کی تعلیمات سے بے بہرہ کر دو اور صرف صبح وشام کے ذکر اور سجود وتسبیحات میں اُلجھا کر رکھو تا کہ یہ لوگ قیامت تک دنیا کو دوسروں کے لئے چھوڑ کر بیٹھ جائیں اور ہمیشہ ہمیشہ غیروں کے غلام بنے رہیں۔

## 11.7: اپنا امتحان خود لیجئے

۱۔ 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' اقبالؔ کے کس مجموعہ کلام میں شامل ہے؟

۲۔ 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' اقبالؔ نے کس زمانے میں لکھی؟

۳۔ 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' میں کتنے کردار ہیں؟

۴۔ ابلیس کے مشیروں نے ابلیسی نظام کو کس سے خطرہ بتایا؟

۵۔ ابلیس نے آخر میں کیا جواب دیا اور کس کو سب سے بڑا خطرہ بتایا؟

## 11.8: سوالات کے جوابات

۱۔ 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' اقبالؔ کے آخری مجموعہ ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل ہے۔

۲۔ یہ نظام اقبال نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں لکھی۔ اس کے تقریباً دو سال بعد اپریل 1938ء میں اقبالؔ کا انتقال ہی ہو گیا۔

۳۔ 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' میں پانچ کردار اس کے مشیروں کے ہیں اور چھٹا کردار وہ خود ہے۔

۴۔ ابلیس کے مشیروں نے کارل مارکس کو خطرہ بتایا اور بعض نے مزدکیت کو خطرہ بتایا جو مارکسی چولہ پہن کر سامنے آرہی ہے۔

۵۔ ابلیس نے کہا کہ نہیں ابلیسی نظام کو صرف اسلامی شریعت سے خطرہ ہے۔ انھوں نے زن، زر اور زمین کے سچے اور آفاقی اصول قائم کیے۔ اس عہد میں صرف ان لوگوں سے خطرہ ہے جو رات کے آخری حصہ میں اُٹھ کر اللہ کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے ہیں۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے تو ہمارا نظام پاش پاش ہو جائے گا۔

## 11.9: فرہنگ

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| ابلیس | شیطان | مجلس شوریٰ | باہم مشورہ کرنے والی محفل |
| عناصر | جمع عنصر کی یعنی خاک، باد، آب، آتش | عرشِ اعظم | خدا اور فرشتوں کا ٹھکانہ |
| کاف ونون | کاف ونون سے مراد ''کُن'' ہے۔ خدا جب کچھ پیدا کرنا چاہتا ہے تو ''کُن'' (ہو جا) فرما دیتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے | ملوکیت | بادشاہت |
| منعم | دولت مند | سرمایہ داری | دولت اکٹھی کرنے کی حالت |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ابلیسی نظام | شیطانی کاموں کا سلسلہ | خوئے غلامی | غلامی کی عادت |
| نماز بے قیام | مراد غلامی، آزاد قوم کی طرح سر بلند نہ رہنا | طبعِ مشرق | مشرقی قوموں کا مزاج |
| افیون | افیم | علم کلام | وہ علم جس میں اسلامی عقیدے دلیلوں سے ثابت کیے جائیں |
| طواف | کعبہ کے گرد چکر لگانا | فرمانِ جدید | نیا حکم، اشارہ ہے قادیانی رہنما مرزا غلام احمد کے اس فتوے کی طرف کہ اب اس دور میں جہاد کی ضرورت نہیں |
| سلطانی جمہور | عوام کی حکومت | غوغا: | شور، ہنگامہ |
| تازہ فتنے | نئے نئے جھگڑے | جہاں بینی | دنیا کے معاملات اور حالات پر گہری نظر رکھنا |
| ملوکیت کا اِک پردہ | مراد جمہوریت کی آڑ میں دراصل بادشاہت ہی کا عمل ہے | جمہوری لباس | بادشاہت کو جمہوریت کے جعلی نام سے برقرار رکھا ہے |
| خودنگر | اپنی ذات پر نظر رکھنے والا | شہریاری | بادشاہت |
| پرویز | مشہور ایرانی بادشاہ خسرو پرویز، مراد کوئی بھی بادشاہ | جمہوری نظام | عوامی حکومت کا طریقہ |
| چہرہ روشن | ظاہر میں اچھا نظام | چنگیز | وہ ظالم منگول جس نے تیرہویں صدی میں ایران میں مسلمانوں کا قتل عام کیا |
| مسیح ناصری | نصرانیوں کا مسیح | حادث یا قدیم | فلسفہ الٰہیات کی ایک بحث مراد قرآنی الفاظ افزائش دنیا کے بعد تخلیق ہوئے یا خدا کی طرح قدیم ہیں |

مزاج خانقاہی　　خانقاہ میں رہنے کی عادت مراد
بےعمل زندگی

(الفاظ ومعانی ماخوذ از کلیاتِ اقبال از عبدالحمید یزدانی)

## 11.10: کتب برائے مطالعہ

۱۔ 'کلیاتِ اقبال'، مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی
۲۔ 'شرح ارمغانِ حجاز'، از یوسف سلیم چشتی
۳ 'لغات کشوری'
۴۔ 'تلمیحاتِ اقبال'، از عابد علی عابد
۵۔ 'میرے اقبال'، از توقیر احمد خاں

# بلاک 4 : اقبال کی شعری خدمات (غزل)

اکائی 12: بانگ درا (حصہ اول) کی ابتدائی ۵ غزلیں

اکائی 13: بال جبریل (حصہ اول) کی ابتدائی پانچ غزلیں

## بلاک4 کا تعارف

اکائی 12 ''بانگ درا (حصہ اول) کی ابتدائی ۵ غزلیں'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس اکائی میں ''بانگ درا'' کی شامل نصاب غزلوں کی شرح کرتے ہوئے ان کا فنی احاطہ کیا گیا ہے۔جس کے طلبا کو اقبال کی غزلوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اکائی13:''بال جبریل (حصہ اول) کی ابتدائی پانچ غزلیں'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس اکائی میں ''بال جبریل'' کی شامل نصاب غزلوں کی شرح کرتے ہوئے ان کا فنی احاطہ کیا گیا ہے۔جس کے طلبا کو اقبال کی غزلوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

# اکائی 12: 'بانگِ درا' کی ابتدائی پانچ غزلیں

ساخت

12.1: اغراض ومقاصد

12.2: تمہید

12.3: شاعر کا تعارف

12.4: غزل نمبر 1 کا متن

12.5: غزل نمبر 1 کا مطالعہ

12.6: غزل نمبر 2 کا متن

12.7: غزل نمبر 2 کا مطالعہ

12.8: غزل نمبر 3 کا متن

12.9: غزل نمبر 3 کا مطالعہ

12.10: غزل نمبر 4 کا متن

12.11: غزل نمبر 4 کا مطالعہ

12.12: غزل نمبر 5 کا متن

12.13: غزل نمبر 5 کا مطالعہ

12.14: آپ نے کیا سیکھا؟

12.15: اپنا امتحان خود لیجئے

12.16: سوالات کے جوابات

12.17: فرہنگ

12.18: کتب برائے مطالعہ

## 12.1: اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- اُردو غزل کا شوق پیدا کر سکیں گے۔
- داغؔ دہلوی کا رنگِ غزل سمجھ سکیں گے۔
- اقبالؔ کی غزل گوئی سے واقف ہو سکیں گے۔
- اقبالؔ کی ابتدائی شاعری سے متعارف ہو سکیں گے۔
- غزل کی خوبیوں سے آگاہ ہوں گے۔
- غزلیہ عناصر کی تفہیم کر سکیں گے۔
- غزل کے مزاج سے آگاہ ہو سکیں گے۔
- غزل کے سوال اور اس کے جواب سمجھ سکیں گے۔

## 12.2: تمہید

اصنافِ سخن کے اعتبار سے علامہ اقبالؔ کی غزلیں اُردو کے عام شاعروں کی غزلوں کی طرح ہیں۔ان میں ردیف، قافیہ، بحر، وزن وغیرہ کی پابندی برتی گئی ہے۔ جہاں تک مقطع کا تعلق ہے، اقبالؔ کی اکثر غزلوں میں مقطع کا وہ شعر نہیں ہوتا جس میں شاعر کا تخلص آتا ہے۔

## 12.3: شاعر کا تعارف

ڈاکٹر محمد اقبالؔ دنیا میں ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔1898ء میں لاہور کے ایک مشاعرہ میں سب سے پہلے شرکت کا سراغ ملتا ہے۔ابتدا میں انھوں نے اپنی غزلیں داغؔ دہلوی کو ارسال کیں اور انھوں نے اقبالؔ کی غزلوں پر اصلاح بھی دی۔ اس لئے اقبالؔ کی ابتدائی غزلوں میں داغؔ کا رنگ نظر آتا ہے۔اس عہد کی شاعری عام روایتی شاعری کہی جا سکتی ہے لیکن چوں کہ اقبالؔ کالج کے پروردہ اور فلسفہ کے طالب علم تھے۔اس وجہ سے ان ہلکی پھلکی غزلوں میں بھی جہاں تہاں بہت گہرے فلسفیانہ مسائل نظر آتے ہیں اور اس کے علاوہ واعظ سے چھیڑ چھاڑ اور فطرت کے مسائل دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس لئے اقبالؔ کی اس عہد کی خصوصاً 1905ء کی غزلوں کو عام فہم اور ہلکا پھلکا تصور کیا جاتا ہے مگر زبان نہایت شستہ، دلکش اور سینہ پر تیر مارنے والی ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں سیدھے دل میں جا کر لگتی ہے۔ بعد میں 'بالِ جبریل' اور 'ضربِ کلیم' کے زمانے میں اقبالؔ کی غزل ان کی نظموں کے ہم پلہ ہو گئی ہیں اور ان کے اندر بھی وہی نظم کا عارفانہ رنگ فلسفیانہ طور طریقہ موجود ہے۔

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

یہ بات صحیح ہے کہ اقبالؔ کا فکر اور فلسفہ دنیا کے معمولی اور غیر ذہین لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔اقبالؔ کی شاعرانہ گتھیاں سلجھانے کے لئے وسیع المطالعہ عالموں، مفکروں اور دانش وروں کی ضرورت ہے۔ان کے پیغام کو

دنیا کا یہ بالائی طبقہ ہی سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی صحیح ہے کہ اقبالؔ کا فکر وفلسفہ دنیا کے کم علم اور بے بصر لوگوں کے لئے چراغِ ہدایت بھی ہے کہ وہ بھی کلامِ اقبالؔ کو پڑھیں، اپنی فہم سے بالاتر چیزوں کی تلاش وجستجو کریں اور ان کے افکار کو سمجھیں۔ دراصل اقبالؔ غور وفکر اور 'تدبر' کا شاعر ہے۔ وہ خود کائناتِ عالم کی اشیاء پر غور کرتا ہے اور دنیا کے لوگوں کو غور کرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ اپنی آنکھیں کھولو اور مظاہر فطرت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔اس پیغام میں سماج کا پسماندہ طبقہ بھی اقبالؔ کا مخاطب ہے۔ کیوں کہ وہ پسماندگی سے نکل کر اہل بننے کا راستہ دکھاتا ہے جس کی ایک مثال اس شعر میں ملاحظہ کریں:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا

خاص طور پر فکر وتدبر کا مشورہ ملت کے نوجوانوں کو زیادہ دیتا ہے۔ یہ بھی فکر اقبالؔ کی اساس ہے جو اسلام کے عین مطابق ہے۔ اگر چہ یہ موضوع ''مفکر شاعر علامہ اقبالؔ کے تفکیر دینی'' پر مبنی ہے اور یہ موضوع مذہبی اور اسلامی ہونے کی بنا پر علمائے دین اسلام کی دلچسپی کا موضوع ہے۔ دینی اور اسلامی فکر کو علمائے کرام ہی زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھتے ہیں۔اس لئے دین اسلام کے علماء اس روشنی میں اقبالؔ کو سمجھنے اور سمجھانے کا فریضہ بہتر طور پر ادا کر سکتے ہیں۔مگر اقبالؔ کی فکر غیر علمائے دین کے لئے بھی باعثِ کشش ہے۔ وہ اُن کو بھی کچھ سیکھنے، حاصل کرنے اور معلومات میں اضافہ کرنے کی تشویش اور تڑپ پیدا کرتی ہے۔اس لئے تفکیر دینی کے اس عالمانہ موضوع پر کیا راقم الحروف جیسا بے بضاعت انسان بھی کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ اقبالؔ کو پڑھتے رہنے کا ایک بڑا فائدہ یہی ہے کہ وہ مذہب اور سائنس دونوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے اور اس طرح ہمارے لئے نئی معلومات کا دریچہ کھول دیتا ہے:

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

یہ بات قرینِ قیاس ہی نہیں امر بدیہی ہے کہ ہر شخص کا کردار اس کے دائرہ فکر اور رجحانات کے مطابق ہوتا ہے۔ ذاتی دلچسپیاں، ماضی کا مطالعہ اور ذخیرۂ معلومات شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ذہن کی ساخت اور نظریہ سازی میں افراد کے ذاتی تجربات اور ان کا مبلغ علم ہی رہبر ورہنما بنتے ہیں۔فن کار کے تخلیقی عمل میں بھی اس کے فکر ورجحان برابر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔اس بات کو ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک تاریخ داں اپنے خیالات کا اظہار تاریخی شواہد کی روشنی میں کرتا ہے۔ سیاست داں ہر سوال کا جواب سیاسی نقطۂ نظر سے دیتا ہے۔ مذہبی رجحان رکھنے والا شخص ان سوالوں کے جواب مذہبی فکر کی رو سے دیتا ہے۔ ماہر نفسیات، نفسیات کی روشنی میں دیتا ہے۔ سائنس داں سائنسی نقطۂ نظر سے سوچتا ہے اور سمجھتا ہے۔ شاعر وادیب شعر وادب کے پس منظر میں دلائل دیتا ہے اور صحافی صحافت اور ماہر عمرانیات، عمرانی نقطۂ نظر سے فیصلہ کرتا ہے۔

علامہ اقبالؔ کا محبوب مضمون فلسفہ تھا۔انھوں نے زمانۂ طالب علمی سے اواخر عمر تک فلسفہ کا مطالعہ کیا اور اسی میں دلچسپیاں لیں۔فلسفہ کے مطالعہ نے ان کے دل و دماغ میں فلسفیانہ نظر عطا کر دی تھی۔عالمی فلسفہ کے عمیق مطالعہ نے ان میں تقابلی انداز نظر پیدا کر دیا تھا۔اس لئے اقبال کے کلام میں Comparative Study کا انداز پایا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ فلسفہ اشیائے عالم کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے غور وفکر اور فہم وذکا کی تلقین کرتا ہے۔تو فلسفہ کے عالم کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اشیائے عالم کی حقیقت پر غور وفکر کرے اور فکر وتدبر کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرے۔فلسفہ کا عالم اپنے افکار خیالات کی بنیاد جذبات پر رکھتا ہے اور نہ Anotation پر۔یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کے کلام میں چیزوں کو سمجھنے اور اس کے عمل میں حد درجہ تفہیم وتفکر کا عمل پایا جاتا ہے۔وہ کائنات عالم پر نظر ڈالتے ہیں اور پیامِ فکر دیتے ہیں۔اقبالؔ کے پہلے شعری مجموعہ ''بانگِ درا'' کی پہلی نظم 'ہمالہ' ہی کو لیجئے۔جب وہ کوہ ہمالہ پر نظر ڈالتے ہیں تو تاریخ انسانی کی تمام تر تصویریں آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔یہ پہاڑ کب سے ہے؟ اس کی بلندی آسمان کو چھو رہی ہے۔یہ ملک ہندوستان کے لئے حفاظت کی فصیل ہے۔اس نے حضرت آدمؑ اور حواؑ کا زمانہ پایا اور اس عہد کے تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔انسانی سفر کے عروج وزوال کی ساری کہانی اس کو یاد ہے۔موجودہ زمانہ کی زندگی نہایت شاطر اور مکار ہوگئی ہے لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے کی زندگی سیدھی سادی تھی۔شاید آج کے عہد میں پھر سے اسی سیدھی سادی، بے ریا اور بے ضرر زندگی کی ضرورت ہے۔اس لئے شاعر کے دل میں وہی زمانہ وہی سادگی اور وہی معصومیت دیکھنے کی خواہش بیدار ہوتی ہے اور وہ ہمالہ سے کہہ اٹھتا ہے کہ اس پھر سے بے تکلف زندگی کا ماجرا ہمیں سنا دے:

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستان　　مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا　　داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصوّر! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

اسی مجموعہ کی دوسری نظم ''گل رنگین'' ہے،جس کی ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے:

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں　　اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیب محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں　　یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں میں سراپا سوز ساز آرزو
اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

اقبالؔ پھول جیسے بے جان اور بے زبان عنصر سے سوال وجواب کرتے ہیں اور اسے بتاتے ہیں کہ ترے پہلو میں انسان کے سینے کی طرح دھڑکنے والا دل نہیں ہے تو رونقِ محفل تو ہے لیکن شریکِ تگ وتاز نہیں ہے۔تیری

زندگی بے سوز و گداز ہے اور میں سراپا سوز و ساز اور آرزو سے معمور ہوں یعنی انسان درد و غم و بلا کو برداشت کرنے والا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس مجموعہ کی مشہور نظم 'شمع و شاعر' کے بعض نمایاں اور مشہور اشعار ملاحظہ ہوں:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا
شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی — ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی
آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے — زندہ کر دے دل کو سوز جوہرِ گفتار سے
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

بے خبر تو جوہر آئینِ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ایک ایک شعر غور و فکر کی تعلیم دیتا ہے اور دل کو جھنجھوڑ کر تلقین و تفہیم کر رہا ہے۔ اسی طرح شکوہ کے اشعار اور اس سے زیادہ جواب شکوہ کے اشعار اپنی ذات کو سوچنے سمجھنے اور شرمناک کرنے والے ہیں۔ شکوہ کا ایک بند ملاحظہ کریں:

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی، تورانی بھی — اہل چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی — اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

سلجوق، تورانی، ساسانی، یونانی، یہودی اور نصرانی کے بارے میں تاریخ میں غوطہ زنی کے بغیر آگاہی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لئے وسیع مطالعہ اور بہ غور ورق گردانی کی ضرورت ہے:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدمؑ کی یہ وہ گل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

'بانگِ درا' کی مشہور و معروف نظم 'خضر راہ' کے مقبول ترین اشعار ملاحظہ کریں:

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے — کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی — ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو — پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے　　پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

ہر شعر غور وفکر کی تلقین کر رہا ہے اور پڑھنے والے کو فکر عمیق میں غرق کرنے والا ہے۔ شاید اسی سے متاثر ہو کر آل احمد سرور نے کہا تھا کہ اقبالؔ کی شاعری پر رومانویت کی تحریک کا اثر ہے۔ اقبالؔ کی زندگی میں انہیں مفکر ملت اور حکیم الامت جیسے خطابات یوں ہی مفت میں نہیں مل گئے تھے۔ اس کے پس پشت اقبالؔ کا فلسفہ تدبر اور فکر ہی کارفرما تھے جن کو ایک لمبے عرصے تک پرکھنے کے بعد قوم نے یہ خطاب عطا کیے تھے۔ 'بالِ جبریل' تو فکر وشعر کا نادر مجموعہ ہے۔ اس کے ایک ایک شعر میں تفکر وتدبر بھرا ہوا ہے۔ جب پہلی ہی غزل پڑھتے ہیں تو دل ودماغ فکر و خیال کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا　　میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

بت کدۂ صفات کے غلغلہ اور سینۂ کائنات کے راز کو سمجھنے کے لئے جس دماغی محنت وکاوش کی ضرورت ہے، وہ مفکر اور فلسفی ہی زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اب سوچتے رہئے غور کرتے رہئے کہ وہ راز کیا تھا! پوری کتاب میں باتیں سمجھی اور سمجھائی جا رہی ہیں اور غور وفکر پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے　　جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے　　کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے
جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی　　کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ　　ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اس مجموعہ کی تمام نظمیں خصوصاً 'مسجد قرطبہ'، 'لینن خدا کے حضور میں'، 'ذوق وشوق' اور 'ساقی نامہ' سراپا تدبر کی متقاضی ہیں اور پیر ومرید تو ایک ایسی نظم ہے جس میں انسانی زندگی کے مشکل مراحل اور مشکل سے مشکل نکات کو سوال وجواب کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرید سوال کرتا ہے:

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں　　علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیر رومی جواب دیتے ہیں:

علم را برتن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود

(علم کو تن کی خاطر استعمال کروگے تو سانپ بن جائے گا اور علم کو دل یعنی روح کی خاطر استعمال کروگے تو یار بن جائے گا۔)

مرید سوال کرتا ہے:

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب　　روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیر جواب دیتے ہیں:

دست ہر نااہل بیمارت کند　　سوئے مادر آکہ تیمارت کند

(ہر نااہل کا ہاتھ تجھ کو بیمار کرتا ہے۔تو اپنی ماں کی طرف آ کہ تیری تیمارداری کرے۔)

اس طرح کے سوال و جواب کی لمبی فہرست ہے جو مسائل حیات و کائنات کی تفہیم میں معاونت کرتے ہیں۔ یہ وہ مجموعہ کلام ہے جس میں سوز و ساز، درد اور داغ جیسے الفاظ بار بار استعمال ہوتے ہیں۔خود شاعر اپنے بارے میں کہتا ہے:

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں　　کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

سوز و ساز رومؔی اور پیچ و تاب رازؔی، فقہ اسلامی، تصوف اسلامی اور عجمی شاعری کے مطالعہ کے بغیر کیسے سمجھ میں آئیں گے!

اقبالؔ کو پڑھتے وقت کم علمی، نافہمی اور نابلدی کا احساس مضطرب و بے قرار رکھتا ہے۔مقصد یہ ہے کہ اقبالؔ کی شاعری اور اقبالؔ کا کلام جھنجھوڑتا ضرور ہے مگر اندھے جوش اور ولولہ کا پیغامبر نہیں ہے۔وہ دنیا کی چیزوں کو زندگی اور اس کے مسائل پر غور و خوض کرنے کی طرف مائل کرتا ہے اور گہری سوچ میں غرق کرنے والا ہے۔یعنی اقبالؔ جذبات اور Annotation کی بجائے فکر و فہم سے کام لیتے ہیں، وہ صحیح معنوں میں غور و تدبر کے شاعر ہیں۔اپنی ایک نظم 'روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے' میں کہتے ہیں:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ　　مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اس جلوہ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ　　ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں　　یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ، یہ صحرا، سمندر، یہ ہوائیں　　تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے　　دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے　　پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہ و رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیری شرر میں　　آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں　　جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

ہر ایک چیز اور ہر ایک لفظ غور وفکر کی خبر دے رہا ہے۔اس نظم کی طرح اقبالؔ کی پوری شاعری فکر وتدبر کی شاعری ہے۔دنیا میں سیاسی اور جغرافیائی انقلابات برپا ہوتے رہتے ہیں۔اقبالؔ چشم بینا و باطن سے ان تغیرات کے مطالعہ کا درس دیتے ہیں اور رونما ہونے والی ان تبدیلیوں پر غور وخوض کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔وہ انقلابِ عالم کے اسرار کو بھانپتے اور جانچنے کی تلقین کرتے ہیں اور ان انقلاباتِ زمانہ کو قرآن کے نقطۂ نظر سے سمجھنے کی راہ ہموار بھی کرتے ہیں۔وہ زمانہ کی رو کا مطالعہ قرآن میں غوطہ زن ہو کر کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔قرآن میں غوطہ زن ہونے کا مطلب نہایت عالمانہ اور مدبرانہ نظر پیدا کرتا ہے۔یعنی قرآنی نکات اور رموز کو سمجھے اور ان پر غور وفکر کرے۔یہ کام اتھاہ سمندر میں ڈوبنے اور غرق ہونے کے بعد بیش قیمت گوہر ہاتھ میں لانے کے مترادف ہے۔ اقبالؔ اپنی نظم 'اشتراکیت' میں کہتے ہیں:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم　　بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور　　فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بے زار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر　　کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدّت کردار
جو حرف 'قول العفو' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

نہ صرف اسلامی اور مذہبی علوم میں شناوری کا درس دیا گیا ہے بلکہ وہ عہد حاضر کی فتوحات سائنس اور ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے کی بھی حمایت کرتے ہیں۔

کھلے ہیں سب کے لئے غریبوں کے میخانے　　علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اسی طرح اس شعر میں:

حقیقت ایک ہے ہر شئے کی خاکی ہو کہ نوری ہو　　لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

اس شعر میں ایک سائنسی اصول نظام شمسی کو اجاگر کیا گیا ہے۔جدید سائنس سے اب یہ ثابت ہو گیا ہے

کہ کائنات عالم میں Electron اور Proton، Nutron کے چاروں طرف چکر کاٹتے رہتے ہیں اور یہی نظام ذرّہ سے لے کر پوری دنیا میں جاری وساری ہے۔ زمین، چاند اور ستارے، سورج کے چاروں طرف چکر گاتے رہتے ہیں اور اسی میں ان کی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔ زندگی کا راز بھی اسی گردا گردی میں پنہاں ہے۔ جو اِس اصول کو جانتے ہیں، وہ آسانی سے مذکورہ شعر کی تفہیم کر سکیں گے اور جو نہیں جانتے، ان کو اس اصول وقانون کو سمجھنے کے لئے غور وفکر کرنا ہوگا۔ ذرّہ یعنی Atom کے ٹوٹنے سے زبردست توانائی (Energy) پیدا ہوتی ہے، وہی ایٹم بم (Atom Bomb) کہلاتا ہے۔ اقبالؔ نے اس کو خورشید کے لہو یعنی بے پناہ سورج کی تپش جیسی توانائی سے تعبیر کیا ہے۔

مدنیت اسلام کے بارے میں کہتے ہیں:

طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب　　یگانہ اور مثال زمانہ گونا گوں
نہ اس میں عصر رواں کی حیات بے زاری　　نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی　　یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال
عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں

طلوع وغروب، عصر رواں، عہد کہن، حقائق ابدی، طلسم افلاطون اور پھر ان سے زیادہ روح القدس کا ذوق جمال، عجم کا حسن طبیعت اور عرب کا سوز دروں بغیر غور وفکر کے سمجھ میں نہیں آسکتے۔ ان کو سمجھنے کے لئے حد درجہ تفہیم وتدبر کی ضرورت ہے۔ اقبالؔ کا ہر شعر سوچنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ شعر سن کر چونک جانا یا انگشت بدنداں رہ جانا اقبالؔ کے کلام کا عام تاثر ہے۔ اقبالؔ کا یہ شعر سنے اور حیرت زدہ نہ رہ جائے تو تعجب کی بات ہوگی:

ہر اِک مقام سے آگے مقام ہے تیرا　　حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

دراصل اقبالؔ کی شاعری علوم عالم کا مجموعہ ہے۔ ''علم ملل والنحل'' اقبالؔ کی دلچسپی کا خاص مضمون رہا ہے۔ انہوں نے مذاہب عالم کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اس کے نتیجہ میں باہمی علوم وفنون کو جانچنے، پرکھنے اور بین المذاہب موازنہ کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ ویدانتی مذہب، بودھ، پارسی، عیسائی اور یہودی وغیرہ مذاہب کے ساتھ اقبالؔ نے اسلام کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اقبالؔ اپنی شاعری میں اسلام کا تذکرہ کیوں کرتے ہیں؟ ان کی شاعری میں جو کچھ وزن ووقار ہے، وہ اسلامی فکر کی وجہ سے ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ مطالعہ اقبالؔ کی یہ بھی ایک جہت ہوسکتی ہے کہ اور ہے۔ حقیقت میں شاعری مذہبی فکر اور فلسفہ کے جلو میں بالکل اسی طرح پرورش پاتی ہے جس طرح علم ودانش جمالیات کے اثر میں فروغ پاتی ہے۔ دنیا کی شاعری میں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں مذہبی فکر نے شاعری کو بلندی عطا کی ہے۔ دنیا کے زیادہ شاعر مذہبی فکر اور مذہبی

خیالات کا استعمال کر کے عروج پر پہنچے ہیں۔ دنیا کے بڑے شاعر Dante ہوں یا Tennyson، شیکسپیئر، کالی دس، بھرتری ہری یا میر و مرزا سب مذہبی فکر و خیال کے ذریعہ آگے بڑھے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں کہ مذہب کا سہارا لئے بغیر دنیا کا کوئی شاعر بڑا شاعر نہیں بن سکا۔ تاہم بالفرض محال اگر اقبالؔ کی شاعری سے اسلامی خیالات یا مذہبی فکر کو نکال بھی دیا جائے تو اقبالؔ کی شاعری میں کیا باقی رہتا ہے؟ اور کیا نہیں رہتا!! اس کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اقبالؔ ایک ایسا شاعر ہے، جس کی شاعری سے اسلامی فکر کو نکال دینے کے بعد اتنا کچھ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ پھر بھی نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کے ہر زبان کے شاعر سے اس کی حیثیت بالاتر رہے گی۔

اقبالؔ تو بحر العلوم قسم کے شاعر ہیں۔ دنیا کے معروف علوم پر اقبالؔ کو دسترس و عبور حاصل ہے۔ اگر اقبالؔ کے کلام سے اسلام کو نکال دیں تو بھی اقبالؔ کے کلام میں اتنی جان باقی رہ جاتی ہے کہ وہ دنیا کے بڑے شعراء کی صف میں شامل رہیں۔

اقبالؔ کا جو نظریۂ فن ہے وہ اردو کے کسی شاعر نے نہیں پیش کیا اور اتنی عمیق گہری مفکرانہ باتیں شاید ہی کسی نے کہی ہوں گی۔ علوم و فنون کے حصول میں عرق ریزی اور بے پناہ جگر کاوی کی ضرورت ہے۔ سخت ترین محنت و مشقت سے ہی فنکاری میں نکھار آتا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ حرکت و عمل اور کامیابی کا جو پیغام دیا ہے، وہ اقبالؔ کو زندہ رہنے اور شاعری کی دنیا میں ممتاز رکھنے کے لئے کافی ہے۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن　　ملا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

اپنی شاعری کے ذریعہ قوت کا جو فلسفہ اقبالؔ نے دیا، اس کی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ اقبالؔ کا کہنا کہ جو طاقتور ہے وہی غالب ہے اور کمزوری ناکامی اور موت کی نشانی ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے　　ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اقبالؔ نے حریت و آزادی کا تصوّر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ انسان کی ہمہ جہت نشو و نما کے لئے آزادی بے حد ضروری ہے۔ سیاسی، سماجی، عملی، ذہنی غرض ہر قسم کی آزادی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان خاطر خواہ ترقی اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ غلامی اس کی صلاحیتوں کو سلب کر دیتی ہے اور غلامی میں اس کی تمام خواہشات دب کر رہ جاتی ہیں:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب　　اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت　　فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

اقبالؔ نے تصوّرانقلاب دیا کہ دنیا کی ہر شئے فانی ہےاور ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں ہے۔تبدیلی ہی ایک ایسی صفت ہے جو باقی رہنے والی ہے۔اس لئے انسان بھی اپنی زندگی میں انقلاب یا قیامت برپا کرے اوراسی معمول پر کاربندر ہے جوایک اٹل قانون ہے۔اس تصوّر سے انسانوں کے اندر ہرقسم کی تبدیلی کا پیغام دیا گیا ہے۔ انھیں اپنی موجودہ حالت بدل کر بہتر حالت بنانے کی تلقین ملتی ہے۔تبدیلی نہیں آتی تومُردوں میں نہیں آتی۔ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اس کے ساتھ زندگی کا ترقی کناں تصوّر ملتا ہے یعنی زندگی ہمیشہ آگے کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔وہ ایک ندی کی مانند ہے جوآگے کی طرف بڑھتی ہی رہتی ہے۔کبھی بھی کسی شئے سے ٹکرا کر رک نہیں جاتی ہے۔

سچائی پر قائم رہنا،نامساعد حالات کا مقابلہ کرنا،مزاحمت اختیار کرنا،جدوجہد کرنااورصبر واستقامت کے ساتھ Struggle کرنا،جدت اورتبدیلی زندگی کی نشانی ہے،وقت کا تقاضہ ہے۔

جس میں نہ ہوانقلاب موت ہے وہ زندگی روح امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا کہ دن اور رات بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

تصوّرانقلاب اقبالؔ کا سب سے طاقت ورفلسفہ ہے۔وہ تبدیلی اورانقلاب کا استقبال کرتے ہیں اوراسی کو دائم وقائم مانتے ہیں۔تجدیدکاری اور جدّت افکار ہی زندگی کو طاقت اورقوت عطا کرتے ہیں۔فرسودہ طریقے اورپیشِ پا افتادہ روایات زندگی کو بےعمل اورکمزور بنانے والی ہیں۔تازگی باسی پن سے نجات کا سبب ہے۔تازہ خیالی اورتازگی فکر سے ذوق انقلاب پیدا ہوتا ہے:

جدّتِ فکر وعمل کیا ہے ذوقِ انقلاب جدّتِ فکر وعمل کیا شئے ہے ملت کا شباب

تحرک اورتبدیلی خوش آئند خبر ہے، وہ خواہ کسی قسم کی ہو۔ترکی کی اسلامی فوجیں ختم ہوئیں، روسی افواج قابض ہوگئیں۔یہ ایک طرح سے اسلام پر اشتراکیت کی جیت نظر آرہی تھی مگر اقبالؔ کو اس میں بھی زندگی کی رمق اور جینے کی تڑپ نظر آئی تو کھلے دل سے اس کا خیر مقدم کیا اوراس کی داد دی۔ورنہ اسلامی فکراوراسلامی ذہن کے شخص کو اس فتح پر شاباشی دینے کی کیا پڑی تھی۔یہاں اصل توجہ فرسودہ طریقوں سے بےزاری پر ہے،زندگی جدّت اور نیاپن چاہتی ہے،اسی کا یہ ثمرہ ہے۔

اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ یقین کی تعلیم دی ہے کہ انسان اپنے دل میں یقین کامل پیدا کرے اور پھراس کے بعد قدم اٹھائے کیوں کہ بےیقینی عمل کی لے کو کمزور کرتی ہے۔اس لئے جو کام کیا جائے پوری طاقت

اور پورے یقین کے ساتھ کیا جائے:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں　　جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے　　یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبالؔ نے غریبوں، بے کسوں، ناداروں اور مزدوروں اور کسانوں کی حمایت کی۔ سرمایہ پرستی اور آمریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
دہ خدایا یہ زمین تیری نہیں　　تیرے آباد کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

یہ اور اس قسم کے متعدد خیالات جن میں فلسفۂ خودی سرفہرست ہے، اقبالؔ ہی نے دیے ہیں۔ تصوّرِ زمان و مکاں، تصوّرِ وطن، تصوّرِ علم و فن، تصوّرِ عشق و خرد، تصوّرِ خوب و زشت، جدّتِ فکر، تجدیدِ عمل اور اجتہاد وغیرہ وہ تصوّرات ہیں جو اردو شاعری میں صرف اور صرف اقبالؔ ہی نے پیش کیے ہیں۔

جہاں تک ان کے اسلام یا مسلمان ہونے کا تعلق ہے تو اقبالؔ بعض اوقات مسلمانوں کے جذبات کو Hurt بھی کرتا ہے۔ انھیں زک پہنچاتا ہے:

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے　　بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم　　بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں

تری دعا ہے کہ ہو میری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

لیکن اس کے باوجود اقبالؔ صرف مسلمانوں کا محبوب شاعر نہیں ہے۔ حقیقت میں وہ ہر مظلوم کے ساتھ ہیں اور انسانی برادری اور عالمی انسانیت یعنی بنی نوع انسان کے پیغامبر ہیں۔ ہر ستم زدہ دل کی ترجمانی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے:

من اوّل آدم بے رنگ و بویم　　ازاں پس ہندیم تورانیم من

علم و دانش، فکر و فلسفہ اور ادب کی سطح پر اقبالؔ کا کوئی ثانی نہیں ہے اور اکابرین نے ایک ایک گوشہ پر نظر ڈالتے ہوئے اتنا زیادہ کام کر دیا ہے کہ عمر بھر پڑھنے، سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کافی ہے۔ اس سلسلہ میں خلیفہ

عبدالحکیم کی کتاب 'فکرِ اقبالؔ'، عابد علی عابدؔ کی 'شعرِ اقبالؔ' اور 'تلمیحاتِ اقبالؔ'، عزیز احمد کی 'اقبالؔ نئی تشکیل'، یوسف سلیم چشتی کی 'شروحات'، یوسف حسین خاں کی کتاب 'روحِ اقبال'، اسلوب احمد انصاری کی کتاب 'اقبالؔ جدید تنقیدی تناظرات'، عبدالمغنی کی کتاب 'اقبال اور عالمی ادب'، فرمان فتح پوری کی کتاب 'اقبالؔ سب کے لئے'، اینی میری شمل کی کتاب 'Gabriel's Wing' ایسی کتابیں ہیں جو شعرِ اقبالؔ کے فکری گوشہ پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔

## 12.4: غزل نمبر 1 کا متن

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ — ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ — دم دے نہ جائے ہستیِ نا پائیدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں — تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہ گزر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

## 12.5: غزل نمبر 1 کا مطالعہ

یہ 'بانگِ درا' کی سب سے پہلی غزل ہے جو اقبالؔ کے 1905ء تک کے کلام میں شامل کی گئی ہے۔ اس غزل کے اشعار میں کائنات اور زندگی کے مسائل بیان کیے گئے ہیں اور اس پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح اقبالؔ کی ابتدائی سادہ اور دلکش شاعری بھی زندگی، دنیا اور کائنات کے راز کھولنے والی شاعری ہے۔ اس میں عام عاشقانہ اور شاعرانہ رنگ نہیں ہے، بلکہ اگر عشق ہے بھی عشقِ حقیقی کی جھلک دکھاتا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ اے انسان تو اس دنیا کو غیروں کی طرح مت دیکھ بلکہ اسے بار بار دیکھ۔ یہ ایسی دیکھنے کی چیز ہے جس پر بار بار غور و خوض کیا جائے۔ اور اے انسان یہ بھی سمجھ لے کہ تو اس جہان میں چند دنوں کے لئے ہی آیا ہے جیسے چنگاری اور شرارہ چمکتا ہے اور بجھ جاتا ہے۔ لہٰذا تو بھی بہت کم عرصہ کے لئے یہاں آیا ہے۔ اپنے کاموں میں جلدی سے لگ جا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ زندگی یہ ہستی دم دے جائے ختم ہو جائے۔ اگلا شعر غالباً خدا سے خطاب ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ میں تیرے دیدار کے قابل نہیں ہوں لیکن اس کے باوجود تو میرا شوق اور انتظار دیکھ کہ کس بے قراری سے تیرا منتظر بیٹھا ہوں۔ یہ حضرت انسان سے مخاطب بھی ہو سکتا ہے۔ شعر کے لئے یہ بہت بڑا کمال ہے اس کے دو یا دو سے زائد معنی ہوں۔

یہ وہی شعر ہے جو ہندستان کی پارلیمانٹ میں جب ایم. پی. سشما سوراج نے ایک شعر پڑھ کر اس

وقت کے وزیر اعظم من موہن سنگھ کو خطاب کیا تو جواب میں من موہن سنگھ نے یہی شعر پڑھ کر سنایا۔

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں　　تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ

آخری شعر میں پھر حضرت انسان سے خطاب کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر دیکھنے کے شوق نے تیری آنکھوں میں روشنی پیدا کی ہے تو ہر راستے میں اپنے محبوب کے پیروں کے نشان دیکھ اور یہ ذوق دیدار کی انتہا ہے کہ اس کو ہر جگہ اپنا محبوب، اپنا یار حقیقی یا مجازی ہی نظر آئے۔

## 12.6: غزل نمبر 2 کا متن

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی　　مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا　　خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا　　تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

تامّل تو تھا ان کو آنے میں قاصد　　مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰؑ　　کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی

کہیں ذکر رہتا ہے اقبالؔ تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

## 12.7: غزل نمبر 2 کا مطالعہ

یہ غزل بھی متصوفانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ باتیں اس دنیا اور عام لوگوں کی لگتی ہیں لیکن غور کرو تو دوسرے معانی عشقِ حقیقی کے بھی برآمد ہوتے ہیں اور یہی زیادہ اہم اور کارگر ہیں۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ آپ کو اگر نہیں آنا تھا تو نہ آتے۔ اس میں بحث و تکرار کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن یہ تو بتاؤ آنے کا وعدہ تو کر ہی سکتے تھے۔ وعدہ کرنے میں کیا شرم اور کیا مجبوری تھی۔ دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ آپ نے جس قاصد کو بھیجا اس نے سارے راز بتا دیے تو اس میں ہماری خطا اور ہماری غلطی کیا ہوئی۔ آپ خواہ مخواہ ہم سے برہم ہیں۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خدائے عزّہ و جل کے تمام راز ان کے پیامی ان کے رسول نے کھول دیے اور ساری باتیں عالم بالا کی انسانوں کو بتا دیں تو اے خدا اس میں ہماری کیا خطا ہے۔ اگلے شعر میں کہتے ہیں کہ تیری آنکھ مستی کے عالم میں بھی ہوشیار تھی کہ بھری پُری محفل میں اپنے عاشق کو پہچان لیا۔ اگلے شعر میں اقبالؔ قاصد سے پوچھتے ہیں کہ ان کو یہاں آنے میں تامّل تو تھا لیکن یہ بتا کہ انکار کرنے کا انداز کیا تھا۔ کیا انکار کے لہجے میں بھی اقرار کا عنصر پوشیدہ تھا۔

اگلے شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ کوہِ طور پر تجلیِ خداوندی کی طرف موسیٰ علیہ السلام خود بخود کھنچے چلے گئے۔شوقِ دیدار ہوتو ایسا ہو۔آخری شعر مقطع کا ہے۔اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے اقبالؔ تیری باتوں میں بھی جادو ہے۔ جہاں کہیں تو گفتگو کرتا ہے وہاں کی باتوں کا تذکرہ ہر کہیں سننے کو ملتا ہے۔

## 12.8: غزل نمبر3 کا متن

عجب واعظ کی دیں داری ہے یا رب! عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں کہاں جاتا ہے؟ آتا ہے کہاں سے؟
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے! چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے
ہم اپنی درد مندی کا فسانہ! سنا کرتے ہیں اپنے راز داں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

## 12.9: غزل نمبر3 کا مطالعہ

یہ غزل بھی نیم فلسفیانہ اور نیم متصوفانہ ہے جس میں واعظ سے بھی مذاق کیا گی ہے۔ وہ اس پر سوال اٹھاتے ہیں کہ حضرت واعظ دین کی تبلیغ کرتے ہیں۔ان کا کام دین پھیلانا ہے مگر وہ دین پھیلانے کے وقت لوگوں کے دلوں میں نفرت کی باتیں بھی بھرتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ انھیں ساری دنیا سے دشمنی ہے۔سب سے عداوت اور بدچلنی کی باتیں کرتے ہیں۔دوسرا شعر مطلقاً فلسفیانہ ہے اور اس سوال کو اٹھایا گیا کہ آج تک اس راز کو کوئی حاصل نہ کر سکا کہ حضرت انسان کہاں سے آتے اور پھر کہاں چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب معمہ اور سوال ہے اور اہل خرد کو پریشان کرنے والا ہے۔تیسرا شعر کا معمولی مفہوم یہ ہے کہ تارے چمکتے ہیں اور وہ روشن بھی ہیں مگر اس روشنی میں رات کی اندھیری بھی ہے۔ جہاں سے تاروں کو چمک ملی ہے، وہیں سے رات کو تاریکی بھی ملی ہے یعنی رات اور تاروں کو بنانے والا بڑے کمال کا حامل ہے۔اگلے شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ ہمارے دکھ درد کا فسانہ ہمارے رازدانوں کی زبان پر ہے۔ہمیں تو اپنے دکھوں کا احساس نہیں لیکن ہمارے رازدار ہمیں ہماری کلفتوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔آخری شعر مقطع کا ہے جس میں شاعر کا تخلص نہیں ہے۔اس شعر میں کہتے ہیں کہ جب ازان ہوتی ہے تو واعظ کا دل کانپ جاتا ہے۔ وہ اذان سن کر لرز اٹھتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اذان پر لبیک کہے اور خدا کے حضور میں حاضری کے لئے چل پڑے یہ سب دکھاوٹی اور بناوٹی باتیں کرتا ہے۔

## 12.10: غزل نمبر 4 کا متن

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کو جلانے کے لئے

وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لئے

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و دو ملّت سے تری!
ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لئے

دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں
لوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کے لئے

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تُو
آہ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے

پاس تھا ناکامیِ صیاد کا اے ہم صفیر
ورنہ میں اور اُڑ کے آتا ایک دانے کے لئے

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے

## 12.11: غزل نمبر 4 کا مطالعہ

اس غزل میں اُردو شاعری کی خیال آفرینی کے بڑے چونکانے والے نمونے ملتے ہیں۔ یہ پوری غزل شاعرانہ کمالات، متصوفانہ عرفانات اور حبّ الوطنی کے خیالات سے پُر ہے۔ پہلے شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں اپنا آشیانہ، اپنا نشیمن ان تنکوں سے بنانا چاہتا ہوں جن کو جلانے کے لئے بجلیاں تاک میں بیٹھی ہوں کہ میں گھونسلہ بناؤں اور بجلی ٹوٹ کر گرے اور راکھ کر دے۔ دوسرا شعر اس سے پہلے شعر کا بالکل برعکس مفہوم رکھتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ افسوس اور ناکامی کی بات یہ ہے کہ آسمانِ ستم شعار نے اس شاخ کو تاک کر توڑ ڈالا جس کو میں نے اپنے آشیانے کے لئے منتخب کیا تھا۔ اگلے شعر میں پھر واعظ سے چھیڑ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس قوم میں 72 فرقے ہیں اور سب سے تیری آنکھ مل جاتی ہے۔ تیرے پاس تو ایک ہی جام ہے تو اس سے سارے زمانے کو سیراب کرنا چاہتا ہے۔ اگر سب کو نفع پہنچانا چاہتا ہے تو اے واعظ نفع رسانی کے اور بھی بہت سے ذریعے پیدا کر۔ اگلے شعر میں پھر غزل کے اولین شعر کے مفہوم سے ٹکرا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کل دل کے اندر کوئی ایسی آرزو کوئی ایسی تمنا کوئی ایسی امید پیدا کروں کہ آسمان مجھے مٹانے کے لئے تڑپ اٹھے۔ یعنی انسان اپنے اندر ایسی صفات پیدا کرے جو مصائب کا ذریعہ تو ہوں لیکن اس مصائب و آلام میں اسے لطف حاصل ہوا کرے۔ پھر اپنے دل میں کہتے ہیں کہ اے اقبالؔ دانہ دانہ چن کے تو اناج کا انبار تو لگا دیکھ تو سہی کوئی نہ کوئی بجلی اس کو جلانے کے لئے ضرور آ نکلے گی۔ اس غزل میں انسان کو حوصلہ، ہمت والا اور خطر پسند بننے کی تلقین کی گئی ہے اور اسے اپنے عمل کرنے کی ترغیب دی گئی

ہے۔یہی خیال آگے چل کر اقبالؔ کا فلسفۂ خودی بنا ہے جس نے ساری دنیا میں دھوم مچادی۔اس شعر سے اگلے شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں تو صیاد کی ناکامی کا تصور کر کے حال میں آپھنسا ہوں ورنہ ایک دانے کے لئے میں اتنی دور سے اُڑ کر آتا۔مقصد یہ ہے کہ دوسروں کی بھلائی کی خاطر اپنا نقصان بھی گوارا کرو۔آخری شعر اقبالؔ کا ان کی حبّ الوطنی کا شعر ہے، جس میں کہتے ہیں کہ اس چمن میں آزادی کے گیت گانا مناسب نہیں کیوں کہ یہ چمن ایسا ہے، یہاں کے لوگ ایسے ہیں کہ آزادیِ وطن کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔یہی وہ تصور وطن ہے جو اقبالؔ کے تصورات میں ''تصورِ آزادی'' کے نام سے بہت اہم تصور مانا گیا۔

## 12.12: غزل نمبر 5 کا متن

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیوں کر ہوا؟ اور اسیرِ حلقۂ دامِ ہوا کیوں کر ہوا؟

جائے حیرت ہے، بُرا سارے زمانے کا ہوں میں مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیوں کر ہوا؟

کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر کیا خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلہ کیوں کر ہوا؟

ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی اِک مدعا مُرغِ دل دامِ تمنا سے رہا کیوں کر ہوا؟

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیوں کر ہوا؟

حسنِ کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خودنما کیوں کر ہوا؟

موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے دردِ فراق چارہ گر دیوانہ ہے، میں لا دوا کیوں کر ہوا؟

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیوں کر ہوا؟

پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ، کیا ہوا؟ کیوں کر ہوا؟

میرے مٹنے کا تماشہ دیکھنے کی چیز تھی!

کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیوں کر ہوا؟

## 12.13: غزل نمبر 5 کا مطالعہ

یہ غزل گزشتہ چاروں غزلوں میں سب سے مختلف خیالات پر مبنی ہے۔ہر شعر الگ ہی خیال کا حامل ہے اور پچھلی غزلوں کے مقابل زیادہ سنجیدہ افکار کی حامل ہے۔پوری غزل میں تصوف کا رنگ حاوی ہے۔انسان اس کی پیدائش اور اس کے ساتھ لپٹے ہوئے آلام نظر آتے ہیں۔پہلا ہی شعر سرشت آدم اور ہبوطِ آدم کا نقشہ کھینچ رہا ہے کہ میں اپنے چمن، اپنے اصل گھر سے کیوں کر جدا ہوا اور یہاں حرص و ہوس کی دنیا میں آ کر پھنس گیا۔یعنی

حضرت انسان کو اپنے اصلی وطن جنت کے چھٹنے کا غم ہے اور دنیا میں آ جانے کا افسوس ہے۔ دوسرے شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت انسان کو اشرف المخلوقات کا شرف حاصل ہے، وہ مسجود ملائک ہے لیکن اس کے باوجود اس کو سارے زمانے میں سب سے زیادہ برا بھلا کہا جاتا ہے۔ اگلے شعر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تلمیح ہے اور کہا گیا ہے کہ طور پر جانے اور تجلی کی طرف کھنچنے کا معاملہ کچھ یوں ہی بے وجہ نہیں تھا بلکہ وہاں تو معاملہ کچھ دیکھنے دکھانے کا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام تجلی خداوندی کو دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے اور تقاضہ کرتے تھے۔ اللہ ربّ العزت کہتے تھے ''لن ترانی'' تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا تو بہانہ یہ بنا کہ موسیٰؑ تجلی خداوندی کی طرف چلے بھی گئے اور اللہ ربّ العزت نے حضرت موسیٰؑ کے وعدے کو پورا کرنے والا پایا۔ اگلے شعر میں کہتے ہیں بے مقصد ہونے کا بھی مقصد ہے ورنہ دل تمناؤں کے جال سے رہا کیوں ہوتا۔ اگلے شعر میں اقبالؔ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ جنت میں اپنا دیدار کرائیں گے تو اس کے لئے اتنے لمبے انتظار کی ضرورت کیا تھی۔ اے مولائے کریم دیکھنے والے تو تجھے اس دنیا میں بھی اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔ دوسرا شعر اس شعر کے مفہوم سے میل کھاتا ہوا ہے کہ خدائے تعالیٰ بے انتہا پردوں میں چھپا ہوا ہے اور حسین کامل ہے۔ کہیں اس کے حسن کا کمال ہی اس کی بے پردگی کا سبب تو نہیں بنا کہ وہ پردوں میں رہ کر بھی خود نما ہو گیا ہے یعنی دنیا کی ہر شئے میں اپنی نشانیاں ظاہر کر رہا ہے۔ دنیا کی جس چیز کو دیکھو، چاند، تارے، سورج، آسمان، زمین، پہاڑ، پیڑ پودے، پھل پھول، انسان جانور، چرند پرند سب کے اندر خدا کی شان نظر آتی ہے۔ اس طرح وہ پردوں میں بیٹھ کر بھی دنیا کو نظر آتا ہے۔ اگلا شعر خالصتاً شاعرانہ خیال پر مبنی ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ چارہ گر نے مجھے لاعلاج قرار دے دیا ہے یعنی میرا ڈاکٹر، میرا حکیم، میرا معالج دیوانہ ہے، پاگل ہے کہ اس نے مجھے لادوا بتا دیا۔ ابھی تو موت کا نسخہ اور موت کی دوا باقی ہے۔ اگلے شعر میں اقبالؔ بڑے نکتہ اور دانائی کی بات کرتے ہیں۔ وہ دیدۂ عبرت یعنی دنیا کو دیکھنے سمجھنے والی آنکھ سے پوچھ رہے ہیں کہ کبھی تو نے سوچا اور دیکھا کہ پھول مٹی سے پیدا ہو کر بھی رنگین قبا کیوں ہوتے ہیں۔ یہ اہل خرد سے سوال کیا گیا ہے جو ایک منطقی فلسفیانہ سوال ہے۔ اگلے شعر میں اقبالؔ روزِ محشر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہاں میرے اعمال کی ایک ایک بات کو پوچھنے اور عام کرنے کی وجہ مجھ کو سب کے سامنے شرمندہ کرنا تھا ورنہ تو میری زندگی کا ہر لمحہ ہر لحظہ ان کے سامنے ہے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا، سب کچھ انھیں معلوم تھا۔ آخری شعر میں اقبالؔ شاعرانہ تخیل کی پرواز کے جوہر دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے مٹنے کا تماشہ بھی عجیب وغریب تھا اور دنیا اسے دیدۂ عبرت کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ میں کچھ بتا نہیں سکتا کہ میرا اور ان کا سامنا کیسے ہوا اور بس یہی آمنا سامنا میرے مٹ جانے کا سبب بنا۔

## 12.14: آپ نے کیا سیکھا؟

یہ پانچ غزلیں علامہ اقبالؔ کے ابتدائی کلام کا حصہ ہیں۔ان کی زبان، دروبست، غزل کے تقاضوں پر پورے اترتے ہیں۔ان میں وزن، بحر، قافیہ، ردیف اور بعض جگہ تخلص بھی موجود ہے۔غزل کی رنگارنگی کے مطابق ہر شعر الگ مفہوم کا حامل ہے۔لیکن ان غزلوں میں خدا، انسان، کائنات کو موضوع بنایا گیا ہے۔تصوف، تخلیقِ آدم، نبوت، ہمدردی، قربانی اور معاشرہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔یعنی پوری غزلوں میں جداگانہ افکار بیان کیے گئے ہیں جو اُس وقت کی غزل گوئی کے رواج سے الگ ہیں۔بعض خیالات تو ایسے ہیں جو حرکت وعمل سے فلسفہ خودی بنے اور جو حبّ الوطنی سے آزادی ملک وملّت کے عظیم خیالات بن کر ابھرے جنھوں نے ایشیاء کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔اس طرح ہم اس ابتدائی شاعر سے متعارف ہوتے ہیں جو آگے چل کر دنیا کا سب سے بڑا شاعر بنا۔جس کی شہرت ایشیاء اور یوروپ کے ممالک تک پہنچی۔جس نے شاعری اور فلسفہ کی دنیا میں اپنے ملک کا نام روشن کیا۔

## 12.15: اپنا امتحان خود لیجئے

۱۔ شاعر اپنا شوق اور اپنا انتظار کسے دکھانا چاہتا ہے؟

۲۔ اقبالؔ نے اپنی باتوں کو فسوں کیوں کہا؟

۳۔ سارے جہاں سے عداوت کس کو ہے؟

۴۔ اقبالؔ آشیانے کے لئے کیسے تنکے لانا چاہتے ہیں؟

۵۔ اس چمن میں شاعر آزادی کے گیت کیوں نہیں گانا چاہتا؟

۶۔ شاعر کے مٹنے کا تماشہ کس سبب سے ہوا؟

## 12.16: سوالات کے جوابات

۱۔ شاعر اپنا شوق اور اپنا انتظار اپنے محبوب کو دکھانا چاہتا ہے۔

۲۔ اقبالؔ نے اپنی باتوں کو فسوں اس لئے قرار دیا کہ سننے والے بھی ان کی باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور اقبالؔ کا ذکر کرتے ہیں۔

۳۔ سارے جہاں سے عداوت واعظ کو ہے۔

۴۔ اقبالؔ آشیانے کے لئے ایسے تنکے لانا چاہتے ہیں جن کو جلانے کے لئے بجلیاں بے تاب ہوں۔

۵۔ اس چمن میں شاعر آزادی کے گیت اس لئے نہیں گانا چاہتا کہ اس ملک کے باشندے آزادی کے خواہش مند ہی نہیں ہیں۔

۶۔ شاعر کے مٹنے کا سبب ان کے محبوب سے آمنا سامنا ہونے کی وجہ سے ہوا۔

## 12.17: فرہنگ

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| گلزار ہست و بود | دنیا | قبا | سرخ لباس |
| ذوقِ دید | محبوب کے دیکھنے کا شوق | تکرار: | جھگڑا |
| گفتار: | باتیں | واعظ | مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر وعظ کرنے والا |
| عداوت | دشمنی | بے تاب | بے چین |
| ہفتاد و دو رِملت | دنیا کے مختلف فرقے | ہم صفیر | ساتھ چہچہانے والے |
| شرافت کا خلعت | انسان کے تمام مخلوق میں افضل ہونے کا خاص لباس | حسنِ کامل | مکمل حسن، مراد قدرت کا حسن |
| چارہ گر | طبیب، حکیم | دیدۂ عبرت | سبق حاصل کرنے والی آنکھ |

(الفاظ و معانی ماخوذ از کلیاتِ اقبال از عبدالحمید یزدانی، شرح و مفاہیم ماخوذ از شرح بانگِ درا از یوسف سلیم چشتی)

## 12.18: کتب برائے مطالعہ


۱۔ 'کلیاتِ اقبال'، مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی

۲۔ 'بانگِ درا'، مشمولہ کلیاتِ اقبال

۳۔ 'روحِ اقبال'، از یوسف حسین خاں

۴۔ 'اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی'، از توقیر احمد خاں

۵۔ 'اُردو غزل'، از یوسف حسین خاں

۶۔ 'بحر الفصاحت' از نجم الغنی

# اکائی13: 'بالِ جبریل' کی ابتدائی پانچ غزلیں

ساخت

13.1: اغراض ومقاصد

13.2: تمہید

13.3: شاعر کا تعارف

13.4: غزل نمبر1 کا متن

13.5: غزل نمبر1 کا تنقیدی جائزہ

13.6: غزل نمبر2 کا متن

13.7: غزل نمبر2 کا تنقیدی جائزہ

13.8: غزل نمبر3 کا متن

13.9: غزل نمبر3 کا تنقیدی مطالعہ

13.10: غزل نمبر4 کا متن

13.11: غزل نمبر4 کا تنقیدی مطالعہ

13.12: غزل نمبر5 کا متن

13.13: غزل نمبر5 کا تنقیدی مطالعہ

13.14: آپ نے کیا سیکھا؟

13.15: اپنا امتحان خود لیجئے

13.16: سوالات کے جوابات

13.17: فرہنگ

13.18: کتب برائے مطالعہ

## 13.1: اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- صنفِ غزل کا مفہوم سمجھ سکیں گے۔
- اقبالؔ کی غزل گوئی سے آگاہ ہوسکیں گے۔
- علامہ اقبالؔ کی غزلوں کا مطالعہ کرسکیں گے۔

## 13.2: تمہید

اصنافِ سخن کے اعتبار سے علامہ اقبالؔ کی غزلیں اُردو کے عام شاعروں کی غزلوں کی طرح ہیں۔ان میں ردیف، قافیہ، بحر، وزن وغیرہ یعنی عروض و بلاغت کی پابندی برتی گئی ہے۔ جہاں تک مقطع کا تعلق ہے، اقبالؔ کی اکثر غزلوں میں مقطع کا وہ شعر نہیں ہوتا جس میں شاعر کا تخلص آتا ہے۔ان کی غزلوں میں تخلص کا استعمال بہت کم ملتا ہے۔خیالات اور فکر و معانی کے اعتبار سے اقبالؔ کی غزلوں کا مزاج سب سے الگ ہے۔ انھوں نے غزلوں میں فلسفہ، جدوجہد اور غفلت سے بیداری کا پیغام دیا۔

شروع شروع میں اس کتاب کا نام ''نشانِ منزل'' تجویز ہوا تھا لیکن اقبالؔ کو اس عنوان سے اطمینان نہیں ہوا، اس لئے بعد میں ''نشانِ منزل'' کو بدل کر ''بالِ جبریل'' کر دیا گیا۔انھوں نے ایک مکتوب مورخہ 16/اگست 1924ء میں نذیر نیازی کو لکھا ہے:

> ''کتاب کا نام (نشانِ منزل) کی جگہ ''بالِ جبریل'' تجویز ہوا ہے۔فی الحال مسافر (سیاحت چندروزہ افغانستان) کی کتابت شروع ہے۔غالباً کل یا پرسوں ختم ہو جائے گی۔اس کے بعد ''بالِ جبریل'' کی کتابت شروع ہوگی۔''
>
> (مکتوبِ اقبالؔ، مرتبہ نذیر نیازی، صفحہ:186)

''بانگِ درا'' کی بہ نسبت ''بالِ جبریل'' میں خیالات کی گہرائی اور افکار کی رفعت زیادہ دقیع اور سنجیدہ ہے۔اس میں ''بانگِ درا'' کے شور واویلا اور شاعر کی اشک ریزی کا خاموش امتزاج ہے۔گویا ''بالِ جبریل'' کی فکر زیادہ رفیع اور اڑان زیادہ بلند ہے۔ بہ الفاظ دیگر جبریل کی پرواز کے ہم پلہ ہے، اس لحاظ سے اس شعری مجموعہ کا نام ''بالِ جبریل'' یعنی جبریل کے پر رکھنا ہی زیادہ مناسب تھا۔ یوسف سلیم چشتی نے ''بالِ جبریل'' کے عنوان کے سلسلہ میں یہی اعتراف کیا ہے، اس کی بلندیِ فکر کی بنا پر اس عنوان کو صحیح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں فی الجملہ یہ غزل ساری کتاب کی جان ہے اور یہ شعر اس غزل کی جان ہے اور ''حریم'' اس شعر کے پہلے مصرع کی اور بت کدہ دوسرے مصرعے کی جان ہے۔اگر یہ شعر اس کتاب میں نہ ہوتا تو اس کتاب کے نام کی موزونیت پر حرف آجاتا۔کیوں کہ ''بالِ جبریل'' کی معنویت اس امر کی مقتضی ہے کہ شاعر عشق حقیقی کے پر لگا کر حریم ذات تک پہونچنے کی کوشش ضرور کرے،

کامیابی ہو یا نہ ہو عاشق کا کمال کوشش ہے'' (''شرح بالِ جبریل''، صفحہ:47)

''بالِ جبریل'' کے عنوان کے ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ''بالِ جبریل'' کا آغاز جس شعر سے ہوتا ہے، وہ خود اس کتاب کی عظمت اور اہمیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ یعنی

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

مطلب یہ ہوا کہ یہ کتاب نادانوں کے پڑھنے کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ان لوگوں کے پڑھنے کے لئے ہے جو عقل سلیم رکھتے ہوں اور جن کی پروازِ تخیل جبریل کی اڑان کا ساتھ دے سکتی ہے۔

اس مجموعہ میں اقبالؔ حضور رسالت مآبؐ سے زیادہ حضور خداوندی میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہونچنے کے لئے جبریل کے پروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور تخیل کی پرواز شاعر کو جبریل کے پروں کی طرح عرش الٰہی تک پہونچا دیتی ہے۔ وہ کبھی ''حریم ذات'' میں شور برپا کرتے ہیں تو کبھی بت کدہ صفات میں غلغلہ ہائے الاماں پیدا کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مجموعہ میں خیالات کی پاکیزگی جبریل کے پروں کی طرح مقدس اور بے داغ نظر آتی ہے۔ فکر کی نظافت اور خیالات کے تقدس کے پیش نظر اس مجموعہ کا عنوان ''بالِ جبریل'' ہی زیادہ موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔

''بالِ جبریل'' کی زبان نہایت پختہ اور اعلیٰ درجے کی ہے۔ زبان فارسی آمیز ہونے کے باوجود اس میں ''بانگِ درا'' کی طرح بوجھل فارسی ترکیبیں بھی نہیں ہیں۔ بلکہ جو فارسی ترکیبیں اور اشعار استعمال کئے گئے ہیں، انھوں نے کلام میں ابہام کے بجائے توضیح کی شان پیدا کر دی ہے۔ کہیں کہیں زبان و بیان پر پنجابی اثرات بھی نمایاں ہو گئے ہیں۔ اقبالؔ کے دوسرے کلام کی بہ نسبت ''بالِ جبریل'' پر یہ اثر زیادہ ہے۔ تاہم پوری کتاب کی زبان نہایت شستہ شاعرانہ اور تصوف اور فلسفہ کی فکر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اصطلاحات، مشرقی روایات اور شاعرانہ نظام پر مبنی ہیں۔ غزل کی روایتی زبان نے ''بالِ جبریل'' کو مزید دلکش اور پُر اثر بنا دیا ہے۔

''بالِ جبریل'' کا اسلوب نہایت سنجیدہ، دلچسپ اور سحر آفریں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''بالِ جبریل'' کا موضوع فلسفیانہ اور اسلوب شاعرانہ ہے۔ لیکن بایں ہمہ وجوہ مافی الضمیر کو نمایاں اور براہِ راست ادا کرنے کی کوشش بھی پائی جاتی ہے، جس نے ان کے انداز کو زیادہ برہم، گستاخ اور پُر جلال کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''بالِ جبریل'' کا اسلوب پُر پیچ فلسفہ کی گتھیوں میں الجھا ہوا نہ ہو کر نہایت واضح اور عقدہ کشا ہو گیا ہے۔

''بالِ جبریل'' کے دو حصے ہیں۔ اوّل حصے میں غزلیں ہیں۔ ان غزلوں کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں 16 غزلیں ہیں اور دوسرے حصہ میں اعداد کے لحاظ سے یہ کسر اُلٹ گئی ہے یعنی دوسرے حصہ میں غزلوں کی تعداد 61 ہے۔ اس طرح ''بالِ جبریل'' کی کل غزلوں کی تعداد 77=61+16 ہے۔ پھر حصۂ نظم

ہے، جس میں مختصر اور طویل دونوں طرح کی نظمیں شامل ہیں۔ نظموں کی کل تعداد 60 ہے۔ غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ بعض رباعیات دے دی گئی ہیں، جن کو ''کلیاتِ اقبالؔ'' ترتیب دیتے وقت ڈاکٹر جاوید اقبال نے غزلوں کے بعد باقاعدہ ایک حصہ میں رباعیات کے عنوان سے یکجا کر دیا ہے۔ یہ منتشر رباعیات کتابت کے وقت خالی جگہ کر پُر کرنے کے لئے شامل کی گئی تھیں۔

''بالِ جبریل'' کی غزلوں کو غزل کہنے میں بعض اکابرین نے تامل کیا ہے اور انھیں خود اقبالؔ کے بہ قول 'غزل نما' کہنا زیادہ مناسب خیال کیا ہے۔ مسلسل موضوعات اور مضامین کے لحاظ سے یہ غزلیں ''نظمیہ غزل'' یا ''غزلیہ نظم'' بھی کہی جا سکتی ہیں۔ ان میں غزل کا روایتی لطف اور تغزل کی کیفیت نہیں پائی جاتی لیکن ہیئت، بحر، وزن، قافیہ اور ردیف وغیرہ کے علاوہ زبان کے اعتبار سے ان میں غزل کا رنگ جھلکتا ہے۔ سوز و گداز، ہجر و فراق، تپش و انتظار، آہ و فغاں، اثر و فریاد، ساقی، بادہ، جام، مینا، صیاد، باغباں، چمن، گل، گیسو، عشق، محبت، نوا، کانٹا، کسک، کھٹک، افسانہ مہمل اور دل وغیرہ وہ الفاظ ہیں جو غزل کی زبان کے لئے مخصوص ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارے خیال میں ''بالِ جبریل'' کے اس حصے کی شاعری کو غزل (کی زبان) سے الگ قرار دینا مناسب نہیں اگرچہ خود اقبالؔ نے اس امر کا اعتراف نہیں کیا ہے:

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں　　کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

یہ اور اس طرح کے اشعار اسی دعوے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اقبالؔ ''بالِ جبریل'' کے حصہ اوّل کی شاعری کو غزل نہیں کہتے بلکہ ''ہسپانیہ میں لکھے گئے''، ''قرطبہ میں لکھے گئے''، ''لندن میں لکھے گئے'' وغیرہ نوٹ لکھ کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ متفرق اشعار ہیں جو مختلف اوقات میں بہ صورت غزل کہے گئے ہیں۔ یہ اشعار متفرق ضرور ہیں لیکن باقاعدہ کسی نظم یا صنفِ نظم یعنی مثلث، مربع، مخمس، مسدس، رباعی یا ترجیع بند وغیرہ کے ذیل میں نہیں آتے اور یہ اشعار کسی قصیدہ کا ماخوذ حصہ بھی نہیں ہیں۔ بعض غزلیں یقیناً قطع بند یعنی مسلسل ہیں لیکن بعض میں متفرق اشعار ہیں اور موضوعات بھی الگ الگ ہیں جو تغزل، تصوف، سیاحت، حکومت، فلسفہ اور حکمت وغیرہ مختلف موضوعات پر محیط ہیں۔

دوسری طرف ''بالِ جبریل'' کے اسی اوّلین حصہ میں اقبالؔ نے خود اپنی غزل خوانی کا اعتراف بھی کیا ہے:

مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی　　شیخ کہتا ہے کہ یہ بھی حرام اے ساقی
اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک　　تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی

ان دو اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ متفرق اشعار غزل کے ہیں۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کی زبان قطعاً غزل کی زبان ہے اور موضوعات بھی رنگ تغزل میں ڈوبے ہوئے ہیں:

وہی میری کم نصیبی وہی میری بے نیازی　　مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی
تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ　　وہ ادب گہہِ محبت وہ نگہ کا تازیانہ
لا پھر اِک بار وہی بادہ و جام اے ساقی　　یاد آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

ایک اور توجیہہ یہ ہے کہ ان غزلوں میں صرف نمبر شمار ڈالے گئے ہیں لیکن کسی نظم کا کوئی باقاعدہ عنوان مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ جیسے حصہ دوم کی نظموں میں جس میں بعض نظمیں بالکل ان ہی غزلوں کی طرح قطعہ بند میں لیکن ان کے عنوانات مقرر کر کے انھیں غزل کی صنف سے بچا لیا گیا ہے۔ جیسے 'لینن، ہسپانیہ، فرشتوں کا گیت اور فرمانِ خدا وغیرہ۔ اس طرح یہ معلوم ہوا کہ حصہ اوّل کی غزلوں کو حصہ نظم سے الگ کر لینے کا مقصد بھی شاید یہی ہے کہ یہ اشعار نظم نہیں ہیں۔ اس طرح ''بالِ جبریل'' کے اس حصہ کی غزلوں یا اشعار کے بارے میں غزل اور صنف نظم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے نظم کی بہ نسبت غزل کے حق میں زیادہ شواہد اور آثار ملتے ہیں۔ اس لئے ''بالِ جبریل'' کی ان غزلوں کو غزلیں ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

''بالِ جبریل'' کے حصہ اوّل کی یہ غزلیں مزید دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلے حصے میں غزلوں کی تعداد 16 ہے اور پھر 61 غزلیں ہیں۔ ان غزلوں کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا ایک سبب ہے اور وہ یہ ہے کہ شروع کی 16 غزلیں بارگاہِ ربّ العزت میں خطاب ہیں۔ یہ 16 کی 16 غزلیں خدائے عزوجل کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہیں۔ ان 16 غزلوں میں پہلی غزل کا آخری شعر اس طرح ہے:

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا　　میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اور سولھویں غزل کا آخری شعر یہ ہے:

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبالؔ　　کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

گویا سولہ غزلوں کے بعد آخر میں یہ شعر کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ اب تک جو کچھ کہا گیا، وہ حضرت یزداں میں کہا گیا ہے اور یہ جرأت انگیز باتیں حضور خداوندی میں گستاخانہ کہی گئی ہیں۔ یہ شعر کہنے کے بعد غزلیات کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے، جس میں از سرِ نو ایک سے 61 تک نمبر شمار ڈالے گئے ہیں۔ اس دوسرے حصہ کی وہ معرکتہ الآرا نظم یا غزل ہے جو اقبالؔ نے حکیم سینائی کے قصیدے کی پیروی میں سپردِ قلم کی ہے۔ حکیم ابوالمجد محمدؒ بن آدم سنائی غزنوی کا وہ مشہور قصیدہ یہ ہے جس کا مطلع حسب ذیل ہے:

مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دون است و آں بالا
قدم زیں ہر دو بیروں نِہ نہ ایں جا باش و نہ آنجا

اس نظم میں اقبالؔ نے حکیم سینائی کے ایک مصرعے پر گرہ بھی لگائی ہے:

ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے ''گرفتہ چینیاں احرام ومکّی خفتہ در بطحا''

حکیم سینائی کا اصل یوں ہے:

چوعلمت ہست خدمت کن چو دانا یاں کہ زشت آید
گرفتہ چنیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا

یہ غزل ''بالِ جبریل'' کی اور غزلوں کی بہ نسبت کافی طویل ہے اور قصیدے کے حصوں کی طرح کچھ حصوں میں مقسوم ہے۔ خود اقبالؔ کے بہ قول حکیم سنائی کے قصیدے کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ غزل نہیں قصیدہ ہے۔ قصیدے کی روایات کے اعتبار سے اس میں قصیدے کی شان بلند خیالی اور پُرمغز افکار کی فراوانی بھی پائی جاتی ہے، اس لحاظ سے ممکن ہے یہ غزل قصید ہی ہو جس کو اقبالؔ نے غزل نہیں بلکہ افکار پریشان کا نام دیا ہے، ہیئت کے اعتبار سے قصیدہ کی فارم میں ہے۔ یوسف سلیم چشتی نے اس غزل کو نظم تحریر کیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبالؔ نے اس کو حصہ غزل میں کیوں شامل کیا، اگر نظم تھی تو حصہ نظم کے تحت رکھا جانا چاہئے تھا اور قصیدہ تھا تو بھی حصہ نظم میں آنا چاہئے تھا لیکن بات یہاں سمجھ میں آجاتی ہے کہ غزل بھی تو آخر قصیدہ کا حصہ ہی ہے۔ قصیدہ کے ایک حصہ کو الگ کر کے جس میں مطلع و مقطع ہوتا ہے اور ہر شعر کا مطلب الگ ہوتا ہے۔ غزل کہہ دیا گیا اور قصیدہ اور غزل میں مذکورہ تفریق کر دی گئی۔ جس کا باقاعدہ آغاز فارسی شاعر حافظ شیرازی سے ہوتا ہے۔ اس طرح اگر اس نظم یا قصیدہ کو بھی غزل تصور کریں تو غلط نہ ہوگا اور اس خیال کی توثیق خود اقبالؔ کے حسن انتخاب سے ہو جاتی ہے کہ اس نظم کو انھوں نے حصۂ نظم کے بجائے حصۂ غزل میں شامل کیا اور حصۂ غزل کا یہ وہ حصہ ہے جس میں انھوں نے اپنے عام انداز کی غزلیں شامل کی ہیں۔ ''بالِ جبریل'' کے اس حصہ کو حصۂ غزل تسلیم کر لینے کے بعد ان غزلوں کی جو عام اور موٹی موٹی خوبیاں نظر آتی ہیں، ان کو اس طرح ترتیب دیا جاسکتا ہے۔

۱۔ 'بالِ جبریل'' کی غزلیں معنوی اعتبار سے نہایت بلند اور ارفع خیالات کی حامل ہیں۔

۲۔ اکثر غزلیں قطعہ بند ہیں جن میں موضوعات مسلسل ہیں اور بیان میں بھی تسلسل پایا جاتا ہے۔

۳۔ زبان نہایت اعلیٰ پایہ کی استعمال کی گئی ہے یعنی اعلیٰ درجے کے عالمانہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

۴۔ ان غزلوں میں ردیف کا استعمال بہت کم ہے یا زیادہ غزلیں بغیر ردیف کے کہی گئی ہیں۔

۵۔ اکثر قافیے نہایت ثقیل اور مشکل ہیں، جن میں شعر کہنا کمالِ شعر گوئی کی علامت ہے۔ مثلاً آہنگ، فرنگ، باقی، براقی، عجیب، غریب، خطیب، طواف، غلاف، کشاف، ہوش، سروش، خموش، سمرقندی، خداوندی، کشاد، فساد، بغداد، خاک، چاک، ادراک، جبریل، رحیل، دلیل، تیزی، خیزی، ہدف، صدف، نجف، لاتخف، رفیق، طریق، زندیق، زبوں، افلاطوں، میشی، بیشی، الاّ، طاحا، خارا، پازند،

خداوند، دماوند، تخیلات، توہمات، سومنات وغیرہ۔

۶۔ غزلوں میں مقطع بہت کم بلکہ ناکہ برابر ہے، اس لئے تخلص کا استعمال کم ملتا ہے۔

۷۔ اس طرح بعض غزلوں میں مطلع کا التزام بھی نہیں پایا جاتا۔

۸۔ حصۂ اوّل کی سولہ غزلیں خدائے لم یزل سے خطاب ہیں۔ اس طرح اردو ادب میں پہلی بار کوئی شاعر خدا کی ہمسری کرنے والا سامنے آیا۔

۹۔ حصہ اوّل کی غزلوں کو موضوعی اعتبار سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں ذات، حیات اور کائنات کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ ذات یعنی خالق کائنات کے بارے میں اقبالؔ کا نظریہ صاف اور نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ حیات یعنی حیات انسانی خود، میں، میرا، اور مجھے وغیرہ الفاظ کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور کائنات یعنی دنیا اور، اور اس کی بے ثباتی، قدرت کی کرشمہ سازی ان ہی غزلوں میں پائی جاتی ہے۔

**رباعیات:** ''بالِ جبریل'' کی رباعیات میں اقبالؔ نے خدا کے شہ کارِ ہنر یعنی انسان کو موضوعِ سخن بنایا ہے کہ اس کو خلیفۃ الارض بنا کر اس زمین پر تو اُتار دیا گیا لیکن وہ حق خلافت ادا کرنے کا اہل ثابت نہیں ہوا۔ بحر و بر کی سلطانی عطا کر دینے کے باوجود اس نے نہ اپنے خالق کو پہچانا، نہ اس سلطنت کو اور نہ خود اپنے آپ کو گویا اس خود ناشناس نے جہاں ناشناسی اور خدا ناشناسی کا ثبوت دے کر اپنی بے بصری کا پورا پورا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ یہ ''بالِ جبریل'' کی رباعیات کا عام موضوع رہا ہے۔ ہیئت اور وزن کے لحاظ سے ان کو رباعیات تسلیم کر لیا گیا ہے۔

''بالِ جبریل'' بہت سی لفظی اور معنوی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ فنی اعتبار سے جو اعلیٰ نمونہ ''بالِ جبریل'' کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے، وہ بے مثل اور نایاب ہے۔ اس طرح کی نادر خصوصیات میں بعض فنی خوبیاں اس طرح ہیں۔

۱۔ ''بالِ جبریل'' میں اکثر اشعار کے دونوں مصرعے ایک ہی لفظ سے شروع ہوتے ہیں اور اس طرح شعر کے آہنگ میں جذباتی لَے پیدا کرتے ہیں مثلاً:

گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود — گاہ الجھ کے رہ گئی میرے تخیلات میں

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری — کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ — مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک — وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

علم فقیہ و حکیم فقر مسیح و کلیم — علم ہے جویائے راہ فقر ہے دانائے راہ

فقر مقام نظر علم مقام خبر　　فقر میں مستی ثواب علم میں مستی گناہ
سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات　　سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی　　خودی کی خلوتوں میں کبریائی
پریشاں کاروبار آشنائی　　پریشاں تر مری رنگیں نوائی

۲۔ ''بالِ جبریل'' میں بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں، جن میں شعر کے دونوں مصرعے ایک دوسرے کے اُلٹے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں، گویا صنعت تضاد کا استعمال پایا جاتا ہے۔

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں　　تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا　　مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری　　مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی　　مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
رائی زور خودی سے پربت　　پربت زور خودی سے رائی
عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے　　عشق بے چارہ نہ زاہد ہے نہ مُلّا نہ حکیم

۳۔ ''بالِ جبریل'' کے بہت سے اشعار ایسے ہیں، جن میں ایک یا دونوں مصرعوں کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی صنعت ترصیع یا ردالعجز علی الصدر یا ردالصدر علی العجز جیسی صنعت استعمال کی ہے۔ مزید برآں ہر ایک مقسوم ٹکڑے کی شروعات ایک ہی لفظ سے ہوتی ہے۔

عشق تری انتہا، عشق مری انتہا　　تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام
ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام　　وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام
یا عقل کی روباہی، یا عشق ید اللہی　　یا حیلۂ افرنگی، یا حملہ تر کا نہ
ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو　　میری نواؤں میں ہے، میرے جگر کا لہو
شوق مرے لَے میں ہے، شوق مری نَے میں ہے　　نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

۴۔ بعض مصرعوں کو دو برابر حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ دونوں حصوں کے ابتدائی الفاظ ایک دوسرے کے اُلٹے ہیں، گویا مصرعے میں صنعت تضاد طباق کا استعمال پایا جاتا ہے۔ صنعتی اعتبار سے یہ مصرعے صنعت ترصیع اور صنعت طباق کا یکجا نمونہ ہیں۔

عشق تری انتہا، عشق مری انتہا　　تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام
میری مَیں فقیری میں، شاہی مَیں غلامی میں　　کچھ کام نہیں بنتا بے جرأت رندانہ
اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا　　نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

اس طرح کی اور بھی متعدد خوبیاں مثلاً عکس، مشاکلہ، تلمیح اور تجنیس وغیرہ ''بالِ جبریل'' کی زینت کو بڑھاتی ہیں۔ صنعتی اعتبار سے ان صوری ولفظی خوبیوں کے علاوہ ''بالِ جبریل'' ایک باقاعدہ اعلیٰ خیالات اور ارفع موضوعات کا مجموعہ ہے۔ ''بالِ جبریل'' میں سے بہت سے خیالات اور موضوعات نوعیت کے لحاظ سے انوکھے ہیں۔ بعض نادر موضوعات جو ''بالِ جبریل'' کی شاعری میں شامل ہیں، سرسری اعتبار سے اس طرح ہیں۔

''بالِ جبریل'' فکر وفلسفہ سے لبریز کتاب ہے۔ موضوعات سے سرسری طور پر گزر جانا تو اقبالؔ کا وتیرہ ہی نہیں ہے، اس کی بجائے ان کی گہرائی میں اترنا اور روح فرسا خیالات پیدا کرنا، ان کا خاص مشرب ہے۔ ''بالِ جبریل'' کی غزلوں تک میں گہرا فلسفیانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ اس کی رباعیات اور نظمیں فلسفیانہ خیالات سے پُر ہیں۔ 'جبریل وابلیس'، 'ساقی نامہ'، 'ذوق وشوق' اور 'مسجد قرطبہ' وغیرہ وہ نظمیں ہیں جن کی تہہ میں اقبالؔ کا پُر مغز فلسفہ سمایا ہوا ہے۔ 'پیر ومرید' نام کی نظم تو ہے ہی کچھ اس نوعیت کی جس میں مرید اپنے مرشد سے پُر مغز اور مشکل سوالات کرتا ہے اور مرشد رومیؔ مرید ہندی (اقبالؔ) کو ان سوالوں کے فلسفیانہ جوابات دیتے ہیں۔ اس طرح ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ''بالِ جبریل'' اقبالؔ کی ایسی پُر مغز کتاب ہے، جس میں انھوں نے عصر حاضر کے پُر پیچ فلسفیانہ خیالات وافکار کی توضیح وتصریح کی ہے۔

## 13.3: شاعر کا تعارف

علامہ اقبالؔ برصغیر ہندو پاک کے مقبول ومعروف شاعر ہیں۔ ان کی شہرت ایشیا سے نکل کر یوروپ اور دنیا کے دوسرے ممالک تک پہنچی، جہاں اقبالؔ کے کلام کو براہِ راست پڑھا گیا، اس لئے وہ اُردو کے پہلے عالمی شاعر ہیں اور دوسری زبانوں میں مباحث ہوئے۔ ان کے کلام میں قوموں کے نام اور ملکوں کے نام ایک پیغام ہے۔ انھوں نے قوموں کی زبوں حالی کا علاج دریافت کیا ہے۔ اقبالؔ دنیا کے واحد وہ شاعر ہیں جو خدا سے بھی آمنے سامنے باتیں کرتے ہیں۔ 'بالِ جبریل' کی ان پانچ غزلوں میں خدا سے ہی تخاطب ملتا ہے۔

## 13.4: غزل نمبر 1 کا متن

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں — غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں
حور وفرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں — میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں
گرچہ ہے میری جستجو دیر وحرم کی نقشبند — میری فغاں سے رستخیز کعبہ وسومنات میں
گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود! — گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

## 13.5: غزل نمبر1 کا تنقیدی جائزہ

'بالِ جبریل' کی اِن پانچ غزلوں میں شاعر نے معشوقِ حقیقی سے خطاب کیا ہے۔اس غزل میں بظاہر تو شاعر نے اپنا تذکرہ کیا ہے،لیکن بہ باطن یہ اسی کی حمد وثنا ہے۔

پہلا شعر: علامہ اقبالؔ نے نوائے شوق کی اصطلاح اپنی شاعری کے لئے استعمال کی ہے۔اس سے آہ و بکا اور نالہ و فریاد بھی مراد لیتے ہیں۔حریمِ ذات کا مطلب خدائے تعالیٰ کا ایسا محفوظ مقام مراد ہے جہاں کسی کا گزر نہ ہو سکے۔ یعنی اقبالؔ کی شاعری میں گریہ وزاری سے جو ایک عاشق کی فریاد ہے، خدائے تعالیٰ کے ذاتی خلوت خانہ میں شور برپا ہو گیا ہے اور اسی کے ساتھ ذاتِ باری تعالیٰ کی صفات یعنی اس کی بنائی ہوئی کائنات میں بھی ''اللہ کی پناہ'' کا ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔یعنی اقبالؔ کی فریاد سے ذات وصفات دونوں عالم میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں کہ'' کیا یہ کمال کچھ کم ہے کہ ایک مشتِ خاک کی نوائے شوق سے حریمِ ناز میں شور برپا ہو گیا ہے۔مانا کہ کامیابی نہ ہو سکی لیکن یہ وہ ناکامی ہے کہ اس پر لاکھوں کامیابیاں نثار ہیں''۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن کو اپنا نصب العین اتنا بلند اور بالا رکھنا چاہئے کہ اسے اپنا مقصد حاصل نہ ہو سکے تا کہ تمام عمر جدوجہد میں بسر کر دے، زندگی میں سکون نصیب نہ ہو اور لذتِ طلب برقرار رہے۔

تری دعا ہے کہ ہو میری آرزو پوری  مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

دوسرا شعر: اس شعر میں علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ میرے تخیلات یعنی خیال کرنے اور سوچنے میں حور اور فرشتہ جیسی غیر مادی اور غیر مرئی اشیاء بھی اسیر ہیں، یعنی تیرے عشق کے طفیل میری نگاہ اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ یہ عالمِ رنگ و بو، عالمِ آب وگل، یہ دنیا میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ میری نظر کی حقیقت بینی کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ تیرے بکھرے ہوئے جلووں یعنی تیری تجلیات تیری روشنیوں میں بھی خلل واقع ہو گیا ہے۔لوگ اکثر تیری تجلی کی چکاچوند میں گم ہو جاتے ہیں لیکن میں تیری تجلی سے تیری خوب صورت دنیا میں تیرے جمال پر غور کرتا ہوں کہ جس نے یہ حسین وجمیل کائنات بنائی ہے، وہ کس قدر جمیل ہو گا۔

تیسرا شعر: اس شعر میں علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ اے خدا! میری تمام جستجو یعنی میری زندگی کی تمام تر تگ و دَو، تلاش وتحقیق، دیر وحرم یعنی کفر واسلام، مندر ومسجد کی صورت گر ہے،لیکن میری فغاں میری شاعری اور میرے ذکر وفکر سے کعبہ اور سومنات یعنی تمام نام نہاد اسلامی مراکز اور کفر کے حلقوں میں قیامت برپا ہو گئی ہے یعنی میری آہ وفغاں سے تمام غیر حقیقی اور باطل حلقوں میں ہنگامہ برپا ہو گیا ہے کہ یہ کیسی آواز ہے،کیسی شاعری ہے،جس نے تمام حلقوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے، میری جستجو یعنی عقل نے دنیا کو اور فغاں یعنی عشق نے عقبیٰ کو۔

چوتھا شعر: اس شعر میں بھی وجدانی مسئلہ زیرِ بحث ہے۔اقبالؔ کے یہاں عقل اور عشق دونوں متضاد ہیں۔عقل کی

حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ہی پیدا کردہ توہمات میں گرفتار رہتی ہے اور عشق کا کمال ہے کہ وہ حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے اور حق کا جلوہ دیکھ لیتا ہے۔اس لئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ کبھی کبھی میری نگاہ میں میری عقل میں ایسی تیزی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کائنات کے پردوں کو چیرتی چلی جاتی ہے اور کبھی کبھی ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہی نظر وہی نگاہ اپنے پیدا کردہ طرح طرح کے وہم وگمان میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔شاعر اس صداقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ انسان کی ظاہری اور باطنی حالت ایک ہی طرح برقرار نہیں رہتی۔کبھی وہ تخیلات کے ذریعے ایسے ارفع اور اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ عالمِ وجود کی حقیقت سے باخبر ہو جاتا ہے اور کبھی فرد اپنے ہی تخیل کے جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

**پانچواں شعر:** اس شعر میں بھی شاعر خدا سے شکوہ کناں ہے کہ اے خدا تو نے یہ کیا غضب کر دیا کہ مجھ کو بھی ظاہر کر دیا کیوں کہ میں ہی کائنات کے سربستہ رازوں میں سے ایک راز تھا۔اس پوری غزل میں خطاب تو خدا سے ہے لیکن شاعر کی اپنی ذات اور انسان بھی مخاطب ہے۔یعنی ذاتِ خداوندی کے ساتھ انسان کی اپنی ذات بھی موجود ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے کمالِ تخلیق میں انسان کو پیدا کر کے خود اپنی انا اپنے راز کو فاش کر دیا ہے۔

## 13.6: غزل نمبر 2 کا متن

اگر کج رَو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟ مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی خطا کس کی ہے یارب!لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر مجھے معلوم کیا وہ راز داں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

## 13.7: غزل نمبر 2 کا تنقیدی جائزہ

**پہلا شعر:** یہ غزل بھی دوسری غزلوں کی طرح شکایت ہی پر مبنی ہے اور بہت فلسفیانہ اور متصوفانہ افکار سے مملو ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ اے خدا میں کیوں دنیا کی بربادی میں گھُلا جا رہا ہوں۔اس کی رفتار اگر تیرے آسمان کے ستاروں کی طرح ٹیڑھی میڑھی اور منتشر ہے تو میں کیوں فکرمند ہوں کیوں کہ یہ جہاں تیرا ہی تو ہے، میرا تو ہے نہیں۔اس کے ستاروں کے سجانے سنوارنے کی فکر کیوں کر مجھے کرنی چاہئے۔

**دوسرا شعر:** اس شعر میں علامہ اقبالؔ نے ہبوطِ آدم کا قصہ بیان کیا ہے یعنی جب انسان کو جنت سے نکال دیا گیا تو وہ چہل پہل اور رونقیں ختم ہو گئیں۔اب اقبالؔ کہتے ہیں کہ وہ ویرانی اور عشق کی گرمی سے خالی مقام یارب تیرا ہے یا

میرا ہے۔یعنی وہ لامکاں جہاں کوئی مکان نہیں ہے، تیرا ہی تو ہے اور اس انسان کو نکال کر تو نے ہی اس کو ہنگامہ ہائے شوق سے خالی کیا ہے، اس میں میری کیا خطا ہے؟

تیسرا شعر: اس شعر میں علامہ اقبالؔ نے آدم علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر کیا ہے کہ اللہ کے حکم کے باوجود ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا اور پھر آدم وحوا علیہما السلام کو دنیا میں پھینکے جانے کے ساتھ ابلیس کو بھی راندۂ درگاہ کر دیا۔اس قصے کو اقبالؔ یاد کرتے ہیں کہ اے خداند عالم تیرے حکم کے خلاف اسے انکار کی جرأت کیسے ہوگئی۔ مولائے کریم، مجھے یہ بتا کہ وہ تیرا رازداں تھا یا میرا؟ یعنی وہ میرے بارے میں ساری باتیں جانتا تھا یا تیرے بارے میں۔ظاہر ہے کہ میرے بارے میں تو اس کو پوری معلومات تھی لیکن تیرے رازوں کا جاننا مشکل تھا مگر اس کے باوجود تیری نرم خوئی کی بنا پر وہ انکار کرنے کا مرتکب ہوا۔

چوتھا شعر: یہ شعر مفہوم کے اعتبار سے اقبالؔ کے مشکل ترین شعروں میں سے ایک شعر ہے۔بعض مباحثوں کے باوجود اس کا موضوع طے نہیں ہو پایا۔خود اقبالؔ نے بھی اس کا مطلب بیان کرنے سے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ممکن ہے آپ مجھ سے زیادہ بہتر مطلب نکالیں۔ بہر کیف، اس شعر میں علامہ نے نبی آخرالزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر قرآن لے کر آنے والے فرشتے جبریل علیہ السلام اور نازل ہونے والے خدا کے کلام کا ذکر کیا ہے کہ اے مولائے کریم یہ تینوں تیرے ہی تو ہیں: محمدؐ، جبریل اور قرآن؛ مگر یہ حرفِ شیریں (غالباً قرآن یا کلمۂ طیبہ) کس کا ترجمان ہے۔کس کی ترجمانی کرتا ہے، تیری ترجمانی کرتا ہے یا میری ترجمانی کرتا ہے۔

پانچواں شعر: اس شعر میں بھی انسانی زوال کا رونا رویا گیا ہے۔اقبالؔ خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ اے اللہ اس ایک ٹوٹے ہوئے ستارے کی چمک سے تو تیرا جہان منور ہے لیکن انسان اپنی ذلیل حرکتوں سے پستی میں چلا گیا ہے۔تو اے خدا یہ بتا کہ اس انسان کا زوال اس آدمِ خاکی کی تنزلی کی طرف جانے میں میرا نقصان ہے یا تیرا نقصان ہے، یعنی اے خدا اس کے زوال پذیر ہونے میں تیرا ہی تو نقصان ہے، اس لئے اس نقصان کو روکنے کے لئے اے معبودِ برحق اس انسان کو قعرِ ذلّت سے نکال لے۔

## 13.8: غزل نمبر 3 کا متن

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر — ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں — یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!
تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آب جو! — یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر!
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گُہر کی آبرو — میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر
نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو — اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر!

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں　　کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر!

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر!

## 13.9: غزل نمبر3 کا تنقیدی جائزہ

پہلا شعر: اس غزل میں تغزل کا رنگ ہے اور غزل کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ غزل کا پہلا مصرع ہی ''گیسو'' سے شروع ہوا ہے۔ گیسو کا لفظ آتے ہی محبوب کا پیکر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ گیسوؤں سے محبوب کی زلفیں مراد ہیں تو مطلب نکلتا ہے کہ اے میرے محبوب تو اپنے گیسوؤں کو ذرا اور بھی دل کش اور چمک دار بنا لے اور ہوش وحواس، عقل وشعور اور قلب ونظر، روح ووجدان کو بھی شکار کر لے۔ یعنی اپنی ذات کا ایسا جلوہ دکھا کہ میں دنیا و مافیہا سے لاتعلق اور بے گانہ ہو جاؤں۔ لیکن یہاں اقبالؔ کا خطاب معشوقِ حقیقی یعنی حق تعالیٰ سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اے خدا اپنی گیسو نما تجلیات کا جلوہ اور بھی دوبالا کر دیجئے تا کہ میں آپ کی محبت میں ہوش وخرد اور قلب ونظر دونوں سے بے گانہ ہو جاؤں، آپ کا دیوانہ ہو جاؤں۔ اس دیوانگی میں ہزار فرزانگیاں پوشیدہ ہیں۔

دوسرا شعر: اس شعر میں اقبالؔ خدا تعالیٰ سے ایک آرزو کا اظہار کرتے ہیں کہ اے خدا عشق اور معشوق دونوں حجاب میں رہیں یعنی نظر نہ آئیں یہ تقاضائے عشق کے منافی ہے۔ یا تو آپ کا حسن وجمال ظاہر ہو جائے۔ اقبالؔ جانتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں کیوں کہ خدا تعالیٰ مجسم نہیں، اس لئے یہ ممکن نہیں تو کم از کم مجھ کو ہی اظہار کی ایسی طاقت عطا فرما کہ مومنانہ زندگی سے تیرے دین اور تیرے نام کی عظمت کو آشکار کر سکوں۔

تیسرا شعر: اس شعر میں بھی اقبالؔ کی ایک آرزو ہے جو اپنے معشوقِ حقیقی کے سامنے رکھتے ہیں اور وہ ذاتِ باری تعالیٰ کی صفات کو ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے خداوند عالم تو ایک وسیع وعریض سمندر ہے اور میں ایک چھوٹی سی ندی ہوں۔ ایسی صورت میں یا تو مجھے خود میں سمو لے، اپنے میں ملا لے یا پھر اپنی طرح میری حدوں کو توڑ کر مجھے بے کنارہ کر دے۔

چوتھا شعر: اس شعر میں علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ میں اگر کوئی صدف ہوں یعنی میرے اندر سیپ کی طرح گوہر اور موتی رکھنے کی صلاحیت ہے تو میرے اندر گوہر یا جو جوہر ہے، اس کی عزت وآبرو تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور اگر میں صدف نہیں ہوں اور میں خزف ریزہ یعنی ٹھیکری ہوں تو اس ٹھیکری کو بادشاہوں کے لائق گوہر بنا اور اپنی بارگاہ میں قبول فرما۔

پانچواں شعر: اس شعر میں اقبالؔ اللہ تعالیٰ سے فریاد رس ہیں کہ اے خداوندِ کائنات میں ایک زمانے سے تیری ملّت کا عروج دیکھنے کا خواہش مند ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنی آنکھوں سے وہ دَور دیکھوں جب تیری امت اس دنیا

کی باد ڈور سنبھالے لیکن اگر یہ منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں اور یہ نغمۂ نو بہار یعنی خوشی کا ترانہ گانا میرے نصیب میں نہ ہو تو کم از کم اس دم نیم سوز یعنی قوم کے غم میں ادھ جلے شاعر کو بہار کی خبر سنانے والا شاعر یعنی بہار کے نغمے گانے والا پرندہ ہی بنا دے۔

چھٹا شعر: اس شعر میں علامہ اقبالؔ اللہ تعالیٰ کی اور چالاک انسان کا ذکر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ اے خدا تو نے اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے ہی تو انسان کو جنت سے نکالا تھا۔ اب اگر وہاں ہُو کا عالم ہو گیا، رونق ختم ہو گئی تو اب اس کے لئے میرے آنے کا انتظار کیوں کر۔ کیوں کہ دنیا میں بھیجا ہے تو یہاں کے کام نپٹانے میں دیر لگے گی۔ دنیا کے کام بہت لمبے اور دیر طلب ہیں، ان سے فارغ ہو جاؤں تو تیری بارگاہ میں حاضر ہو سکوں گا۔

ساتواں شعر: اس شعر میں علامہ اقبالؔ خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ اے خدا اس انسان کو تو نے ہی تو خود بنایا تھا اور اس کو ساری مخلوق میں افضل پیدا کیا تھا، اشرف المخلوقات بنایا تھا۔ لیکن اس انسان نے یہاں آ کر تیری نافرمانی کی اور ایسے ایسے کام کیے جو بڑے شرمناک تھے، اس لئے اب تیرا یہ شاہکار قیامت کے روز تیرے سامنے آئے اور اس کا حساب کتاب لیا جائے تو اپنے بنائے ہوئے انسان کے کارنامے سن کر خود بھی شرمسار ہو اور اُسے یعنی مجھے بھی شرمسار کر۔

## 13.10: غزل نمبر 4 کا متن

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد — نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد!
یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک — کرم ہے یا کہ ستم، تیری لذّتِ ایجاد!
ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل! — یہی ہے فصلِ بہاری؟ یہی ہے بادِ مراد؟
قصوروار، غریب الدیار ہوں، لیکن! — ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد!
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے — وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد
خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیّاد

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

## 13.11: غزل نمبر 4 کا تنقیدی مطالعہ

پہلا شعر: یہ غزل بھی اقبالؔ کی ایسی غزلوں میں سے ہے جس میں انسان کی برتری، اولوالعزمی اور جاں بازی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ انسان کو فرشتوں سے برتر اور افضل بتایا ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ نے کہا کہ اے خدائے واحد تو کم سے کم میری فریاد کو سن تو لے، اس فریاد کا تیرے اوپر کوئی اثر ہو یا نہ ہو، مجھے اس داد کی طلب نہیں ہے، مگر میں تو یہ چاہتا ہوں

کہ تو کم از کم میری بات سن تو لے، میری طرف متوجہ ہو جائے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ یہ مٹھی بھر خاک یعنی انسانی جسم جو مٹھی بھر مٹی سے بنا ہے اور اس کے لئے یہ گرم و تند آندھیاں، طرح طرح کے مصائب اور آسمان کی وسعتیں؛ ان سب بے پناہ سخت اور وسیع و عریض چیزوں کا سامنا کیسے کرے۔ میرے مولیٰ مجھے یہ بتا دے کہ تیری خواہش کے مطابق اس کائنات کو پیدا کرنے کا شوق جیسے کہ حدیث میں آیا کہ ''میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں، سو میں جانا گیا'' اور تو نے انسان کو پیدا کر دیا مگر تیرا یہ شوق سے پیدا کیا ہوا انسان ہے، اسے تو نے اپنے کرم سے پیدا کیا یا اپنے ستم سے پیدا کیا ہے۔ یعنی اس کی پیدائش میں کرم ظاہر ہوتا ہے یا ستم ٹپکتا ہے۔ سخت ترین آزمائشوں اور مصیبتوں میں پھنسا ہونے کے باعث تو یہ ستم رسیدہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں بھی نرم و نازک، چھوٹے سے وجود 'پھول' کے بارے میں کہتے ہیں کہ چمن کی ہواؤں کے سامنے یہ چھوٹا سا پھول نہیں ٹک سکا، اس کی پتیاں بکھر گئیں۔ اس کو فصلِ بہاری اور مرضی کے مطابق چلنے والی ہوائیں کہا جاتا ہے یعنی یہ فصلِ بہاری ہے اور نہ یہ بادِ مراد ہے۔

چوتھا شعر: اس شعر میں علامہ اقبالؔ اللہ تعالیٰ سے انسان کی برتری جتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مولائے کریم میں بہت قصوروار ہوں، خطا کار ہوں اور غربت کا مارا ہوا پردیسی ہوں، گویا ہر لحاظ سے قابلِ سرزنش ہوں، لیکن مولائے کریم تیری یہ خراب دنیا یہ ویران بستی میں نے ہی آباد کی اور بس انسان ہی اس لائق تھا کہ اس ویرانے کو آباد کر سکتا۔ کیوں کہ فرشتے بھی اس قابل نہ تھے کہ اس خوفناک مقام میں آ کر قیام کرتے۔ یہاں آ کر آباد ہونا، بس جانا بڑی ہمت کی بات ہے جو میں نے کی ہے۔

پانچواں شعر: یہ شعر بھی گزشتہ شعر سے پیوستہ ہے اور اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں بہت زیادہ جفا طلب، سخت کوش اور مشکلوں میں خوش رہنے والا ہوں اور میری اس مشکل پسندی، مصیبت آزمائی کی داد یہ تیرا عالم دیتا ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ بھی تیرا کرشمہ ہے کہ اس جہاں کو بغیر کسی بنیاد کے کھڑا کر دیا ہے۔ یعنی ان سختیوں پر تیرا بنایا ہوا جہاں بھی میری داد دیتا ہے، میری ہمت کی تعریف کرتا ہے۔

چھٹا شعر: اس شعر میں بھی انسان کی جفا طلبی کو ظاہر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان کی سرشت خطروں سے کھیلنا ہے۔ اس لئے انسان کو جس کی طبیعت ہی خطرہ پسندی ہے، ایسی جگہ ساز گار نہیں جہاں گھات میں صیاد نہ بیٹھا ہو۔ یعنی اس پر گھات لگا کر حملے کیے جاتے ہیں تو وہ خوش ہوتا اور ان حملوں کا مقابلہ کرتا ہے۔

ساتواں شعر: اس شعر میں بھی علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ عشق کی منزلوں سے گزرنا تیرے فرشتوں، تیرے مقدس ملائکہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ کام تو اس کے بس کا تھا، جس کے حوصلے بلند تھے اور وہ میں یعنی انسان ہی تھا جس

نے اس منزل کو طے کیا۔ یہاں پر بھی پوری غزل کی طرح اقبالؔ نے انسان کی اولوالعزمی اور سخت کوشی کی طرف اشارہ کیا اور بتایا ہے کہ انسان نے ایسے کام کر دکھائے جو فرشتے بھی انجام نہیں دے سکے۔

## 13.12: غزل نمبر 5 کا متن

کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا　　کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا
وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک　　اس میں مزہ نہیں تپشِ انتظار کا
میری بساط کیا ہے؟ تب و تاب یک نفس　　شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا
کر پہلے مجھ کو زندگیِ جاوداں عطا　　پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

## 13.13: غزل نمبر 5 کا تنقیدی مطالعہ

پہلا شعر: 'بالِ جبریل' کی یہ غزل اقبالؔ کی گزشتہ چار غزلوں سے مختلف ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے پچھلی چاروں غزلوں میں انسان کی سربلندی اور سرخروئی کے خیالات ظاہر کیے تھے لیکن اس غزل میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خدا کے سامنے انسان کی بے بسی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ میری زندگی ایک اُدھار مانگی ہوئی زندگی ہے، جو ناپائیدار ہے، تو ایک پائیدار ہستی ہے، جو ہمیشہ رہنے والی ذات ہے۔ اس سے عشق کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

دوسرا شعر: اس لئے اگر میرا عشق بھی پائیدار ہوتا تو ہمیشہ رہنے والی ذات کے عشق میں مزہ آتا۔ میرا عشق ایسا ہے کہ جس کی زندگی کو موت ختم کر دیتی ہے۔ اس میں سوز و گداز اور تپش و انتظار یعنی عشق لڑانے کا مزہ نہیں ہے۔

تیسرا شعر: اقبالؔ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں میری یعنی انسان کی بساط کیا ایک لمحے کی چمک دمک کے برابر ہے۔ خدائے وحدہٗ لاشریک ایک بھڑکتے ہوئے شعلے کی مانند ہے، اس سے ایک معمولی چنگاری کا الجھنا بے کار ہے۔ یعنی میرا خدا سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔

چوتھا شعر: اس لئے اے خدا پہلے تو مجھے ہمیشہ رہنے والی زندگی عطا کر پھر اس دلِ بے قرار کا ذوق و شوق دیکھنا کہ تیرے عشق میں کیا کیا کرتا ہے۔

پانچواں شعر: اس لئے اس شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے خدا میرے بدن میں ایسا کانٹا چبھا دے جس کی کھٹک کبھی ختم نہ ہو اور ایسا درد مجھے عطا کر دے جس کی کسک، جس کی چبھن ختم نہ ہونے والی ہو۔ یعنی مجھے حیاتِ جاودانی عطا کر اور اس قوم کی خدمت کا درد عطا کر جو ہمیشہ بے چین و بے قرار رکھے۔

## 13.14: آپ نے کیا سیکھا

علامہ اقبالؔ کی ان پانچوں غزلوں میں خدا سے خطاب کیا ہے اور کہا ہے کہ میری شاعری یا میرے عشق کی بہ دولت عالمِ ذات اور عالمِ صفات یعنی دنیا اور لامکاں دونوں میں قیامت برپا ہوگئی ہے۔ میرے تخیلات کی گرفت میں مرئی اور غیر مرئی دونوں قسم کے مظاہر ہیں۔ اے خدا تو نے یہ کیا غضب کر دیا کہ مجھ کو بھی ظاہر کر دیا کیوں کہ میں کائنات کے سینے میں ایک رازِ سربستہ تھا۔ اقبالؔ اسی کائنات پر غور کرتے ہیں اور خدا سے کہتے ہیں کہ اس دنیا میں اکثر خرابیاں ہیں تو تو ان کو دور کر دے، کیوں کہ دنیا تیری ہی پیدا کی ہوئی ہے۔ انسان کا روحانی زوال اس دنیا کا زوال ہے۔ اس لئے مولائے کریم تو اپنے جلوؤں کی تابانی تیز کر دے تا کہ وہ میری نظروں کو خیرہ کر دے اور میں اپنے آپ میں، اپنے ہوش وحواس میں نہ آسکوں، یہ تیرا شاہکار ہے۔ اسے راہِ راست پر لگا دے ورنہ روزِ قیامت یہ تیرے لئے بھی باعثِ شرم ہوگا۔ اقبالؔ کہتے ہیں اے خدا میں تو تیری توجہ کا خواست گار ہوں۔ میں تیرے دربار کا فریادی ہوں۔ اس کا اثر ہو یا نہ ہو، کم از کم تو میری فریاد تو سن لے کیوں کہ اس دنیا کو آباد کرنے اور رونق بخشنے کا شرف صرف انسان کو ملا ہے۔ اس ضمن میں فرشتے بھی بے بس ثابت ہوئے۔ اے خدا تو مجھے لافانی عشق عطا کر، دنیا کا عشق محض زندگی تک کا ہے، موت کا فرشتہ آتے ہیں یہ ختم ہو جاتا ہے۔ میں تیرے عشق کا کمال چاہتا ہوں۔

انسان کائنات میں خدا کا مظہر ہے۔ وہ محض روح اور بدن کا مرکب نہیں بلکہ اس کے اندر ایک جوہر اور بھی ہے جس کو خودی کہتے ہیں۔ جو شخص خودی کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ خدا سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔ یہ ان غزلوں کا موضوع ہے۔

## 13.15: اپنا امتحان خود لیجئے

(الف) موضوعی:

۱۔ اقبالؔ نے ان غزلوں میں کس سے خطاب کیا ہے؟

۲۔ اقبالؔ کی شاعری کا کائنات میں کیا اثر ہوا؟

۳۔ انسان کو کس کا راز بتایا گیا ہے؟

۴۔ اقبالؔ کس کے گیسو سنوارنے کی بات کر رہے ہیں؟

(۱) معشوقِ مجازی کے (۲) کسی خاتون کے (۳) اُردو زبان کے (۴) معشوقِ حقیقی کے

۵۔ اقبالؔ کس قسم کا عشق چاہتے ہیں؟

(ب) معروضی:

۱۔ اقبالؔ کی شاعری کا موضوع کیا ہے؟

۲۔ کیاان غزلوں میں متصوفانہ خیالات ملتے ہیں؟

۳۔ اقبالؔ انسان اور کائنات کو کیسا محسوس کرتے ہیں؟

۴۔ اقبالؔ کی غزلوں میں کیا کیا فلسفیانہ افکار پائے جاتے ہیں؟

۵۔ اقبالؔ خدا سے کیا مانگتے ہیں؟

(۱)دولت (۲)عزت (۳)شہرت (۴)توجہ

## 13.16: سوالات کے جوابات

(الف) موضوعی:

۱۔ اقبالؔ نے ان غزلوں میں خدا سے خطاب کیا ہے۔

۲۔ اقبالؔ کی شاعری سے کائنات میں ہلچل مچ گئی۔

۳۔ انسان کو کائنات کا راز بتایا گیا ہے۔

۴۔ اقبالؔ معشوقِ مجازی کے گیسو سنوارنے کی بات کر رہے ہیں۔

۵۔ اقبالؔ دائمی عشق جو ہمیشہ باقی رہے وہ چاہتے ہیں۔

(ب) معروضی:

۱۔ اقبالؔ کی شاعری کا موضوع خدا، انسان اور کائنات ہے۔

۲۔ ہاں ان غزلوں میں متصوفانہ خیالات ملتے ہیں۔

۳۔ اقبالؔ انسان اور کائنات کو شرارہ کی طرح لمحہ بھر کی چمک کی طرح سمجھتے ہیں۔

۴۔ اقبالؔ کی غزلوں میں حبّ الوطنی، عشق، خودی وغیرہ فلسفیانہ افکار پائے جاتے ہیں۔

۵۔ اقبالؔ خدا سے صرف اس کی توجہ مانگتے ہیں۔

## 13.17: فرہنگ

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| نوائے شوق | عشق کی آواز، جذبوں سے پُر شاعری | حریمِ ذات | خدا تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کا ٹھکانہ |
| غلغلہ | شور | الاماں | خدا کی پناہ |
| بت کدۂ صفات | یہ کائنات | اسیر | قیدی |
| تخیلات | ذہن میں آئے ہوئے خیالات | خلل | فتور، رخنہ |
| تجلیات | خدا کے جلوے | جستجو | تلاش |

| | | | |
|---|---|---|---|
| دیروحرم | مندراورکعبہ،کفراوراسلام | نقشبند | صورت گر |
| فغاں | فریاد | رستخیز | قیامت |
| کعبہ وسومنات | تمام اسلامی اورکفر کے حلقے | گاہ | کبھی |
| توہمات | جمع توہم کی،وسوسے | شک فاش کرنا | ظاہرکرنا |
| کج روہ: | ٹیڑھا چلنے والے | ہنگامہ ہائے شوق | تمناؤں یا آرزوؤں کے ہنگامے |
| لامکاں | اوپرکی دنیا،عالم قدس | صبحِ ازل | جب یہ کائنات تخلیق کی گئی |
| حرفِ شیریں | میٹھا یعنی عمدہ لفظ | ترجماں | ترجمانی کرنے والا |
| کوکب | ستارہ،مرادانسان | تابانی | چمک |
| آدمِ خاکی | انسان | زیاں | نقصان |
| گیسو | زلفیں | تاب دار | چمکدار،بل کھاتی ہوئی،دلکش |
| قلب ونظر | دل اورنظر | حجاب میں ہونا | پردے میں ہونا |
| آشکارکرنا | ظاہرکرنا | محیطِ بےکراں | وسیع سمندر |
| آب جو | ندی | صدف | سیپی |
| خزف | ٹھیکری | گوہرشاہوار | بادشاہوں کےلائق موتی |
| نغمۂ نوبہار | تازہ بہارکانغمہ | دمِ نیم سوز | جلاہوادل(خودشاعرِمشرق) |
| کارِجہاں | اس دنیاکےمعاملے | روزِحساب | قیامت کادن |
| دفترِعمل | وہ کتاب جس میں انسان کے نیک اور برے اعمال درج ہوں | داد | تعریف |
| طالب | مانگنےوالا | مشتِ خاک | مٹھی بھرمٹی |
| صرصر | آندھی | لذتِ ایجاد | مرادہےخداکااس کائنات کوپیدا کرنےکاشوق |
| ہوائے چمن | چمن کی ہوا،فضا | خیمۂ گل | پھول کاخیمہ |
| جفاطلبی | سخت کوشی | مقامِ شوق | عشق کی منزل |

| | | | |
|---|---|---|---|
| قدس | مرادفرشتے | زندگیِ مستعار | عارضی زندگی |
| پائیدار | مضبوط | ناپائیدار | فانی |
| اجل | موت | تپش | حرارت،گرمی |
| تب وتاب | چمک | یک نفسی | ایک پل |
| شعلہ | تیزلو، بھڑکتی ہوئی آگ | بےمحل | بےموقع |
| شرار | چنگاری | جاوداں | ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا |

(الفاظ ومعانی ماخوذ ازکلیاتِ اقبال ازعبدالحمید یزدانی،شرح ومفاہیم ماخوذ ازشرح بالِ جبریل از یوسف سلیم چشتی)

## 13.18: کتب برائے مطالعہ

۱۔ 'بالِ جبریل مع شرح'،از یوسف سلیم چشتی

۲۔ 'کلیاتِ اقبال'،مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی

۳۔ 'غبارے از جہانِ اقبال'،ازتوقیراحمد خاں

# بلاک 5 : اقبال کی نثر

## اکائی 14: اقبال کی نثری خدمات (خطبات و خطوط کے حوالے سے)

## بلاک 5 کا تعارف

اکائی 14: ''اقبال کی نثری خدمات (خطبات وخطوط کے حوالے سے)'' پر مبنی ہے۔ اس اکائی میں علامہ اقبال کی نثری تخلیقات (خصوصاً مکتوب نگاری) کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

# اکائی 14:اقبالؔ کی نثری خدمات (خطبات وخطوط کے حوالے سے)

ساخت

14.1: اغراض ومقاصد

14.2: تمہید

14.3: اقبالؔ کی نثری خدمات خطوط کے حوالے سے

14.4: اقبالؔ کی خطوط نویسی:ایک تعارف

14.5: اقبالؔ کے ایک خط کا تنقیدی مطالعہ

14.6: آپ نے کیا سیکھا؟

14.7: اپنا امتحان خود لیجئے

14.8: سوالات کے جوابات

14.9: فرہنگ

14.10: کتب برائے مطالعہ

## 14.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- اقبالؔ کی نثری تحریروں کا تعارف کرا سکیں گے۔
- اقبالؔ کی نثری تحریر سے واقف ہوں گے۔
- اقبالؔ کے نثری طرزِ تحریر سے آگاہ ہوں گے۔
- فکرِ اقبالؔ سے متعارف کرانا سیکھیں گے۔
- مکاتیب کے اُسلوب نگارش کو سمجھا سکیں گے۔
- فکرِ اقبالؔ میں نثر کا کردار سمجھ سکیں گے۔
- اقبالؔ کی فکر میں شعر اور نثر دونوں کا موازنہ کرنا سیکھیں گے۔

## 14.2 تمہید

علامہ اقبالؔ ایشیا کے ممتاز مفکر اور فلسفی شخص ہیں۔ان کی ہستی عالمِ مشرق خصوصاً برصغیر ہندو پاک کے لئے باعثِ فخر ہے۔زیادہ تر دنیا خصوصاً عام لوگ اقبالؔ کو شاعر کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اقبالؔ جتنے بڑے شاعر ہیں، اس سے کم بڑے نثر نگار، ادیب بھی نہیں ہیں۔ان کا جتنا سرمایہ شاعری میں موجود ہے، اتنا ہی سرمایہ نثر میں بھی موجود ہے۔ان کا پی.ایچ.ڈی.تھیسس جو میونخ یوری ورسٹی، جرمنی میں جمع ہوا، انگریزی نثر ہی میں لکھا گیا۔اسی پر اقبالؔ کو پی.ایچ.ڈی.کی ڈگری تفویض کی گئی۔اس کے چھ خطبات 'Six Lectures' کے نام سے مختلف اوقات میں دیے گئے لکچرس ہیں۔بعد میں سات لکچرس کا مجموعہ 'تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' (The Reconstruction of Religious Thought in Islam) کے عنوان سے شائع ہوئے۔یہ نہایت دقیق موضوعات پر دیے گئے فلسفیانہ خطبات ہیں جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔اس کے ساتھ موقعہ بہ موقعہ مختلف مضامین اخبارات و رسائل شائع ہوئے اور اُردو میں مضامینِ اقبالؔ کے نام سے جمع کیے گئے اور بہت سے انگریزی میں لکھے گئے تھے جو "Letters & Writings of Iqbal" کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔اس کے علاوہ علامہ اقبالؔ نے بہت سے خطوط اپنے احباب، اساتذہ اور دنیا کی معروف ہستیوں کے نام لکھے یہ خطوط زیادہ تر خط کے جواب میں لکھے گئے ہیں، جن میں مولانا محمد علی جوہر، پنڈت جواہر لال نہرو، گاندھی جی، سر راس مسعود (سرسید احمد خاں کے پوتے)، کے.جی.سیدین (حالیؔ کے پر پوتے اور ابوالکلام آزاد کے تعلیمی مشیر) اور مسٹر جناح وغیرہ کے نام خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔اقبالؔ نے جن حضرات کے نام خطوط لکھے، اکثر خطوط انھیں کے نام سے کتابی شکل میں چھپے۔جیسے 'مکتوباتِ اقبال بنام خان نیاز الدین خاں'، 'خطوط اقبالؔ بنام جناح' وغیرہ۔لوگوں کے نام لکھے گئے خطوط کے مجموعوں کی تعداد تقریباً 27 ہے۔لیکن اُردو زبان میں لکھے گئے تمام خطوط کو سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ نے تاریخی ترتیب سے جمع کیا اور ان کو تقریباً ہزار ہزار صفحات کی چار جلدوں میں اردو اکادمی، دہلی نے 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال' کے نام شائع کیا۔'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال' کی ان چاروں جلدوں میں اقبالؔ کے خطوط کی تعداد 1524ء ہے۔اس کے علاوہ اور بھی نئے خطوط دریافت ہوتے رہتے ہیں۔عالمی ہستیوں کے نام اہم مسائل پر لکھے گئے خطوط انگریزی میں ہیں، جن کی تعداد تقریباً ڈھائی سو (250) ہے۔اسے پروفیسر توقیر احمد خاں تاریخی اعتبار سے مرتب کر رہے ہیں اور 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال جلد پنجم (انگریزی)' کا یہ نادر و نایاب مجموعہ جلد ہی شائع ہو کر منظر عام پر آئے گا۔یہاں ہم اقبالؔ کی نثر کے تعلق سے اقبالؔ کے بعض نہایت اہم ادبی اور علمی خطوں کا مطالعہ کریں گے۔

## 14.3: اقبالؔ کی نثری خدمات خطوط کے حوالے سے

(1)

1905ء

مخدوم ومکرم مولوی صاحب، السلام علیکم

آپ سے رخصت ہوکر اسلامی شان وشوکت کے اس قبرستان میں پہونچا جسے دہلی کہتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر خواجہ سیّد حسن نظامی اور شیخ نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے شیخ صاحب موصوف کے مکان پر قیام کیا۔ ازاں بعد حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر حاضر ہوا اور تمام دن وہیں بسر کیا۔

اللہ اللہ، حضرت محبوب الٰہیؒ کا مزار بھی عجیب جگہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دہلی کی پُرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔ شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالبؔ مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنجِ معانی مدفون ہے، جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔ حسن اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام کا تھا، اس ظالم نے مزار کے قریب بیٹھ کر

دل سے تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی

کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہوگئیں بالخصوص جب اس نے یہ شعر پڑھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے۔

اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں، مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے پر فاتحہ پڑھا۔ داراشکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں سے ''ہوالموجود'' کی آواز سُنی اور دہلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوا جو صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔

2 ستمبر کی صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہوکر بمبئی کو روانہ ہوا اور 4 کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل میں پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں۔ مگر میں نے ٹامس کک کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربہ سے معلوم کیا کہ یہ ہوٹل ہندوستانی طلبا کے لئے جو ولایت جارہے ہوں نہایت موزوں ہے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے قریب ہے۔ گھاٹ یہاں سے قریب ہیں۔ ٹامس کک کا دفتر یہاں سے قریب ہے۔ غرض کہ ہر قسم کا آرام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہر کے باقی تمام

ہوٹلوں کی نسبت ارزاں ہے۔صرف تین روپیہ یومیہ دواور ہر قسم کا آرام حاصل کرلو۔ یہاں کا منتظم ایک پارسی پیر مرد ہے جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے وخشور (نبی) یاد آجاتے ہیں۔دکان داری نے اس کو ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علماء میں باوجود عبادت اور مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا۔کارلائل نے کیا خوب کہا ہے:

''محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے''

میرے دل پر اس پیر مرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی تھی کہ بعض اوقات اُسے دیکھ کر میری آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں لیکن جب اُس کی وقعت میرے دل میں اندازہ سے زیادہ ہوگئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا بیان بعض وجوہ سے ضروری ہے۔میں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیر مرد کمرے سے باہر نکلا۔ اُس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی۔جب اُس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اُس کو چھپانے کی کوشش کی اور میں نے دُور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب ہم سے کیوں چھپاتے ہو،خوشی سے اِس کا شوق کرو۔ذرا مسکرا دیا اور کچھ پیئے ہوئے بھی تھا بولا:

''سرابِ شوک پینے سے سبھی گم دور ہو جائے''

میں نے سن کر کہا وارے بُڈھے خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوۂ نورس پیدا ہوکر بمبئی کی کھیت باڑی میں بکتا پھرے۔

اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آکر مقیم ہوا جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بولتا تھا۔میں نے ایک روز اُس سے پوچھا:''تم کہاں سے آئے ہو؟''بولا:''چین سے آیا ہوں،اب ٹرانسواں جاؤں گا۔''میں نے پوچھا:''چین میں تم کیا کرتے تھے؟'' کہنے لگا:''سوداگری کرتا تھا لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے۔''میں نے سُن کر دل میں کہا ہم ہندیوں سے تو یہ افیمی ہی عقل مند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں۔شاباش افیمیو شاباش! نیند سے بیدار ہو جاؤ۔ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ہاں ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو از سرِ نو قائم کرنے میں تمہاری مدد کرسکیں گے۔ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ہمارے ملک میں محبت اور مروّت کی بو باقی نہیں رہی۔ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں۔کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں! مولوی صاحب، میں بے اختیار ہوں۔لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے۔کیا کروں؟ اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات مجھے مجنون سا کر دیا اور کر رہا ہے۔

ایک شب میں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آبیٹھے۔شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یورپین ہیں۔فرانسیسی میں بات کرتے تھے۔آخر جب کھانا کھا کر اُٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی

نکال کر پہنی جس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے۔ میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کس طرح ان سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں۔ یورپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا۔ میں نے پوچھا فارسی جانتے ہو۔ بولا بہت کم۔ پھر میں نے فارسی میں اس سے گفتگو شروع کی۔ لیکن وہ نہ سمجھتا تھا آخری بہ مجبوری ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں۔

یہ نوجوان ترک ینگ ٹرک پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف ہے۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ۔ کہنے لگا میں کمال بے (ترکی کا سب سے بڑا مشہور زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولی ٹیکل معاملات پر لکھا کرتا ہوں۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے سب کے سب نہایت عمدہ تھے لیکن جو شعر اپنے سنائے وہ سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے۔ اُن میں سے ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں:

ظلم و جورن تو سفوجہ بر ملّتے محوا یلیور　　آدمیت ملک و ملّت دشمنِ عبدالحمید

یعنی کبیر ظلم و جور نے تمام قوم کو مٹا دیا ہے۔ عبدالحمید آدمیت اور ملک و قوم سب کا دشمن ہے۔

اس مضمون پر اُس سے بہت گفتگو ہوئی اور میں نے اُسے بتایا کہ ینگ پارٹی کو انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اُٹھانا چاہیے، کیوں کہ جس طریق سے رعایائے انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولی ٹیکل حقوق حاصل کیے، وہ طریق سب سے عمدہ ہے۔ بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت وخون کے ہو جانا یہ کچھ خاکِ انگلستان ہی کا حصہ ہے۔ ایک روز سرِ شام میں اور یہ ترک جنٹلمین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ وہاں اسکولوں کی گراؤنڈ میں مسلمان طلبا کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ہم نے اُن سے ایک کو بلایا اور اسکول کے متعلق بہت سی باتیں اس سے دریافت کیں۔ میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس اسکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی۔ کیا فنڈ نہیں یا اور کوئی وجہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایک آن میں موجود ہو سکتا ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول سوداگر موجود ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلباء پڑھنے کے لئے نہیں آتے۔ اس کے علاوہ اور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں اور جیسی تعلیم ان میں ہوتی ہے ویسی سردست ہم یہاں دے بھی نہیں سکتے۔ یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا۔ میرا خیال تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہوگا کیوں کہ یہاں کے مسلمان تموّل میں کسی اور قوم سے پیچھے نہیں ہیں لیکن آ کر معلوم ہوا کہ تموّل کے ساتھ اُن میں عقل بھی ہے، ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں۔ ہر چیز کو تجارتی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نفع و نقصان پر ہر پہلو سے غور کر لیتے ہیں۔

غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجب شہر ہے۔ بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سر بفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو

جاتا ہے۔ یہاں ہر چیز مل سکتی ہے۔ یورپ امریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کرو فوراً ملے گی، ہاں البتہ ایک ایسی چیز ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی یعنی فراغت۔

یہاں پارسیوں کی آبادی اسّی نوّے ہزار کے قریب ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر ہی پارسیوں کا ہے، اس قوم کی صلاحیت نہایت قابل تعریف ہے اور ان کی دولت وعظمت بے اندازہ۔ مگر اس قوم کے لئے کسی اچھی فیوچر (Future) کی پیشین گوئی نہیں کرسکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔ علاوہ اس کے نہ کوئی ان کی زبان ہے اور نہ ان کا لٹریچر ہے اور طرّہ یہ کہ فارسی کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افسوس! یہ لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں۔ ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے بلکہ زردشتی رنگ اس کے رگ وریشے میں ہے اور اسی پر اس کے حسن کا دارومدار ہے۔ میں نے اسکول کے پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا۔ چستی کی مورتیں تھیں مگر تعجب ہے کہ ان کی خوب صورت آنکھیں اسّی فی صدی کے حساب سے عینک پوش تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عینک پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہوتا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کے قومی ریفارمر اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔ اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا حجام ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔ گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا۔ نوروجی دادا بھائی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: ''نوروجی انگلستان میں کیا کرتا ہے؟'' بولا: ''حق رکالوں کے لئے لڑتا ہے۔'' ہوٹل کے نیچے مسلمان دکاندار ہیں، میں نے دیکھا ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے۔ میں نے ایک روز ان سے پوچھا تم اُردو پڑھ سکتے ہو۔ کہنے لگے سمجھ سکتے ہیں، پڑھنا نہیں جانتے۔ میں نے پوچھا کہ جب مولوی تمہارے نکاح پڑھاتا ہے تو کون سی زبان بولتا ہے۔ مسکرا کر بولا: اُردو، یہاں پر ہر کوئی اُردو سمجھ سکتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کا سیٹھ (وہی بوتل والا پیر مرد) کبھی ہندوستان نہیں گیا، مگر اُردو خاصی بولتا تھا۔

میں بمبئی یعنی بابِ لندن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں، خدا جانے لنڈن کیا ہوگا، جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے۔ اچھا دیدہ خواہد شد، 7 ستمبر کو 2 بجے ہم وکٹوریہ ڈاک (گھاٹ) پر پہونچے جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں۔ اللہ اکبر! یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ کئی طرح کے جہاز اور سینکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر سے کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈر۔ خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح وسلامت منزلِ مقصود پر پہونچا دیں گے۔ خیر طبی معائنہ کے بعد میں اپنے جہاز پر سوار ہوا۔ لالہ دھنپت رام وکیل لاہور اور ان کے ایک دوست ڈاکٹر صاحب اس روز حسنِ اتفاق سے ممبئی میں تھے، میں ان کا نہایت سپاس گزار ہوں کہ یہ دونوں صاحب مجھے رخصت کرنے کے لئے ڈاک پر تشریف لائے۔ بہت سے اور لوگ بھی جہاز پر سوار ہوئے اور اُن کے

دوستوں اور رشتہ داروں کا ایک ہجوم ڈاک پر تھا۔ کوئی تین بجے جہاز نے حرکت کی اور ہم اپنے دوستوں کو سلام کہتے اور رومال ہلاتے ہوئے سمندر پر چلے گئے، یہاں تک کہ موجیں اِدھر اُدھر سے آ آ کر ہمارے جہاز کو چومنے لگیں۔ فرانسیسی قوم کا مذاق اس جہاز کی عمدگی اور نفاست سے ظاہر ہے ہر روز صبح کو کئی آدمی جہاز کی صفائی میں مصروف رہتے ہیں اور ایسی خوبی سے صفائی کرتے ہیں کہ ایک تنکا تک جہاز پر نہیں رہنے دیتے۔ ملازموں میں مصر کے چند حبشی بھی ہیں جو مسلمان ہیں اور عربی بولتے ہیں۔ جہاز کے فرانسیسی افسر نہایت خوش خُلق ہیں اور ان کے تکلفات کو دیکھ کر لکھنؤ یاد آ جاتا ہے۔ ایک روز ایک افسر تختۂ جہاز پر کھڑا تھا کہ ایک حسین عورت کا اُدھر سے گذر ہوا، اتفاق سے یا غالباً اِرادۃً یہ عورت اس افسر کے شانے پر ہاتھ رکھتی ہوئی گذری۔ ہمارے نوجوان افسر نے اس توجہ کے جواب میں ایک ایسی ادا سے جنبش کی کہ ہمارے ملک کے حسین بھی اُس کی نقل نہیں اتار سکتے۔

کھانے کا انتظام بھی نہایت قابل تعریف ہے۔ میز بھی فرانسیسی تکلف کی گواہی دے رہا ہے مگر اس جہاز پر ہم ہندوستانیوں کے لئے ایک بڑی دقت ہے اور وہ یہ کہ جہاز کے تقریباً سب مسافر فرانسیسی بولتے ہیں۔ انگریزی کوئی نہیں جانتا جہاز کے تمام ملازم فرانسیسی بولتے ہیں اور بعض اوقات اُن کو اپنا مطلب سمجھانے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اگرچہ فرانسیسی جہازوں میں ہر طرح کی آسایش ہے۔ تاہم میری رائے یہی ہے کہ ہم لوگوں کو انگریزی کمپنیوں کے جہازوں میں سفر کرنا چاہئے۔ ان کے مسافر سب کے سب انگریزی داں ہوتے ہیں اور علاوہ اس کے مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جہاز پر بڑی رونق ہوتی ہے۔ ہمارے اِس جہاز میں ساٹھ سے زیادہ مسافر نہیں ہیں۔

ہم لوگ رات کو اپنے اپنے کمروں میں سوتے ہیں اور صبح سے شام تک تختۂ جہاز پر کرسیاں بچھا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی پڑھتا ہے۔ کوئی باتیں کرتا ہے۔ کوئی پھرتا ہے۔ کیبن میں جہاز کی جنبش کی وجہ سے طبیعت بہت گھبراتی ہے مگر تختۂ جہاز پر بہت آرام رہتا ہے۔ میرے تمام ساتھی دوسرے ہی روز مرضِ بحری میں مبتلا ہو گئے مگر الحمدللہ کہ میں محفوظ رہا۔ مجھ سے اکثروں نے دریافت کیا کہ کیا تم نے پہلے بھی بحری سفر کیا ہے۔ جب میں نے جواب دیا کہ نہیں تو وہ حیران ہوئے اور کہا کہ تم بڑے مضبوط آدمی ہو۔ بمبئی سے ذرا آگے نکل کر سمندر کی حالت کس قدر متلاطم تھی۔ خواجہ خضر صاحب کچھ خفا سے معلوم ہوتے تھے۔ اتنی اتنی اونچی موجیں آتی تھیں کہ خدا کی پناہ! دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ ایک شب ہم کھانا کھا کر تختۂ جہاز پر آ بیٹھے۔ کچھ عرصے کے بعد سمندر کی سرد ہوا نے ہم سب کو سلا دیا، مگر دفعتاً ایک خوفناک موج نے اُچھل کر ہم پر حملہ کیا اور تمام مسافروں کے کپڑے بھیگ گئے۔ عورتیں بچّے اور مرد نیچے بھاگ کر اپنے اپنے کمروں میں جا سوئے اور ہم تھوڑی دیر کے لئے جہاز کے ملازموں اور افسروں کے تمسخر کا باعث بنے رہے۔ رستے میں ایک آدھ بارش بھی ہوئی جس سے سمندر کا تلاطم نسبتاً بڑھ گیا اور طبیعت اس نظارے کی یکسانیت سے اُکتانے لگی۔ سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے اور موجیں جو زور سے

اُٹھتی ہیں، ان کو سفید جھاگ چاندی کی ایک کلغی سی پہنا دیتی ہے اور دُور دُور تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے سطح سمندر پر روئی کے گالے بکھیر ڈالے ہیں۔ یہ نظارہ نہایت دل فریب ہے۔ اگر اس میں موجوں کی دہشت ناک کشاکش کی آمیزش نہ ہو۔ ان کی قوت سے جہاز ایک معمولی کشتی کی طرح جنبش کرتا ہے۔ آسمان اُوپر تلے ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر آنکھیں چوں کہ اس نظارے سے کسی قدر مانوس ہوگئی ہیں اور نیز اس واسطے ہم کو بھی خوف کا احساس نہیں ہوتا۔ یورپین لڑکے لڑکیاں تختۂ جہاز پر دوڑتے پھرتے ہیں اور محسوس بھی نہیں کرتے کہ جہاز میں ہیں۔

ہمارا ایک ہم سفر پادری ہے جو جنوبی ہندوستان سے آیا ہے اب اٹلی کو جا رہا ہے۔ گذشتہ رات مجھ سے کسی نے کہا کہ فرانسیسی پادری بہت سی زبانیں جانتا ہے اور روسی زبان خوب بولتا ہے۔ میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے میرے سوال پر نہایت حیرانی ظاہر کی اور پوچھا کونٹ ٹالسٹائی کون ہے؟ مجھے یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ یہ شخص روسی زبان جانتا ہے اور کونٹ کے مشہور نام سے واقف نہیں ہے۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ جہاز پر دیا سلائی استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ تختۂ جہاز کی ایک طرف ایک کمرے کی دیوار پر پیتل کی ایک انگیٹھی سی لگا رکھی ہے جس میں چند لکڑیاں آگ لگا کر رکھ دیتے ہیں۔ جن لوگوں کو سگریٹ یا سگار دودی کرنا ہو، اس انگیٹھی سے ایک لکڑی اُٹھا لیں۔

جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوتِ لامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدّنی اور روحانی فوائد ہیں، ان سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے، جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ شارع اسلام کی ہر بات قربان ہو جانے کے قابل ہے۔

**بأبی اَنْتَ وَ اُمّی یا رسولَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم**

آج 12 ستمبر کی صبح ہے۔ میں بہت سویرے اٹھا ہوں۔ جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں۔ چراغوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے۔ آفتاب چشمۂ آب میں سے اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسا ہمارا دریائے راوی۔ شاید صبح کے پُر تاثیر نظارے نے اس کو سمجھا دیا کہ سکونِ قلب بھی ایک نایاب شئے ہے۔ ہر وقت کی الجھن اور بے تابی اچھی نہیں۔ طلوعِ آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دِل کے لئے تلاوت کا حکم رکھتا ہے۔ یہی آفتاب ہے جس کے طلوع و غروب کو میدان میں ہم نے کئی دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں سمندر میں اس کی کیفیت ایسی ہے کہ:

نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

حقیقت میں جن لوگوں نے آفتاب پرستی کو اپنا مذہب قرار دے رکھا ہے، میں ان کو قابلِ معذوری سمجھتا ہوں۔ ناسخ مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں:

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھئے تصویر کس کی ہے ورقِ آفتاب میں

کوئٹے کے ڈپٹی کمشنر صاحب جو اٹھارہ ماہ کی رخصت لے کر ولایت جا رہے ہیں اور وہ پادری صاحب جو ٹالسٹائی کے نام سے ناواقف معلوم ہوتے تھے، اس وقت جہاز کی اوپر کی چھت پر کھڑے اس نظارے کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ یہ پادری صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ ان میں ایک خاص ہنر ہے اور وہ یہ کہ ہر کسی کو باتوں میں لگا لیتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں مگر بہت شکستہ اور مجھ کو جب بلاتے ہیں تو ٹالسٹائی کے نام سے۔ کل مجھ سے پوچھتے تھے تم ہندوستان کا ٹالسٹائی بننا چاہتے ہو۔ میں نے جواب دیا ٹالسٹائی بن جانا آسان نہیں ہے۔ زمین سورج کے گرد لاکھوں چکر لگاتی ہے، تب جا کر کہیں ایک ٹالسٹائی پیدا ہوتا ہے۔ کوئٹہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب بڑے باخبر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کل رات اُن سے ہندوستان کے پولی ٹیکل معاملات پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ عربی اور فارسی جانتے ہیں۔ سر ولیم میور تصانیف کے متعلق گفتگو ہوئی تو کہنے لگے کاش یہ شخص ذرا کم متعصب ہوتا۔ عمر خیّام کے بڑے مداح ہیں مگر میں نے ان سے کہا کہ اہل یورپ نے ابھی سحابی نجفی کی رباعیات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ عمر خیّام کو کبھی کے فراموش کر گئے ہوتے۔

اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحل عرب کے تصوّر نے جو ذوق وشوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے، اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منوّر کروں:

اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرو خورشید بھی گیا تو اُدھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین، تجھ کو مبارک ہو؛ تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے ردّ کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدّن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی! باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پرواہ نہ کی۔ مگر اے پاک سرزمین، تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذرّوں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اُڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفّارہ ہو! کاش میں تیرے صحراؤں میں لُٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں

کی پروانہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔

از عدن مورخہ 12 ستمبر

راقم محمدؐ اقبال

(2)

29 نومبر 1920ء

مجھے بے حد افسوس ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر اس وقت ضروری نہیں۔ اُن حضرات کی آواز پر جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے، لبیک کہنا میرے لئے مشکل ہے۔ اگرچہ میں قومی تعلیم کے شدید حامیوں میں سے ہوں لیکن ایک تو یونیورسٹی کی رہنمائی کے لئے مجھ میں وہ صلاحیتیں نہیں ہیں جو مختلف کشمکشوں اور رقابتوں کی صورت میں عموماً ابتدائی مراحل میں پیدا ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ فطری طور پر مَیں پُرسکون حالت ہی میں کام کرسکتا ہوں۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ ہم جن حالات سے دوچار ہیں، ان میں سیاسی آزادی سے قبل معاشی آزادی ضروری ہے اور معاشی اعتبار سے ہندوستانی مسلمان دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں۔ بنیادی طور پر انھیں ادب اور فلسفہ کی نہیں بلکہ تکنیکاتی تعلیم کی ضرورت ہے۔ جن حضرات نے جامعہ ملیہ قائم کی ہے، انھیں چاہیے کہ اس نئے ادارے میں خصوصی طور پر طبعی علوم کے تکنیکاتی پہلو پر زور دیں اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کریں۔

اس میں شبہ نہیں کہ عالمِ اسلام بالخصوص عرب ملکوں اور مقدس مقامات میں جو واقعات پیش آئے، ان کے پیش نظر کسی نہ کسی قسم کا عدم تعاون اختیار کرنے میں وہ حق بہ جانب ہیں۔ لیکن تعلیم کا مذہبی پہلو میرے ذہن میں ہنوز غیر واضح ہے اور میں نے اس مسئلہ پر مکمل غور کرنے کے لئے اپنی تجاویز شائع کر دی ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں شریعت کا ماہر نہیں ہوں۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ جہاں تک تعلیم کا سوال ہے، موجودہ مجبوریوں کے باوجود فقہ اسلامی ہماری مناسب رہنمائی کرنے سے معذور نہیں۔

(انگریزی سے ترجمہ)

(3)

لاہور 12 دسمبر 1936ء

جناب من! معترض.....

قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اسلامی تصوف میں مسئلہ خودی کی تاریخ اور نیز

میری تحریروں سے ناواقف محض ہے۔ موخرالذکر صورت میں مَیں اسے معذور جانتا ہوں۔ آخر اس غلامی کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس کون سا ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی آئندہ نسلوں کو اسلامی تصورات کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ سے آگاہ کرسکیں۔ غلام قومیں مادیات کو روحانیت پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہوجاتی ہیں اور جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہوجاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتی ہیں، جس کا مقصد قوتِ نفس اور رُوحِ انسانی کا ترفع ہو۔

(۲) اعتراض کا جواب آسان ہے۔ دینِ اسلام جوہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے ہر شئے پر مقدم ہے۔ نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔ خودی خواہ مسولینی کی ہو، خواہ ہٹلر کی قانون الٰہی کی پابند ہوجائے تو مسلمان ہوجاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہرحال حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کرجائیں کہ خودی کے پرائیوٹ امیال وعواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہوجائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے۔ بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے۔ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ ویدانت اور بُدھ مت کے زیر اثر کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدہ کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔

(۳) معترض کا یہ کہنا کہ اقبالؔ اس دورِ ترقی میں جنگ کا حامی ہے، غلط ہے۔ میں جنگ کا حامی نہیں ہوں، نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدودِ معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہوسکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے، مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم)۔ دوسری صورت میں جس میں جہاد کا حکم ہے، ۹:۴۹ میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیزیں جس کو سیموئل ہور جمعیتِ اقوام کے اجلاس میں Collective Security کہتا ہے قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے۔ اگر گزشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین قرآن پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمعیتِ اقوام کے بنے ہوئے آج کئی صدیاں گزر گئی ہوتیں۔ جمعیتِ اقوام جو زمانہ حال میں بنائی گئی ہے، اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو،

امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جو ع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا دینِ اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ہذا القیاس، دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔

(۴) شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ (i) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (ii) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ (iii) بلند پرواز ہے۔ (iv) خلوت پسند ہے۔ (v) تیز نگاہ ہے۔

آپ کے خط کا جواب حقیقت میں طویل ہے لیکن افسوس کہ میں طویل خط لکھنا تو درکنار معمولی خط و کتابت سے بھی قاصر ہوں۔

محمدؐ اقبال

## (4)

لاہور 12/مارچ 1937ء

جناب من!

میری آنکھوں میں پانی اترنے کے آثار ہیں۔ ڈاکٹر لکھنے پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ جب تک آپریشن نہ ہو جائے۔ معاف کیجئے گا، یہ خط اپنے ایک دوست سے لکھوا رہا ہوں۔

آپ کے دل میں جو باتیں پیدا ہوئی ہیں، ان کا جواب بہت طویل ہے اور میں بحالتِ موجودہ طویل خط لکھنے سے قاصر ہوں۔ اگر میں کبھی علی گڑھ حاضر ہوا یا آپ کبھی لاہور تشریف لائے تو اِن شاءاللہ زبانی گفتگو ہوگی۔ سردست میں دو چار باتیں عرض کرتا ہوں۔

(۱) میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانۂ حال کے اور اِزم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوعِ انسان کے لئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے۔ میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ کریں تو ممکن ہے کہ آپ انھیں نتائج تک پہنچیں، جن تک میں پہنچا ہوں۔ اس صورت میں غالباً آپ کے شکوک تمام کے تمام رفع ہو جائیں۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کا View مجھ سے مختلف ہو یا آپ خود دینِ اسلام کے حقائق کو ہی ناقص تصوّر کریں۔ اس دوسری صورت میں دوستانہ بحث ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ معلوم نہیں کیا ہو۔

(۲) آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرے کلام کا بھی بالاستعیاب مطالعہ نہیں کیا۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو میں آپ کو یہ دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس طرف بھی توجہ کریں کیوں کہ ایسا کرنے سے بہت سی

باتیں خود بخود آپ کی سمجھ میں آجائیں گی۔

(۳) مسولینی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے۔اس میں آپ کو تناقص نظر آتا ہے۔آپ درست فرماتے ہیں لیکن اگر اس بندۂ خدا میں Devil اور Saint دونوں کے خصوصیات جمع ہوں تو اس کا میں کیا علاج کروں۔مسولینی سے اگر کبھی آپ کی ملاقات ہوتو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے جس کو شعاعِ آفتاب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔کم ازکم مجھ کو اسی قسم کا احساس ہوا۔

(۴) آپ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیکچرار ہیں۔اس واسطے مجھے یقین ہے کہ لٹریچر کے اسالیب بیان سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔تیمور کی روح کو اپیل کرنے سے تیموریت کو زندہ کرنا مقصود نہیں بلکہ وسط ایشیا کے ترکوں کو بیدار کرنا مقصود ہے۔تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوبِ بیان ہے۔ایسے اسالیب بیان کو شاعر کا حقیقی View تصوّر کرنا کسی طرح درست نہیں۔ایسے اسالیب کی مثالیں دنیا کے ہر لٹریچر میں موجود ہیں۔والسلام

آپ کا مخلص محمدؐ اقبال

## اقبالؔ کی خطوط نویسی: ایک تعارف

علامہ اقبالؔ سلام کے خط کا جواب دینا بھی واجب سمجھتے تھے،اس لئے خط ملتے ہی اس کا جواب فوراً تحریر فرماتے۔یہ خط علامہ اقبالؔ نے 12/دسمبر 1936ء کو تحریر کیا۔اس خط کے مکتوب الیہ پروفیسر ظفر احمد صدیقی ہیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے پروفیسر وصدر تھے۔انھیں معلوم ہوا کہ علی گڑھ کے ایک صاحب نے اقبالؔ کے کلام اور فکر پر تنقید کی ہے تو اس کی اطلاع میں انھوں نے اقبالؔ کو لکھ بھیجا کہ فلاں شخص آپ کے بارے میں یہ کہتا ہے۔ظفر احمد صدیقی سے علامہ اقبال کے دوستانہ مراسم تھے اور شعبۂ فلسفہ علی گڑھ میں اکثر آتے رہتے تھے۔اقبالؔ کو جب ظفر احمد صدیقی کا خط ملا تو انھوں نے یہ جواب لکھ بھیجا جو اوپر مذکور ہوا ہے۔ویسے اقبالؔ کی نثر نہایت شستہ،سادہ اور تکلف سے پاک ہوتی ہے۔جملے سیدھے سادے اور قابلِ فہم ہوتے ہیں۔الفاظ مروج اور معنی خیز ہوتے ہیں۔خط لکھتے وقت القاب وآداب کا لحاظ رکھتے ہیں۔جب کسی کو خط لکھتے ہیں،اسے اچھے الفاظ سے یاد کرتے۔مثلاً مکرم بندہ،مخدومی وغیرہ اور نام پورا اور عزت کے ساتھ لکھتے ہیں۔مثلاً خان نیاز الدین خاں صاحب۔نام کے ساتھ کا لاحقہ ضرور استعمال کرتے ہیں۔خط اکثر اپنے لیٹر ہیڈ پر لکھتے ہیں ورنہ خط میں اوپر کی طرف اپنا پتہ ضرور لکھتے ہیں۔مثلاً ''شیش محل بھوپال''وغیرہ۔خط شروع کرنے سے پہلے سلام دعا کے بعد اکثر یہ لکھتے ہیں۔

آپ کا خط ابھی ابھی ملا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

اسی طرح خط کے آخر میں دو جملے ضرور لکھتے ہیں۔

باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ مخلص

سب سے آخر میں اپنا نام پورا لکھتے تھے۔ مثلاً محمد اقبال لاہور۔

## 14.5: اقبالؔ کے خطوط کا تنقیدی مطالعہ

اقبالؔ کے خطوط اُن کی شاعری، مضامین، خطبات اور بیانات کی طرح تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ عالمی فلسفہ اور دانش وری کے علاوہ یہ خطوط عالم مشرق یعنی ایشیائی افکار سے مملو ہیں اور خصوصی طور پر عمرانی نقطۂ نگاہ سے نہایت اہم ہیں۔ اقبالؔ کا ایک ایک لفظ اپنی اہمیت کا حامل ہے لیکن میں یہاں اُن کے چار خطوں کے مفاہیم کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں ایک خط مہاتما گاندھی کے نام ہے۔ جب علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو گاندھی جی نے ایک خط علامہ اقبالؔ کو لکھا کہ ''مسلم نیشنل یونیورسٹی آپ کو پکار رہی ہے۔ اگر آپ اس کا چارج لے سکیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کی مہذب رہبری کے سایہ میں پھلے پھولے گی۔ حکیم جی اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری اور بلاشبہ علی برادران کی یہ خواہش ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جواب کے لئے آپ آمادہ ہوں۔ آپ کے اخراجات بہ آسانی فراہم کیے جاسکیں گے۔ براہِ کرم اس کا جواب پنڈت نہرو (موتی لال نہرو) کی معرفت الٰہ آباد کے پتہ پر دیں۔'' تو اقبالؔ نے اس کا جواب دیا جو 29/نومبر 1920ء کو لکھا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ''آپ کے خط کا شکریہ جو پرسوں مجھے ملا ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں ان حضرات کی آواز پر مثبت جواب دینے سے قاصر ہوں جن کی میں حد درجہ عزت اور احترام کرتا ہوں، بعض غیر ضروری اور فی الوقت نا قابلِ بیان وجوہات کی بنا پر۔ میں قومی تعلیم کا شدید حامی ہوں تاہم میں نہیں سمجھتا کہ یونیورسٹی کی رہنمائی کے لئے میں ان تمام صلاحیتوں کا حامل ہوں جس کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ابتدائی مراحل میں تمام قسم کی رقابتوں اور کش مکشوں مسائل پیہم سے اس نوزائیدہ ادارہ کو چلانے کا اہل ہو۔ میں فطری طور پر پُرسکون ماحول میں کام کرنے کا عادی ہوں۔ ایک اور پوائنٹ یہ بھی ہے کہ سیاسی آزادی سے قبل اقتصادی آزادی ضروری ہے اور ہندوستانی مسلم اس میں دوسری اقوام کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں۔ ان کی اصل ضرورت ادب اور فلسفہ کی تعلیم نہیں بلکہ ٹیکنیکل تعلیم ہے جو انھیں اقتصادی طور پر آزادی دے گی۔'' اس کے ساتھ علامہ اقبالؔ نے مسئلہ تعلیم کے متعلق مزید لکھا کہ ''تعلیم کا مذہبی پہلو ابھی تک میرے ذہن میں غیر واضح ہے۔ اس مکمل سوال پر واضح مباحثہ ہونا چاہئے۔ میں شریعت اسلامی کا ماہر نہیں ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ تعلیم کے سوال کے سلسلہ میں فقہ اسلامی ہماری موجودہ حدوں کے ماتحت ہماری رہنمائی کرنے میں فیل نہیں ہوگا۔'' اس طرح اور خط پنڈت جواہر لال نہرو کے نام ہے جو 21/جون 1930ء کو لکھا گیا۔ انھوں نے لکھا کہ ''جس وقت آپ کے مضمون کے جواب میں مَیں نے مضمون لکھا تھا۔ میں سمجھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویہ کا علم نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو

بھی ان کی تاریخی وجوہات کا علم نہیں ہے جس نے احمدی تعلیمات کی تشکیل کی۔اس کے علاوہ پنجاب اور دوسرے مقامات پر آپ کے مسلم مشیر یہ سمجھے کہ آپ احمدیہ تحریک کے حامی ہیں اور اس پر احمدی بہت خوش تھے۔ مجھے مذہبی علوم میں بہت کم دلچسپی ہے لیکن مجھے احمدیوں کے اصل میدان میں بھی ذرا سامنے آنا پڑا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میرا مضمون اسلام اور انڈیا کی ہمدردی میں لکھا گیا تھا۔ میرے دماغ میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ احمدی اسلام اور انڈیا دونوں کے غدار ہیں۔'' اور آج احمدی الگ کمیونٹی ہیں۔ یہ اقبالؔ کی تجویز تھی۔

اسی طرح سی فار قوہرسن کے نام خط میں فلسطین کے مسائل پر غور کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ مجھے خوشی ہے کہ آپ کی نیشنل لیگ فلسطین کے معاملہ میں گہری دلچسپی رکھتی ہے۔ یہ برطانوی لوگوں کو اس بات کا احساس دلائے گی کہ اس کے بڑے بڑے سیاسی نتائج برآمد ہوں گے۔عرب لوگوں کی دوستی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ مجھے نجف، مصر، سیریا اور عراق سے خطوط ملے ہیں۔آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کربلا اور نجف کے شیعہ حضرات نے زبردست احتجاج کیا ہے فلسطین کی تقسیم کا۔ فارسی وزیراعظم اور ترکی صدر نے بھی بیانات دیے اور احتجاج کیا۔

غرض نوع بہ نوع اقبالؔ کے خطوط معلومات کا خزانہ ہیں۔

یہ اقبالؔ کے خط لکھنے کا طریقہ تھا۔ اقبالؔ کے خطوں میں ہر قسم کے موضوعات ملتے۔ خانگی حالات، شعر و شاعری، ادب و فلسفہ، سیاست، تاریخ اور معاشرت وغیرہ۔ظفر احمد صدیقی صاحب نے جس شخص کا تذکرہ کیا، اقبالؔ نے اس کے بارے میں لکھا کہ وہ شخص قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہے اور خود اقبالؔ کی تحریروں سے واقف نہیں ہے۔انھوں نے بتایا کہ جب انسان غلامی کا عادی ہو جاتا ہے تو ایسی تعلیم کو جس کا مقصد روحِ انسانی کو بلند کرنا ہو غلامی کے سبب ناپسند کرتا ہے اور زندگی سے گریز کے بہانے تلاش کرتا ہے۔

اس خط میں دوسرے پیراگراف میں جواب دیا کہ دینِ اسلام نفس انسانی کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے حدیں مقرر کرتا ہے۔ان حدوں کے متعین کرنے کا نام شریعت ہے یا قانونِ الٰہی ہے۔اس کی مثال انھوں نے دی کہ مسولینی اور ہٹلر نے اپنے مفاد کی خاطر دنیا کو تباہ کیا، انسانوں کو غلام بنایا لیکن مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو برقرار رکھا۔ دونوں میں اتنا فرق ہے، ایک کی خودی بے لگام ہے اور دوسرے کی خودی محدود اور پابند احکامِ الٰہی ہے۔یعنی خودی کی حدیں مقرر کرنے کا نام شریعت ہے اور شریعت کو دل کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے اور جب احکام الٰہی روح خودی میں اس طرح پیوست ہو جائیں کہ خودی کی ذاتی مہربانیاں اور میلانات ختم ہو جائیں تو اور صرف اس کا مقصد رضائے الٰہی ہو جائے تو زندگی کی اس حالت کا نام بعض صوفیا نے فنا اور بعض نے بقا رکھا ہے۔لیکن ہندوستانی اور ایرانی صوفیاء نے اس کی تفسیر ویدانت اور بدھ مت کے تحت کی ہے، جس کی وجہ سے یہاں کا مسلمان بے عمل اور ناکارہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اقبالؔ

کہتے ہیں ایک طرح سے میری تمام تحریریں اس قسم کی تفسیر یعنی بے عملی کی تعلیم کے خلاف بغاوت ہیں۔علامہ اقبالؔ کے نزدیک جہدوعمل ہی کامیابی کی کنجی ہے۔جو قومیں جدوجہد کرتی ہیں وہ کامیاب ہیں اور جو بے عمل ہیں، اِن کا خاتمہ عین ممکن ہے۔عملی اعتبار سے سرگرم لوگوں کی اقبالؔ نے تعریف کی۔حتیٰ کہ انھوں نے مسولینی جیسے غارت گر کی بھی تعریف میں نظم لکھی۔

## مسولینی

ندرتِ فکر وعمل کیا شئے ہے؟ ذوقِ انقلاب ندرتِ فکر وعمل کیا شئے ہے؟ ملّت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی ندرتِ فکر وعمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب
رومتہ الکبریٰ! دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر ایں کہ می بینیم بہ بیداری است یارب یا بخواب
چشم پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ نوجواں تیرے ہیں سوز آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت، یہ تمنا، یہ نمود فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

فاشزم اور آمریت کے مخالف علامہ اقبالؔ کی زبان سے جب مسولینی جیسے فاشسٹ کی تعریف سن کر علی گڑھ کے ایک لکچرر صاحب نے اعتراض کیا تو اس کا جواب علامہ اقبالؔ نے یوں دیا۔

''مسولینی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس میں آپ کو تناقص نظر آتا ہے۔آپ درست فرماتے ہیں لیکن اگر اس بندۂ خدا میں Devil اور Saint دونوں کی خصوصیات جمع ہوں تو اس کا میں کیا علاج کروں۔مسولینی سے اگر کبھی آپ کی ملاقات ہو تو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے جس کو شعاعِ آفتاب سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں۔کم از کم مجھ کو اس قسم کا احساس ہوا۔''

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب 1931ء میں اقبالؔ اٹلی کے دورے پر تھے تو مسولینی نے اقبالؔ کو خط لکھا کہ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔جب اقبالؔ کی ملاقات مسولینی سے ہوئی تو بہت سے سیاسی معاملات پر گفتگو ہوئی۔یہ احساسات وخیالات اسی وقت کے ہیں۔

اس خط کے تیسرے حصے میں اقبال نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اقبالؔ اس دورِ ترقی میں جنگ کے حامی ہیں۔انھوں نے لکھا کہ میں جنگ کا حامی نہیں ہوں اور نہ کوئی مسلمان شریعت کے قوانین یعنی فقہ اسلامی کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہوسکتا ہے۔کیوں کہ قرآن میں صرف دو طرح کی جنگ کی صورتیں ہیں۔ایک

محافظانہ یعنی جب مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے تو مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے مگر یہ حکم نہیں ہے۔ دوسری صورت مصلحانہ ہے کہ اسلام میں باہمی مفاہمت کی خاطر جنگیں ہوئیں اور مفاہمت ہوئی، جنگ کی ان دو صورتوں کے علاوہ میں کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ زمین کی بھوک کی خاطر جنگ کرنا دینِ اسلام میں منع ہے۔ حد یہ کہ دین کی اشاعت و تبلیغ کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔

اقبالؔ کے اس خط کا آخری حصہ ادبی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں شاہین پرندہ کا بہت ذکر کیا ہے۔ اور یہ ان کا محبوب پرندہ ہے جو مردِ مومن کی علامت بن گیا ہے۔ لوگوں کو اعتراض تھا کہ شاہین پھاڑ کھانے کی تعلیم دیتا ہے، اس لئے اس پرندہ کا تذکرہ بہت غلط ہے۔ اقبالؔ نے جو اس کا جواب دیا وہ آنکھیں کھول دینے والا ہے۔ شاہین کی یہ تشریح یا تفسیر اقبالؔ کے اس خط کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔

انھوں نے لکھا کہ شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ نہیں ہے بلکہ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ (۱) یہ پرندہ خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ مردِ مومن بھی محنت کش ہے اور حلال کی کمائی کھاتا ہے، حرام نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ مردِ مومن بھی دنیا میں ہمیشہ رہنے نہیں آیا۔ وہ بھی اپنا مستقل گھر اس دنیا میں نہیں آخرت میں بناتا ہے۔ (۳) بلند پرواز ہے۔ مردِ مومن کی فکر بھی فلک رس ہے۔ وہ بھی آسمانوں کی بلندیوں کی سوچ رکھتا ہے، فکر کرتا ہے۔ (۴) خلوت پسند ہے۔ مردِ مومن بھی دنیا کی آلائش سے پاک الگ تھلگ رہ کر یادِ الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔ حالتِ نماز میں وہ دنیا و مافیہا سے الگ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ (۵) شاہین تیز نگاہ ہے۔ اس طرح مردِ مومن کی نگاہیں بھی بہت تیز ہیں۔ وہ بھی دنیا کی کروٹوں پر نظر رکھتا ہے اور آنے والے حالات کی خبر رکھتا ہے۔

اس طرح یہ خط علامہ اقبالؔ کے مذہبی، سیاسی، سماجی، ادبی، شعری اور عمرانی خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اقبالؔ نے جن نکات کو بیان کر دیا اس پر معترضین آج تک کچھ نہ کہہ سکے۔

## 14.6: آپ نے کیا سیکھا؟

علامہ اقبالؔ کی نثری تحریریں بھی ان کی شاعری سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ بعض اوقات ان کی نثر میں ان کی شاعری کی تشریح نظر آتی ہے جو کہیں اور نہیں ملتی۔ اگر اقبالؔ نے اپنے خیالات، اشعار یا تشبیہ و استعارے کی شرح نہ کی ہوتی تو دنیا ان کے اصل مفاہیم سے محروم اور بے بہرہ رہ جاتی۔ وہ اپنے خطوں میں اپنے مکتوب الیہ کو اچھے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ خط آتے ہی اس کا جواب فوراً دیتے تھے۔ جس طرح سلام کا جواب فوراً دیا جاتا ہے۔ اپنے خطوں میں ہر قسم کے خیالات جو انھوں نے اپنے خطبات یا اپنی شاعری میں ظاہر کیے، ان پر گفتگو کرتے تھے۔ کسی بھی قسم کے اعتراض کا جواب ایسا بھرپور اور مکمل دیتے تھے کہ معترض دم بہ خود رہ جاتا اور اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکتا۔ ان کی نثر شستہ، دھلی منجھی ہوتی۔ الفاظ نہایت واضح اور موزوں ہوتے۔ ان کی نثری تحریروں کا انداز

محققانہ اور انتقادی نظر سے معروضی ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کو ناگوار نہیں ہوتا۔ اپنی دلیلوں میں تاریخِ عالم کی صاف اور نمایاں مثالیں پیش کرتے۔ خط کے آخر میں دو جملے عام طور پر لکھتے ''باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے'' اور ''امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا''۔ سب سے آخر میں ''مخلص'' لکھ کر اپنا نام محمد اقبال لکھتے جس میں ''محمد'' کے اوپر صلی اللہ علیہ وسلم کا (ؐ) ضرور بناتے تھے۔

## 14.7: اپنا امتحان خود لیجئے

۱۔ اقبالؔ کی نثری تحریریں کس انداز کی ہوتی تھیں؟

۲۔ غلام قوموں کی کیا نشانی ہے؟

۳۔ شریعت کسے کہتے ہیں؟

۴۔ طریقت کسے کہتے ہیں؟

۵۔ اقبالؔ جنگ کے حامی کیوں نہیں ہیں؟

۶۔ شاہین پرندہ کی کیا صفات ہیں؟

## 14.8: سوالات کے جوابات

۱۔ اقبالؔ کی نثری تحریریں نہایت سادہ، قابلِ فہم اور معروضی ہوتی تھیں۔

۲۔ غلام قومیں مادیت کو روحانیت پر ترجیح دینے لگتی ہیں اور مشکلات کا مقابلہ کرنے سے کتراتی ہیں۔

۳۔ خودی کے حدود متعین کرنے کا نام شریعت ہے یعنی خودی قانونِ الٰہی کی پابند ہے تو شریعت ہے۔

۴۔ شریعت یعنی فقہ اسلامی کو قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔

۵۔ اقبالؔ جنگ کے حامی اس لئے نہیں کہ اسلام صرف دو صورتوں میں مقابلہ کی اجازت دیتا ہے۔ محافظانہ یعنی اپنی حفاظت کے لئے دوسرا مصلحانہ جس میں مصالحت کی جاسکے۔

۶۔ اقبالؔ نے شاہین پرندے کی پانچ صفات بیان کیں اور لکھا کہ اس میں اسلامی فقر کی یہ خصوصیات موجود ہیں۔

(۱) شاہین خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

(۲) شاہین بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔

(۳) شاہین بلند پرواز ہے یعنی سب سے اونچا اُڑ سکتا ہے۔

(۴) شاہین خلوت پسند ہے۔تنہا رہنا پسند کرتا ہے۔

(۵) شاہین تیز نگاہ ہے۔دور آسمانوں سے زمین کی چھوٹی چھوٹی چیزیں دیکھ لیتا ہے۔

## 14.9: فرہنگ

| الفاظ | معنی | الفاظ | معنی |
|---|---|---|---|
| علیٰ ہذا القیاس | اس طرح سے | موخرالذکر | جس کا ذکر آخر میں ہوا |
| خودی | اپنے آپ کو پہچاننا | مادیت | دنیا پرستی |
| معذور | مجبور | غلام قومیں | وہ قومیں جو آزادانہ سوچ نہ سکیں، دوسروں کی پابند ہوں |
| قوتِ نفسی | زندگی کی طاقت | ترفّع | بلند ہونا |
| حدود | حدیں | متعین | طے کرنا |
| مسولینی | اٹلی کا فاشسٹ بادشاہ | ہٹلر | جرمنی کا آمریت پسند بادشاہ |
| جوع الارض | زمین کی بھوک | تسکین | سکون |
| پامال کیا | کچل دیا | عروج | بلندی |
| قانونِ الٰہی | اللہ کا قانون | شریعتِ اسلامی | شریعت، قانونِ الٰہی |
| طریقت | شریعت کو زندگی میں اپنانے کا نام | امیال | میلانات، رجحانات |
| عواطف | مہربانیاں | اکابر | بڑے لوگ |
| صوفی | تزکیۂ نفس کرنے والے | تفسیر | تشریح |
| معترض | اعتراض کرنے والا | حامی | حمایت کرنے والا |
| محافظانہ | اپنی حفاظت کے لئے | مصلحانہ | مصالحت کی خاطر |
| جمعیتِ اقوام | U.N.O. | مدبرین | غور کرنے والے |
| سیاسیین | سیاسی لیڈر | | |

## 14.10: کتب برائے مطالعہ


۱۔ 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'، جلد اوّل، مرتبہ مظفر حسین برنی

۲۔ 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'، جلد دوم، مرتبہ مظفر حسین برنی

۳ 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'، جلد سوم، مرتبہ مظفر حسین برنی

۴۔ 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'، جلد چہارم، مرتبہ مظفر حسین برنی
۵۔ 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'، جلد پنجم، مرتبہ توقیر احمد خاں (زیرِ طبع)
۶۔ 'مضامینِ اقبال'
۷۔ لیٹرس اینڈ رائٹنگس آف اقبال، از بی.اے.ڈار
۸۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ نذیر نیازی